تفسیر و علم تفسیر

تحقیق و ترتیب
محمد طاہر ہاشمی
ایم۔اے علوم اسلامیہ
ایم۔اے تاریخ

اشاعت 2023

ای بک پی۔ڈی۔ایف

نظم وترتیب محمد طاہر ہاشمی ایم اے علوم اسلامیہ وہسٹری

ہدیہ دعائے خیر

بار اول

برائے رابطہ

hashmipk786@gmail .com

برائے ایصال ثواب

والد گرامی ووالدہ محترمہ

مولایَ صلِّ وَسَلِّم دائماً ابداً

علیٰ حَبِیُبِكَ خَیرِ الخَلقِ کُلھِم

انتساب

ان نفوسِ قدسیہ کے نام جن کے دم قدم

سے اس گلستان میں علوم کی نیرنگیاں ہیں

اِعتِذار

ایک مسلمان دینی کتابوں میں دانستہ غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لئے ہمہ وقت تیار۔ اگرچہ کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پوری توجہ سے کی جاتی ہے تاہم انسان غلطی کا پتلا ہے۔ غلطی رہ جانے کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا احباب سے گذارش ہے کہ جو غلطی نظر آئے تو مطلع فرمائیں تاکہ اسے درست کیا جاسکے۔ نیکی کے کام میں آپکا تعاون یقیناً صدقہ جاریہ ہوگا۔

رابطہ: hashmipk786@gmail.com

فہرست

کچھ اپنے بارے میں

ناچیز کا نام محمد طاہر ہاشمی ولد نور احمد ہاشمیؒ ہے۔ بندہ ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ والدین اللہ کی عظیم نعمت ہوتے ہیں۔ قبلہ والد گرامی اولیاء میں تھے زمیندار تھے کچھ عرصہ گاؤں کی نمبرداری کی لیکن چھوڑ دی۔ مزاج میں غنا اور تصوف کی فراوانی تھی زیادہ عرصہ فقر و درویشی میں گذارا۔ رجسٹرڈ پریکٹیشنر تھے لیکن طب کی پریکٹس کی نہیں کہتے تھے کہ اس سے دل مطمئن نہیں ہوتا یا تو انسان فی سبیل اللہ خدمت کرے۔ 58 سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اللہ کریم جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عنائت فرمائے اور اپنی رحمت سے نوازے آمین! نے اور والدہ محترمہؒ نے چلنا پھرنا اور باتیں کرنا، قائدہ پڑھنا اور ابتدائی تعلیم کا آغاز کروایا۔

والدہ محترمہ کی علمی استعدا، معاملہ فہمی اور بروقت علمی پکڑ ہمیں آخر تک لاجواب کر دیتی تھی۔ امی جی سکول سے پڑھے ہوئے تو نہ تھے پر گھر میں اپنے والد گرامی قدر جناب محمد عظیمؒ ہاشمی قدس سرہ العزیز! سے تعلیم حاصل کی تھی جو پورے علاقے میں تقویٰ و بزرگی میں جانے پہچانے جاتے تھے، سے حاصل کی تھی۔ کمال کا حافظہ تھا۔ اللہ کریم انکی قبر پر اپنی کرم و فضل کی بارش ہمہ وقت فرماتا رہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِہٖ و صحبہ و بارك وَسَلِّمْ۔

اللھم اغفر لی وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِینَ والمؤمنات

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِىْ صَغِيْرًا

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ

ابتدائی تعلیم اوکاڑہ کے دور افتادہ ایک گاؤں چک 18 جی ڈی میں حاصل کی۔ پرائمری میں سکول ٹاپ کیا اور وظیفہ کا امتحان اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا وظیفہ لگا لیکن ملا نہیں۔ قرآن پاک اور ابتدائی تعلیم ایک عظیم درویش و حافظ جناب قبلہ عبد الرشید صاحب سے حاصل کی۔ حافظ صاحب قبلہ نابینا تھے لیکن صاحب کرامت تھے۔ ان کی منزل سننا، ان کے لئے کتاب خوانی کرنا بندۂ ناچیز کے سپرد تھا۔ باالخصوص رمضان المبارک میں۔ وقت بغیر گھڑی دیکھے بتا دیتے تھے۔ تجوید و قرآت کچھ عرصہ قاری خوشی محمد الازہریؒ سے حاصل کی تھی۔ بلا کا حافظہ تھا۔ ایک دفعہ کوئی مل لیتا تو مدتوں بعد اسے پہچان لیتے۔ اللہ کریم ان کی مرقد کو اپنے نور سے منور کرے آمین!

پھر قبلہ ماموں "پھوپھا" جان جناب غلام یٰسین ہاشمی نور اللہ مرقدہٗ سے درس لیا۔ پورے علاقے میں ماہر طبیب اور اللہ کے برگزیدہ بندے کے طور پر جانے جاتے تھے۔ جب تک حیات رہے پورے گاؤں میں صرف ایک جگہ جمعہ ہوتا تھا۔ خدمت خلق جبلت میں تھی۔ گھر سے کئی لوگوں کا کھانا جاتا تھا یہ خدمت بندہ کے حصہ میں تھی۔ دو تین تو یاد ہیں، ایک بابا جمعہ خادم مسجد، ایک محمد رفیق صوفی کھڈی کا کام کرتے تھے، اور عبد الحمید ڈسپنسر، باقی یاد نہیں۔

ماموں جان بڑے وضع دار شخصیت کے حامل تھے۔ گاؤں کی پنچائت کے سربراہ تھے، زمیندار تھے اور ایک بڑے باغ کے مالک تھے۔

اس کے بعد بندہ کے والدین قدس سرہ العزیز! اوکاڑہ شفٹ ہو گئے۔ وہاں گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں میں پاس کیا اور کلاس میں دوسری پوزیشن لی۔ اوکاڑہ ایک ایک علمی شہر تھا۔ اس میں مولانا غلام علی اکاڑویؒ، جناب سید صاحب، کچھ عرصہ مفتی محمد شفیع اکاڑویؒ بعد ازاں کراچی چلے گئے، مفتی الہ یار، پہلے کچھ عرصہ جناب علامہ احمد سعید کاظمیؒ صاحب اور مفتی غلام سرور قادریؒ صاحب جو بعد ازاں لاہور اور ملتان بالترتیب منتقل ہو گئے تھے، علاوہ ازیں مفتی محمد اقبال چشتیؒ جو 2023 میں انتقال فرما گئے تھے کی خدمات لافانی ہیں۔ ان کے علاوہ اہل حدیث علماء جامعہ محمدیہ میں معین الدین لکھوی، اور عبد الحلیم صاحب بڑی علمی شخصیات تھیں، دیوبندی علمأمیں محمد امین صفدر بڑے نامور علمأ تھے۔ ان میں سے اکثر علمأ سے دروس لئے۔

اس کے بعد ہم سمبڑیال شفٹ ہو گئے باقی تعلیم سیالکوٹ اور پسرور سے حاصل کی اور محکمہ تعلیم میں بحیثیت استاد فرائض سرانجام دئے۔ آخر میں گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول سے ریٹائرمنٹ لی۔ 1985 سے 2014 تک مختلف مساجد میں خطابات جمعہ سرانجام دیئے۔ اور اب مختلف مضامین میں تحقیق کر کے وٹس ایپ پر گروپوں میں شئیر کر رہا ہے۔ اور انہیں ای بک بنا رہا ہے۔ اللہ کریم انہیں مقبول بنائے اور ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے آمین بجاہ نبیہ الکریم الامین ﷺ!

الشکر والحمد للہ جل فی علاہ فالیہ ینسبی الفضل کلہ فی الکمال ویبقی للہ وحدہ

اللّٰھم لك الحمد أنت قلت وقولك الحقّ المبين، قل صدق الله، فاتّبعوا ملّة إبراھيم حنيفاً، ومن أصدق من الله قيلا، ومن أصدق من الله حديثاً، وأشھد أن لا إله إلاّ الله، المتوحّد في الجلال بكمال الجمال

تعظيماً وتكبيراً، المتفرّد بتصريف الأمور على التّفصيل والإجمال تقديراً وتدبيراً، وأشهد إن نبيّنا محمّد عبده ورسوله، أرسله إلى عموم الثّقلين بشيراً ونذيراً، وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً،

لا إله إلاّ الله، ربّ الأرباب، ومسبّب الأسباب، وخالق خلقه من تراب، فسبحان من خضعت لعظمته الرّقاب، ولانت لجبروته الصّعاب، وذلّت له الشّدائد الصّلاب، غافر الذّنب وقابل التّوب شديد العقاب، ذو الطول لا إله إلا هو عليه توكّلت وإليه متاب، لا إله إلا الله، الكريم، الحليم، العظيم، ربّ العرش العظيم، ونحن على ما قال ربنا وخالقنا من الشّاهدين، ولم ألزم وأوجب غير جاحدين،

والحمد لله ربّ العالمين،

وصلوات الله وسلامه على سيّد الأوّلين والآخرين، وخاتم الأنبياء والمرسلين، وعلى أزواجه أمّهات المؤمنين، وعلى آله الطّيبين الطّاهرين، وعلى صحابته الغرّ الميامين،

اللّهم أرضى عنا معهم برحمتك يا أرحم الرّاحمين،

مقدمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رب یسر و أعن برحمتك

پروردگار! آسانی بخش اور اپنی رحمت سے اعانت فرما۔

اللہ جل شانہ !کا بے پایہ شکر و امتنان ہے۔ جس کی توفیق و عنایت سے یہ مختصر رسالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ بہت محنت طلب کام تھا۔ اصل میں بندہ ناچیز کے جوبات مطالعہ میں آئی ہے وہ یہ کہ اسلام مکمل نقلی علوم پر منتج ہے اور اس نقلی علم کو عقلی پذیرائی سے ہی سمجھا جاسکتا ہے، جو سراسر فضل الٰہی پر منہج نبی دوعالم فخر موجودات ﷺ سے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے متقدمین کی کتب ہی سر مایہ و سرچشمۂ ہدایت ہیں ان کے اصولوں کو چھوڑ کر صراط مستقیم سے بھٹک جانا بازیچۂ اطفال ہے۔ جو آج ہو رہا ہے۔ اس لئے ضرورت محسوس کی کہ کیوں نہ آسان زبان میں تفسیر و اصول تفسیر بیان کر دیئے جائیں تاکہ طلباء جو وابستہ ہیں۔ وہ ان راہوں سے آشنا ہو جائیں اور قرآن کریم سے منضبط ہو جائیں۔ ادنیٰ سی کوشش ہے۔ اسے پڑھیں اور ان اصولوں کو مد نظر رکھ کر قرآن کریم کے علوم سے بہرہ مند ہوں۔

دوسری طرف اسے لکھنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ افسوس واعظ حضرات قرآن پاک کی آیات کی من بھانوری تاویلات کرتے ہیں یا تو انہیں ادراک ہی نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں یا عمداً ایسا کرتے ہیں جو کہ بے راہ روی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے لئے سخت وعید آئی ہے۔ تحریر لکھ دی ہے ۔ ؎شائد کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ ہمیں کلمات طیبات قرآن حکیم کو سمجھنے، پڑھنے اور عمل کرنے کی سعادتوں سے بہرہ مند کرے اور ہمیں راہ مستقیم پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے اور ہماری اور ہمارے آبائ کی بخشش فرمائے آمین بجاہ نبیہ الکریم الامین ﷺ۔

خطبہ

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضلل فلا ھادی لہ و اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم تسلیما۔

"تعریف خدا ہی کے لئے ہے، اسی سے ہم مدد چاہتے ہیں، اسی سے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں، اور خدا ہی سے مانگتے ہیں پناہ اپنے نفس کی شرارتوں اور اپنے اعمال کی برائیوں سے جسے خدا ہدایت بخشتا ہے' اسے گمراہ کرنے والا کوئی نہیں اور جس کے حق میں گمراہی مقدر ہو چکی ہے، اسے راہ ہدایت دکھانے والا کوئی نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ ایک خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی ساجھی شریک نہیں، اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اما بعد:

وجہ تالیف:

ایسا مقدمہ، جو قواعد کلیہ پر حاوی ہو، قرآن کے فہم اور اس کی تفسیر و معانی کی معرفت میں معین ہو، اس بارے میں منقول و معقول، حق و باطل کی تمیز کرنے والا اور قیل و قال میں فیصلہ کن، دلیل کی راہ دکھانے والا ہو۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ کتبِ تفسیر میں رطب و یابس کی بھرمار ہے۔ کھلا ہوا باطل بھی موجود ہے اور روشن حق بھی۔

علم صحیح کی دو قسمیں:

علم دو ہی طرح کا ہے:

1۔ نبی کریم ﷺ کی طرف سے سچی روایت کے ساتھ منقول ہو،

2۔ دلیلِ معلوم اس کی پشت پناہی کر رہی ہو۔

ان دونوں قسموں کے علاوہ جو کچھ ہے، کھوٹا سکہ ہے اور پھینک دیے جانے کے لائق، اور یا پھر ایسی چیز ہو گی جس کے کھرے کھوٹے ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن کے فضائل اور اس کے سمجھنے کی ضرورت:

امت کے لئے فہم قرآن از بس ضروری ہے کہ " قرآن ہی خدا کی مضبوط رسی ہے۔ وہی ذکر حکیم اور صراط مستقیم ہے۔ اس میں نہ خواہشیں کچھ پیدا کر سکتی ہیں نہ زبانیں شک ڈال سکتی ہیں۔ بار بار دہرانے سے وہ پرانا نہیں ہوتا۔ اس کے عجائبات کبھی ختم ہونے کے نہیں۔ علماء کو اس سے کبھی سیری نہیں ہو سکتی۔ جو کوئی اس کے بموجب کہتا ہے، سچ کہتا ہے۔ جو کوئی اس پر چلتا ہے، اجر پاتا ہے۔ جو کوئی اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، عدل برتتا ہے۔ جو کوئی اس کی طرف بلاتا ہے، صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جو کوئی سرکشی سے اسے چھوڑ دیتا ہے، خدا اسے ہلاک کر ڈالتا ہے اور جو کوئی اس سے روگردانی کرکے ہدایت چاہتا ہے، خدا اسے گمراہی کے حوالے کر دیتا ہے " فرمایا:

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ

" پھر اگر پہنچے تم کو میری طرف سے ہدایت، پھر جو چلا میری راہ بتلائی پر، نہ وہ بہکے گا، اور نہ وہ تکلیف میں پڑے گا، اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے، تو اس کو ملتی ہے گذران تنگی کی، اور لائیں گے ہم اس کو قیامت کے دن اندھا۔ وہ کہے گا اے رب! کیوں اٹھایا تو نے مجھ کو اندھا، اور میں تو تھا دیکھنے والا، فرمائے گا، یوں ہی پہنچی تھی تجھ کو ہماری آیتیں، پھر تو نے ان کو بھلا دیا، اور اسی طرح آج تجھ کو (ہم) بھلائیں گے"۔

اور فرمایا:

قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (المائدۃ:۱۵-۱٦)

"بے شک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی، جس سے اللہ دکھاتا ہے اس کو جو تابع ہوا اس کی رضا کا، سلامتی کی راہیں، اور ان کو نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی میں، اپنے حکم سے اور ان کو چلاتا ہے سیدھی راہ پر"۔

اور فرمایا:

الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (سورۃ ابراہیم:۱،۲)

"یہ ایک کتاب ہے، جسے ہم نے اتارا ہے تمہاری طرف، تاکہ تم نکالو لوگوں کو اندھیرے سے روشنی کی طرف ان کے رب کے حکم سے زبردست خوبیوں والے کی راہ کی طرف، وہ اللہ جس کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں"۔

اور فرمایا:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ (الشوریٰ)

"اور اسی طرح بھیجا ہم نے تمہاری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے تم نہ جانتے تھے کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ کیا ہے ایمان لیکن ہم نے رکھی ہے یہ روشنی اس سے راہ سجھا دیتے ہیں جس کو چاہیں اپنے بندوں سے اور بے شک تم سجھاتے ہو سیدھی راہ، راہ اللہ کی، اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، دیکھو اللہ ہی تک پہنچتے ہیں سب کام"۔

پس میں نے خدا کی بخشی ہوئی توفیق سے محض یادداشت پر یہ مختصر مقدمہ لکھ دیا ہے۔ واللہ الهادی الی سبیل الرشاد)اور خدا ہی راہِ راست کی طرف راہ دکھانے والا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے تفسیر بھی سکھائی:

سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے اصحاب کو جس طرح قرآن کے لفظ بتائے، اسی طرح قرآن کے معنی بھی بتائے ہیں۔ کیونکہ آیت " لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ " (النحل:۴۴) کے حکم میں یہ دونوں باتیں داخل ہیں۔

ابو عبد الرحمن سلمی کا قول ہے کہ جن لوگوں نے ہمیں قرآن پڑھایا، مثلاً: عثمان بن عفان اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہ نے وہ ہم سے کہتے تھے کہ "جب ہم نبی ﷺ سے دس آیتوں کی تعلیم حاصل کر چکتے تھے، تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے، جب تک ان آیتوں کا علم و عمل مکمل نہ کر لیں۔ اسی طرح ہم نے علم و عمل، دونوں کی تعلیم حاصل کی"۔

یہی وہ ہے کہ ایک ایک سورت کے حفظ میں ان بزرگوں کو ایک مدت لگ جایا کرتی تھی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرمایا

کرتے تھے" : ہمارا کوئی آدمی جب سورۃ بقرۃ اور سورۃ آل عمران پڑھ لیتا تھا تو ہماری نگاہوں میں بڑا بن جاتا تھا"۔(مسند احمد) اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سورۃ بقرۃ کے حفظ میں کئی سال لگ گئے تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے موطا میں ہے کہ آٹھ سال لگے تھے۔

نبی ﷺ کا صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو معانی قرآن کی تعلیم دینا ان آیات سے بھی ثابت ہے:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ(سورۃ ص ۲۳:۲۹)

"یہ کتاب ہے مبارک جسے ہم نے تمہاری طرف اُتارا ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات کو سوچیں"۔

اور

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ(محمد ۳:۲۴)

"یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے ؟"

اور

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ(مومنون ۴:۶۸)

"کیا انہوں نے بات پر غور نہیں کیا؟"

اور ظاہر ہے کہ فہم و تدبر ہی نہیں جب تک بات کے معنی نہ سمجھے جائیں۔ اسی طرح فرمایا:

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ(الزخرف ۱:۲)

"ہم نے یہ قرآن عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ تم لوگ سمجھو"!

اور یہ بات عقل میں کیسے آسکتی ہے، جب تک سمجھی نہ جائے۔

پھر معلوم ہے کہ ہر گفتگو اسی لئے ہوتی ہے کہ اس کے معنی سمجھے جائیں نہ کہ محض لفظ سن لئے جائیں۔ اور قرآن کا معاملہ تو بدرجہ اولیٰ فہم و تدبر کا متقاضی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ لوگ کسی فن کی کتاب پڑھیں، مثلاً طب کی یا حساب کی اور اسے سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ جب عام کتابوں کا یہ حال ہے تو کتاب اللہ کا فہم کس قدر ضروری ٹھہرتا ہے، وہ کتاب اللہ جو مسلمانوں کے لئے اصلی بچاؤ ہے۔ جس میں ان کی نجات و سعادت ہے۔ جس سے ان کے دین و دنیا کا قیام ہے۔ بندہ ناچیز نے بڑی تحقیق کے بعد آسان زبان میں یہ جو ہر پارہ جمع کیا ہے۔ جس سے طلباء کے ساتھ ساتھ علماء بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔ جہاں غلطی دیکھیں تصحیح فرمادیں۔

تفسیر اور علوم تفسیر

لغوی معنی

تفسیر (ف س ر) سے نکلاہے جس کے معنی "ظاہر کرنا، کھول کر بیان کرنااور بے حجاب کرنا" ہیں

یہ لفظ "فسر" سے مشتق ہے جس کے معنی کھولنے کے آتے ہیں؛ چونکہ اس کے ذریعہ قرآن کے معانی ومفاہیم کھول کر بیان کئے جاتے ہیں اس لیے اس کو علم تفسیر سے تعبیر کیاجاتا ہے، قرآن مجید میں اس کے لیے دوسرے الفاظ بھی آتے ہیں، تفسیر، تاویل بیان تبیان، تبیین، جو تقریباًہم معنی ہیں؛ لیکن بعض اہل علم کے مابین ان الفاظ میں کچھ جزوی فرق بھی ہے، جس کی تفصیل ایک مستقل مضمون کے ذیل میں آئے گی۔

اصطلاحی معنی

تفسیر کی اصطلاحی تعریفیں بھی بیان کی گئی ہیں؛ چنانچہ علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے اس کی مختصر تعریف یوں نقل کی ہے:

"هُوَعِلْمٌ يُعْرَفُ بِهٖ فَهْمُ كِتَابِ اللهِ الْمُنَزَّلِ عَلٰى نَبِيِّهٖ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبَيَانُ مَعَانِيْهِ وَاسْتِخْرَاجُ أَحْكَامِهٖ وَحِكَمِهٖ"۔ (البرھان فی علوم القرآن:۱۳۱)

وہ ایساعلم ہے جس سے قرآن کریم کی سمجھ حاصل ہو اور اس کے معانی کی وضاحت اور اس کے احکام اور حکمتوں کو نکالا جاسکے اور علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ تعریف میں مزید عموم پیدا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"هُوَعِلْمٌ يُبْحَثُ فِيْهِ عَنْ كَيْفِيَّةِ النُّطْقِ بِأَلْفَاظِ الْقُرْآنِ، وَمَدْلُوْلَاتِهَا، وَأَحْكَامِهَا الْإِفْرَادِيَّةِ وَالتَّرْكِيْبِيَّةِ، وَمَعَانِيْهَا الَّتِیْ تُحْمَلُ عَلَيْهَا حَالَةِ التَّرْكِيْبِ، وَتَتِمَّاتٌ لِذٰلِكَ"۔ (روح المعانی:۴/۱)

وہ علم ہے کہ جس میں قرآن کریم کے الفاظ کی ادائیگی کے طریقے اور ان کے مفہوم اور ان کے افرادی اور ترکیبی احکام اور اُن معانی سے بحث کی جاتی ہو، جو کہ، ان الفاظ سے جوڑنے کی حالت میں مراد لیے جاتے ہیں اور ان معانی کا تکملہ جو ناسخ ومنسوخ اور شان نزول اور غیر واضح مضمون کی وضاحت میں بیان کیاجائے۔

اس تعریف کی روشنی میں علمِ تفسیر مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل ہے

(ا)"الفاظِ قرآن کی ادائیگی کے طریقے"

یعنی الفاظ قرآن کو کس کس طرح پڑھا جاسکتا ہے؟اس کی توضیح کے لیے قدیم عربی مفسرین اپنی تفسیروں میں ہر آیت کے ساتھ اس کی قرأتیں بھی تفصیل سے واضح کرتے تھے اور اس مقصد کے لیے ایک مستقل علم" علم قرأت" کے نام سے بھی موجود ہے۔

(۲) "الفاظ قرآنی کے مفہوم"

یعنی ان کی لغوی معنی،اس کام کے لیے علم لغت سے پوری طرح باخبر ہونا ضروری ہے اور اسی بناء پر تفسیر کی کتابوں میں علماء لغت کے حوالے عربی ادب کے شواہد بکثرت ملتے ہیں۔

(۳)"الفاظ کے انفرادی احکام"

یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ اس کا مادہ کیا ہے،یہ موجودہ صورت میں کس طرح آیا ہے،اس کا وزن کیا ہے،اور اس وزن کے معانی وخواص کیا ہیں؟ان باتوں کے لیے علم صرف کی ضرورت پڑتی ہے۔

(۴)"الفاظ کے ترکیبی احکام"

یعنی ہر لفظ کے بارے میں یہ معلوم ہونا کہ وہ دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر کیا معنی دے رہا ہے؟اس کی نحوی ترکیب(Grammatical Analysis)کیا ہیں؟اس پر موجودہ حرکات کیوں آئی ہیں اور کن معانی پر دلالت کر رہی ہیں؟اس کام کے لیے علم نحو اور علم معانی سے مدد لی جاتی ہے
۔

(۵)"ترکیبی حالت میں الفاظ کے مجموعی معنی"

یعنی پوری آیت اپنے سیاق وسباق میں کیا معنی دے رہی ہے؟اس مقصد کے لیے آیت کے مضامین کے لحاظ سے مختلف علوم سے مدد لی جاتی ہے، مذکورہ علوم کے علاوہ بعض اوقات علم ادب اور علم بلاغت سے کام لیا جاتا ہے، بعض اوقات علم حدیث اور بعض اوقات علم اصولِ فقہ سے۔

(٦)"معانی کے تکملے"

یعنی آیات قرآنی کا پس منظر اور جو بات قرآن کریم میں مجمل ہے اس کی تفصیل، اس غرض کے لیے زیادہ تر علمِ حدیث سے کام لیا جاتا ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی یہ میدان اتنا وسیع ہے کہ اس دنیا کے ہر علم وفن کی معلومات کھپ سکتی ہیں کیونکہ بسا اوقات قرآن کریم ایک مختصر سا جملہ فرماتا ہے مگر اس کی معانی میں حقائق واسرار کی ایک غیر متناہی کائنات پوشیدہ ہوتی ہے مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ   (الذاریات:۲۱)

اور تم اپنی جانوں میں غور کرو کیا تم نہیں دیکھتے۔

غور فرمایئے اس مختصر سے جملے کی تشریح وتفصیل میں پورا علم الابدان(Physiology)اور پورا علمِ نفسیات(Psychology)سما جاتا ہے اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ تعالی نے اس آیت میں اپنی تخلیقی حکمت بالغہ کے جن اسرار کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ سب پورے ہوگئے ہیں؛ چنانچہ تفسیر کے اس ذیلی جز میں عقل وتدبر، تجربات ومشاہدات کے ذریعے انتہائی متنوع مضامین شامل ہیں۔(علوم القرآن:۳۲۳۔۳۲۵)

قرآن کریم اللہ تعالی کی جانب سے نازل کردہ ہدایت نامہ ہے، جس میں ساری انسانیت کے لیے رہنمائی ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ   (الحجر:۹)

حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر(یعنی قرآن)ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ   (بنی اسرائیل:۹)

حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راستہ دِکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا ہے۔

لہذا جو شخص بھی اس کو اپنائے گا اس کو اللہ کی جانب سے صحیح راستہ دکھایا جائے گا اور جو اس سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے دنیاوی زندگی بھی تنگ کردی جائیگی اور آخرت میں تو سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی o وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَإِنَّ لَهُ مَعِیْشَةً ضَنکاً وَنَحْشُرُهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ أَعْمَی"۔
(طٰہٰ:۱۲۳،۱۲۴)

جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہو گا اور نہ مشکل میں گرفتار ہو گا اور جو میری نصیحت سے منہ موڑے گا تو اس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔

الغرض رب کائنات کی جانب سے انسان کی رہبری کے لیے قرآن ایک مکمل دستور اور ضابطۂ حیات ہے اور اس کتاب کے بغیر انسانیت نامکمل ہے۔

نصیحت حاصل کرنے اور یاد رکھنے کیلئے تو قرآن آسان ہے لیکن بیان کیلئے پیغمبر کی وضاحت ضروری ہے۔

تفسیر قرآن کریم

جب یہ کتاب رہبری کے لیے نازل کی گئی تو اس کو آسان کرنا بھی ضروری ہے؛ جیسا کہ حق تعالی کا فرمان ہے:

"وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ"۔ (سورۃ القمر:۱۷)

اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بنا دیا ہے، اب کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔

اِسی سورت میں یہ آیت چار جگہ پر آئی ہے؛ نیز اس کو آسان کرنے کی مختلف شکلیں حق تعالی نے واضح فرمائی ہیں، مثلاً سورۂ قیامہ میں فرمایا:

"اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ o فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ o ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ"۔ (القیامۃ:۱۷۔۱۹)

یقین رکھو کہ اس کو یاد کروانا اور پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے، پھر جب ہم اسے (جبرئیل کے واسطے سے) گویا اس کو پڑھ رہے ہوں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ پھر اس کی وضاحت بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

تفسیر کا اولین حق

تفسیر کا اولین حق اللہ سبحانہ وتعالی کو ہی حاصل ہے اور اس کو اللہ تعالی نے اپنے نبی برحق (فداہ ابی وامی) ﷺ کے ذریعہ واضح کیا؛ چنانچہ فرمایا:

"وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ"۔ (سورۃ النحل:۴۴)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر بھی یہ قرآن اس لیے نازل کیاہے تا کہ تم لوگوں کے سامنے ان باتوں کی واضح تشریح کر دو جو ان کے لیے اتاری گئی ہیں اور تا کہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔

آیت شریفہ میں "الذکر" سے مراد قرآن کریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی تبیین و تفسیر کی ذمہ داری آپ ﷺ پر ہے اور پھر اس کے بعد عوام پر یہ ذمہ داری ہے کہ اس پر غور و فکر سے کام لیں؛ الغرض یہ ہے تفسیر و تاویل و تبیین۔

قرآن کی شرعی حیثیت

قرآن مجید کو ایسے وقت میں نازل کیا گیا، جب کہ معاشرہ کے اندر بہت سی خرابیاں جنم لے چکی تھیں اور بڑی حد تک اس میں پختگی بھی آگئی تھی، جن کی اصلاح بہت ضروری تھی، قرآن پاک جن اہم اصلاحی ہدایات و مضامین پر مشتمل ہے، انہیں ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) تکمیل شریعت

(۲) نسل انسانی سے نفرت و تعصب کو دور کر کے اسے ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا

(۳) مذہبی اختلافات کا خاتمہ

(۴) کتب سابقہ کے برحق ہونے کی تصدیق اور ان کی غلطیوں کی اصلاح

(۵) تکمیل انسانیت

(۶) گمشدہ توحید کو دوبارہ قائم کرنا

(۷) اللہ تعالیٰ کے ازلی ارادہ کی تکمیل: جس میں انسانوں کے لیے رہنمائی موجود ہو (اسلامی انسائیکلوپیڈیا:۱۲۳۹)

اسی کے ساتھ مسلمانوں کو یہ حکم ہے کہ اگر جھگڑا ہو جائے یا کوئی اور معاملہ درپیش ہو تو سب سے پہلے قرآن پاک کی طرف رجوع کیا کرو اور ایسا ہونا بھی چاہیے؛ کیونکہ وہ خدا کا نازل کردہ دستورِ حیات ہے، جس سے کسی حال میں صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا ہے؛ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ"۔ (النساء:۵۹)

ترجمہ: پس اگر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور اس کے رسول کے حوالہ کر دیا کرو؛ اگر تم اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

یعنی اگر تم میں اور "اولوالامر" میں باہم اختلاف ہو جائے کہ حاکم کا یہ حکم اللہ اور رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف، تو اس کو کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرکے طے کرلیا کرو کہ وہ حکم فی الحقیقت اللہ اور رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف اور جو بات محقق ہو جائے اسی کو بالاتفاق مسلم اور معمول بہ سمجھنا چاہیے اور اختلاف کو دور کر دینا چاہیے؛ اگر تم کو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان ہے؛ کیونکہ جس کو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان ہو گا وہ ضرور اختلاف کی صورت میں اللہ اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرے گا اور ان کے حکم کی مخالفت سے بے حد ڈرے گا، جس سے معلوم ہو گیا کہ جو اللہ اور رسول کے حکم سے بھاگے گا وہ مسلمان نہیں؛ اس لیے اگر دو مسلمان آپس میں جھگڑیں، ایک نے کہا: چلو شرع کی طرف رجوع کریں، دوسرے نے کہا میں شرع کو نہیں سمجھتا یا مجھ کو شرع سے کام نہیں تو اس کو بیشک کافر کہیں گے۔ (فوائد عثمانی بر ترجمہ شیخ الہندؒ، النساء:۵۹)

مذکورہ آیت اور فوائد تفسیری سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب اللہ کی کتنی ضرورت ہے اور اس کی کتنی اہمیت ہے کہ اس کے ذریعہ معاملہ کو حل کرنے کا حکم ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے کسی بھی معاملہ میں کتاب اللہ کی طرف رجوع ہونا چاہیے؛ پھر کسی دوسری چیز کی طرف؛ چنانچہ علامہ شہرستانی (متوفی:۵۴۸ھ) فرماتے ہیں کہ اس بات پر سب کا اجماع ہے کہ جب کوئی شرعی مسئلہ پیش آئے؛ خواہ وہ حلال سے متعلق ہو یا حرام سے اور اس میں اجتہاد کی ضرورت پڑے تو سب سے پہلے قرآن پاک سے اس کی ابتداء کرنی چاہیے؛ پس اگر اس سے رہنمائی حاصل ہو جائے تو پھر دوسری طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (الملل والنحل:۱/۱۳۶)

مقدمہ کا فیصلہ

حضرت عمر فاروقؓ نے قاضی شریح کے نام جو خط لکھا تھا اس میں یہ مذکور ہے کہ جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرو اگر اس معاملہ کا فیصلہ کتاب اللہ میں مذکور نہ ہو تب دوسری طرف دیکھا کرو۔

حضرت ابن مسعودؓ کا فرمان ہے: "تم میں سے کسی کے سامنے کوئی مقدمہ درپیش ہو تو وہ اس کا کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے اگر اس کا فیصلہ کتاب اللہ میں نہ ملے تو وہ رسول اکرم ﷺ کی احادیث کے مطابق حکم دے"۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جب کوئی بات دریافت کی جاتی تھی تو آپ اس کا جواب کتاب اللہ کے مطابق دیتے تھے، ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی کتاب کا درجہ سنت سے پہلے (بلکہ تمام ادلۂ شرعیہ پر مقدم) ہے اور عقل وفطرت کا تقاضہ بھی یہی ہے۔

(حیات امام ابن القیم:۲۵۸)

ان تمام امور پر روشنی ڈالنا مقصود نہیں ہے اور نہ ہی ہمارا یہ موضوع ہے، ذیل میں ہم صرف اس بات کا جائزہ لیں گے کہ قرآن پاک ایک دستورِ حیات ہے اور فقہی احکامات کی تعیین میں اسے اولین ماخذ ہونے کی حیثیت ہے۔

مضامین قرآن

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ درجِ ذیل مضامین کو بیان کیا ہے اور وہ یہ ہیں:

(۱) جزائے ایمان کے مباحث (۲) عبادات کے مباحث (۳) حسنات وسیئات کا بیان (۴) قصص وحکایات کا بیان (۵) نجاتِ حقیقی اور اس کے حصول کے ذرائع کا بیان (۶) رسولِ کریم ﷺ کے سوانح اور آپ ﷺ کی نبوت کے دلائلِ کاملہ کا بیان (۷) خصائص قرآن کا بیان

(۸) اسلام کی حقیقت اور اس کی صداقت پر دلائل قاطعہ کا بیان (۹) کفر وشرک کے تفصیلی احوال (۱۰) اور مظاہر قدرت کا بیان۔

(اسلامی انسائیکلوپیڈیا: ۱۲۳۹)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تقسیم علوم قرآن

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مضامین قرآنی کی بہت ہی جامع تقسیم کی ہے، جو پانچ قسموں پر مشتمل ہے:

(۱) علم الاحکام یعنی عبادات، معاملات اور معاشرتی وسیاسی مسائل؛ نیز علمی زندگی کے متعلق احکام وہدایات۔

(۲) علم المخاصمہ یعنی یہود ونصاریٰ، مشرکین ومنافقین اور مذاہب باطلہ کی تردید اور اسلام کی تائید اور حقانیت کے ثبوت پر مشتمل آیات۔

(۳) علم التذکیر بآیات اللہ یعنی اللہ کی نعمتوں، قدرتوں اور اس کے نوازشات وانعامات، نیز جنت جیسی آرامگاہ میں قیام کا تذکرہ اور مجرموں کی سزاؤں پر مشتمل آیات۔

(۴) علم التذکیر بالموت، یعنی وہ آیات جو موت اور مابعد الموت، حساب کتاب اور نیک اور بُرے اعمال کے بدلے پر مشتمل ہیں۔

(۵) علم التذکیر بایام اللہ، یعنی وہ آیات جو سابقہ امتوں کی معاشرتی ومعاملاتی حالات، انبیاءؑ کی تعلیم سے اعراض وسرکشی پر عذاب خداوندی وغیرہ، یہ سب امت محمدیہ ﷺ کی عبرت وموعظت کے لیے تفصیل کے ساتھ مذکورہ ہیں۔

(الفوز الکبیر: ۲)

حجیت قرآن

قرآن پاک دوسری سابقہ کتابوں کے مقابلہ میں قیامت تک دین کی اساس کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ اللہ کی مضبوط رسی ہے، جس کا ہمیں اللہ نے مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا؛ چنانچہ ارشادِ باری ہے: "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا"۔ (آل عمران:۱۰۳)

ترجمہ: اور تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں تفرقہ میں نہ پڑو۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ رَسُوْلِهٖ"۔ (مشکوٰۃ:۳۱)

ترجمہ: میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں، جب تک تم اس کو تھامے رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے: ایک کتاب اللہ دوسری سنتِ رسول۔

مذکورہ آیت اور حدیث سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآن پاک دین وشریعت کی اصل اساس ہے اور یہی تمام ادلہ میں سب سے مقدم اور سب سے محکم ہے، قرنِ اوّل سے ہی اس سے احکامِ شرعیہ کا استخراج ماخذ اوّل کی حیثیت سے کیا جاتا ہے، آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو جب یمن کی جانب قاضی بنا کر بھیجا تھا تو اُس وقت آپ ﷺ نے اُن سے پوچھا تھا، اے معاذؓ جب تمھیں کوئی مسئلہ درپیش ہو تو کس چیز سے فیصلہ کروگے؟ تو معاذؓ نے جواباً عرض کیا: کتاب اللہ سے؛ پھر آپ ﷺ نے پوچھا اگر اس مسئلہ کا حل قرآن میں نہ مل سکا تو؟ آپؓ نے فرمایا احادیث سے؛ پھر آپ ﷺ نے پوچھا اگر اُس میں بھی نہ ملے تو؟ آپؓ نے عرض کیا "اجتہد برائی" اپنی اجتہاد سے اس مسئلہ کا حل نکال لونگا اور ساتھ ہی فرمایا "ولاالو" حق کی تلاش میں لاپرواہی اختیار نہ کرونگا۔ (ابوداؤد:۲/۵۰۵)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ادلہ اربعہ میں قرآن کو اولین ماخذ کی حیثیت حاصل ہے، ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کے ساتھ حدیث بھی ضروری ہے جس کی وجہ سے آپ ﷺ نے معاذؓ کے مزاجِ دین سے واقفیت اور شریعت سے مکمل طور پر مطلع ہونے سے خوشی کا اظہار فرمایا اور خدا کا شکر بجالاتے ہوئے فرمایا:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللّٰهِ لِمَا يَرْضٰى رَسُولُ ﷺ اللّٰهِ"۔

(ابوداؤد، باب اجتہاد الرأی فی القضاء، حدیث نمبر:۳۱۱۹)

ترجمہ: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اللہ کے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی کہ اس سے اس کا رسول راضی ہے۔

زمانۂ رسالت کے بعد بھی دورِ خلافت اور عام صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اور فقہاء کا یہی معمول رہا ہے کہ مسائل کے استخراج میں کتاب اللہ کو مقدم رکھتے تھے؛ پھر سنتِ رسول اللہ کو، اس لیے پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسائل کے استخراج میں اولیت کتاب اللہ کو حاصل ہے؛ پھر سنتِ رسول اللہ کو ہے۔

قطعی حجت

شیخ محمد خضری بک لکھتے ہیں کہ کتاب اللہ قطعی حجت ہے، جس کو مضبوطی سے تھامنا اور اس کے احکام پر عمل کرنا واجب ہے۔

(تاریخ التشریع الاسلامی:۱۹)

قرآن کی حجیت پر مثال کے طور پر صرف ایک آیت اور دو حدیثیں پیش کی گئی ہیں؛ ورنہ اس کے علاوہ بہت سی آیات اور احادیث کتاب اللہ کی حجیت پر دال ہیں، جنھیں بغرضِ اختصار قلم انداز کیا جاتا ہے؛ نیز اس پر تاریخی شواہد بھی موجود ہیں کہ مسلمانوں نے قرآن حکیم کو قانون کا اولین ماخذ بنایا، نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اور صحابہ کرامؓ کے عہد میں قرآن حکیم سے مکمل طور پر استفادہ کیا جاتا رہا، چوروں کے ہاتھ کاٹے گئے، زانیوں کو کوڑے لگائے گئے، شراب پینے والوں پر تعزیر نافذ ہوئی، بدکرداروں کو ملک بدر کیا گیا، نکاح وطلاق نیز وراثت کی تقسیم کے فیصلے قرآن حکیم کے احکام کے مطابق کئے گئے، ان سب سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں ابتداء ہی سے، قرآن حکیم قانون کا اصلی اور بنیادی ماخذ تھا؛ البتہ اتنی بات قابل تسلیم ہے کہ قرآن حکیم اصولوں کی کتاب ہے اور اس میں جملہ جزئیات کا احاطہ نہیں کیا گیا اور قرآن حکیم کو قانونی ماخذ بنانے کے لیے جن کلیات کی ضرورت تھی، وہ بعد میں مرتب ہوئے اور آج تک مرتب ہورہے ہیں، آج بھی اگر کوئی جدید مسئلہ درپیش ہو اور قرآنِ حکیم کی کسی آیت سے کوئی کلیہ بنایا جاسکے تو وہ ہمارے لیے ویسے ہی قابلِ عمل ہوگا، جیسے امام شافعیؒ یا امام ابوحنیفہؒ کا قائم کردہ کوئی کلیہ قابلِ عمل ہوتا ہو۔

اسی لیے مسلمانوں کے یہاں ایک عام اصول رہا کہ ایسی کوئی بات تسلیم نہیں کی جائیگی جو قرآن حکیم کے احکام یا اس کی روح کے خلاف پائی جائے۔

(اسلام اور مستشرقین:۲/۱۴)

قرآن کا فقہی اسلوب بیان

قرآن میں جہاں اصلاح، عقیدہ، عبرت وموعظت کی آیتیں ہیں، وہیں فقہی احکام سے متعلق بے شمار آیات ہیں، کبھی تو امر کے صیغے سے فرضیت کا حکم دیا گیا ہے: "وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ"۔ (البقرۃ:۴۳)

ترجمہ: اور قائم کرو نماز کو (یعنی مسلمان ہو کر) اور دو زکوٰۃ کو۔

یہاں پر نماز وزکوۃ کو صیغہ امر سے بیان کیا گیا؛ مگر شرعاً یہ دونوں احکام فرض کے قبیل سے ہیں اور کبھی تو ماضی کے لفظ (کتب) سے فرضیت ثابت کی جاتی ہے جیسے: "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ"۔ (البقرۃ:۱۷۸)

تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے۔

"كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ"۔ (البقرۃ:۱۸۳) تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔

اور کبھی مضارع کے لفظ سے وجوب کا حکم ثابت ہوتا ہے، جیسے:

"وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ"۔ (البقرۃ:۲۲۸)

ترجمہ: اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں۔

اس آیت میں مطلقہ عورتوں کو عدت کے گذارنے کا حکم دیا گیا ہے، جو واجب ہے اور کبھی انجام کار اور نتیجہ کے خراب ہونے کی وعید سنا کر حکم دیا جاتا ہے، جیسے:

"وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ"۔ (النساء:۹۳)

ترجمہ: اور جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے سو ان دونوں کے (داہنے) ہاتھ (گٹے) پر سے کاٹ ڈالو۔

کبھی تو صراحتاً ممانعت اور نہی کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے، جیسے:

"وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ"۔ (الانعام:۱۵۱)

ترجمہ: اور جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے، ہاں! مگر حق پر ہو۔

کبھی فعل مباح سے اور کبھی دوسرے طریقوں سے بھی احکام بیان کئے گئے ہیں جس سے ان احکام کا طرز مختلف معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ بعض احکام میں فرضیت کا درجہ ہے تو بعض میں واجب کا، بعض میں سنن و مستحبات کا، بعض میں مباحات کا اور جن باتوں سے منع کیا گیا اس میں بھی بعض حرام کا درجہ رکھتے ہیں تو بعض مکروہ کا یا محض خلافِ اولیٰ کا۔

(سہ ماہی مجلّہ، الصفا، سبیل السلام حیدرآباد)

کتاب اللہ سے اخذ معانی کے طریقے

قرآن مجید سے احکام درجِ ذیل چار طریقوں سے مستنبط ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱)عبارۃ النص

(۲)اشارۃ النص

(۳)دلالۃ النص

(۴)اقتضاء النص۔

عبارۃ النص

عبارۃ النص سے استدلال کرتے وقت احکام صرف لفظ کے صیغہ (form) سے ہی معلوم ہو جاتے ہیں؛ کیونکہ اس حکم کے واسطے ہی نص (text) کو نازل کیا گیا تھا؛ نیز اس کا مفہوم غور و فکر کے بغیر اوّلِ وہلہ (پہلے لمحہ) ہی میں سمجھ میں آجاتا ہے، مثلاً: قرآن نے کہا: "وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا" (سورۃ البقرۃ:۲۷۵) اس نص سے خرید و فروخت کی حلت (permission) اور سود کی حرمت (prohibition) کسی غور و فکر کے بغیر سمجھ میں آجاتی ہے اور اس نص کا مقصود بھی یہی ہے؛ اسی کو عبارۃ النص کہتے ہیں۔

دلالۃ النص

جو حکم نص کے الفاظ سے ثابت تو نہ ہو لیکن نص کو سنتے ہی ذہن اس حکم کی طرف منتقل ہو جاتا ہو، وہ دلالۃ النص ہے، جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے "فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا" (سورۃ الاسراء:۲۳) اس آیت کے الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ والدین کی کسی بات پر اُف کہنا حرام ہے؛ لیکن دلالۃ النص کے طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب اُف کہنا حرام ہے تو سب و شتم کرنا یا جسمانی اذیت دینا بدرجہ اُولیٰ حرام ہو گا؛ کیونکہ یہ تکلیف "اف" کہنے سے بھی بڑھ کر ہے۔

اشارۃ النص

نص جس بات کو بتانے کے لیے وارد نہ ہوئی ہو؛ لیکن نص کے اصل الفاظ ہی سے جو بات سمجھ میں آجائے وہ اشارۃ النص ہے، مثلاً ارشادِ خداوندی ہے "وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ" (البقرۃ:۲۳۳) اس آیت کا ظاہری مفہوم (عبارۃ) تو یہ ہے کہ ماں کے نفقہ کی ذمہ داری باپ پر ہے؛ لیکن اس میں لفظ ہے "الْمَوْلُودِ" اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اولاد باپ ہی کی طرف منسوب ہوگی، ماں کی طرف نہیں؛ کیونکہ اس لفظ کے ذریعہ "ولد" کی نسبت باپ کی طرف کی گئی ہے یہی اشارۃ النص ہے۔

اقتضاء النص

نص اور شارع کے کلام کے صحیح ہونے کے لیے بعض اوقات کسی لفظ کو محذوف ماننا ضروری ہو جاتا ہے، اس کو "مقتضی" کہتے ہیں اور اس سے ثابت ہونے والے حکم کو "اقتضاء النص" کہتے ہیں مثلاً آیت قرآنی ہے "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ" (المائدۃ:۳) اس میں حرمت کی نسبت میتہ اور دم کی طرف کی گئی ہے؛ حالانکہ یہ درست نہیں؛ کیونکہ حرمت کا تعلق منھی عنہ (جس چیز سے منع کیا گیا ہے) اس کی ذات سے نہیں ہوتا؛ بلکہ مکلّف کے فعل سے ہوتا ہے؛ پس آیت کا مفہوم اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ مکلّف سے متعلق کوئی فعل محذوف نہ مانا جائے اور ظاہر ہے کہ وہ فعل "اکل" ہی ہو سکتا ہے؛ لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ مردار کا کھانا اور خون کا پینا حرام ہے اور یہاں پر یہی شارع کی مراد ہے۔

(مجلّہ فقہ اسلامی:۱۳۵)

قرآن کا تدریجی اندازِ بیان

جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے تو اس وقت عربوں میں بعض اچھی عادات تھیں، جو بقاء کے لحاظ سے صالح تھے اور ان سے امت کے تکوین پر کوئی نقصان نہیں ہو تا تھا، دوسری طرف اُن میں بعض عادات ایسی بھی تھیں جنھوں نے اُن کے اندر اچھی خاصی جگہ بنالی تھی اور ان کے دل میں گھر کر گئی تھیں، انسان حد درجہ وحشیانہ زندگی کا عادی بن چکا تھا اور اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ ایک دم پاکیزہ زندگی کو اختیار کریں؛ اس لیے قرآن پاک نے آہستہ آہستہ انسان کی تہذیبی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے احکامات دیئے، خرابی کو ختم کیا گیا اور یہی فطرت کے مناسب بھی ہے؛ کیونکہ اگر ان خرابیوں کو ایک دم روک دیا جاتا تو طبیعت پر بڑی گرانی ہوتی اور ان سے رُکنا مشکل ہو جاتا، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک میں پہلے خرابی کے نقصانات اور منافع کو شمار کرایا جاتا ہے؛ پھر مفاسد کے پیشِ نظر اس حکم سے منع کیا جاتا ہے، مثلاً شراب کی حرمت بیان کرنا مقصود تھا تو قرآن میں سب سے پہلے اس کے گناہ کے کام میں سے ہونے کی صراحت کی گئی اور ساتھ ہی اس کے منافع کا بھی اعتراف کیا گیا؛ لیکن بعد میں یہ صاف صاف کہہ دیا گیا کہ اس میں نفع سے زیادہ نقصان کا پہلو ہے، جیسے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا"۔ (البقرۃ:۲۱۹)

ترجمہ: ان دونوں (خمر و میسر) کے استعمال میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں اور لوگوں کے بعض فائدے بھی ہیں اور وہ گناہ کی باتیں ان کے فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔

دیکھئے یہاں پر بیک وقت اُن دونوں سے رُکنے کا حکم نہیں دیا گیا؛ مگر اس انداز سے لوگوں کو ان کا گناہ کے قبیل سے ہونا سمجھ میں آنے لگا اور کچھ نہ کچھ اس کی طرف سے نفرت ہونے لگی تو پھر لوگوں سے کہا گیا:

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى"۔ (النساء:۴۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشہ میں ہو۔

اس نہی میں پہلے حکم کو باطل کرنا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ اس کو مزید مؤکد کرنا ہے پھر جب ان لوگوں کے اندر شراب کی طرف سے اچھی طرح بے اطمینانی ہو چکی تو صریح طور پر روک دیا گیا کہ شراب نوشی شیطان کے گندے کام میں سے ہے؛ لہٰذا تم اس سے باز آجاؤ؛ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ"۔

(المائدۃ:۹۰)

ترجمہ: اے ایمان والو (بات یہی ہے کہ) شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر (یہ سب) گندے شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم کو فلاح ہو۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں کے سامنے شراب کی حرمت واضح طور پر آگئی اور لوگ اس سے اجتناب کرنے لگے۔

(تاریخ التشریع الاسلامی:۱۹،۱۸)

قرآن اصول وکلیات کا مجموعہ

قرآن پاک میں ہر حکم کی تفصیل موجود نہیں ہے، عام طور پر کلیات کے بیان پر اکتفاء کیا گیا ہے اور خدائی کلام کے لیے یہی مناسب تھا؛ کیونکہ ہر حکم کی تفصیلات پیش کرنے سے کتاب نہایت طویل ہوجاتی اور اس سے استفادہ کرنا مشکل ہوجاتا، آپ بھی نمونہ کے طور پر قرآن کے ان آیات کو ملاحظہ کیجئے جن میں اس طرح کے اصول بیان کئے گئے ہیں، مثلاً: "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى"۔ (الانعام:۱۶۴)

ترجمہ: کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔

"وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى"۔ (النجم:۳۹)

ترجمہ: انسان کے لیے صرف وہ ہے جس کی اس نے کوشش کی۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ"۔ (المائدۃ:۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے وعدوں کو پورا کرو۔

"وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ"۔ (البقرۃ:۱۸۸)

ترجمہ: اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک کہ کھاجاؤ لوگوں کے مال میں سے کوئی حصہ ناحق درآنحالیکہ تم جانتے ہو۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ"۔ (النساء:۲۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا ناحق مگر یہ کہ آپس کی مرضی سے تجارت کرو۔

"إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ"۔ (النساء:۵۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

"وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّى يَبْلُغَ أَشُدَّهُ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا"۔

(الاسراء:۳۴)

ترجمہ: اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر بہتر طور پر جب تک کہ وہ جوانی کو پہنچے اور عہد کو پورا کرو، بیشک عہد کے متعلق باز پرس ہو گی۔

"الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ"۔ (البقرۃ:۲۲۹)

ترجمہ: طلاق رجعی ہے دو بار تک اس کے بعد دستور کے موافق رکھ لینا یا بھلی طرح سے چھوڑ دینا۔

"وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ.....لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ"۔

(البقرۃ:۲۳۳)

ترجمہ: اور باپ کے ذمہ ان عورتوں کا حسب دستور کھانا کپڑا ہے، نقصان نہ دیا جائے ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے۔

"وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا"۔ (الشوریٰ:۴۰)

ترجمہ: برائی کا بدلہ برائی ہے برابر برابر۔

"وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ"۔ (الطلاق:۲)

ترجمہ: تم اپنے میں سے معتبر لوگوں کو شاہد بناؤ۔

"وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ"۔ (البقرۃ:۲۸۳)

ترجمہ: شہادت کو مت چھپاؤ، جو شخص اس کو چھپاتا ہے اس کا دل گنہگار ہے۔

"وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ"۔ (البقرۃ:۲۸۰)

ترجمہ: اگر مقروض تنگ دست ہے تو اس کو آسانی حاصل ہونے تک مہلت دو۔

"يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ"۔ (البقرۃ:۱۸۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

"وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ"۔ (الحج:۷۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ دین کے بارے میں تم پر تنگی نہیں کی ہے۔

"فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ"۔ (البقرۃ:۱۷۳)

ترجمہ: پھر جو کوئی بھوک سے بے اختیار ہو جائے نہ فرمانی کرے، نہ زیادتی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

الغرض کتاب اللہ تمام اسلامی قوانین کی اصل بنیاد و اساس ہے اور ذریعہ ثبوت کے اعتبار سے اس درجہ قطعی ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اس کی ہمسر نہیں، اس کتاب میں زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا، چاہے وہ ایمانیات کے قبیل سے ہوں یا عبادات کے شخصی احکام ہوں یا مالی معاملات، اجتماعی قوانین ہوں یا تعزیری قوانین، ملکی مسائل ہوں یا بین الاقوامی مسائل، امن کے حالات ہوں یا جنگ کے حالات، یہ کتاب ہر حال میں انسانیت کی رہبری کا فریضہ انجام دیتی ہے۔

"وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ"۔ (النحل:۸۹)

ترجمہ: اور مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور خوشخبری سنانے والا ہے۔

یہی وہ کتاب ہے جس سے دنیا کو افراط و تفریط سے پاک زندگی کا نقشہ میسر آسکتا ہے۔

"إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ"۔ (آل عمران:۱۹)

ترجمہ: بلاشبہ دین حق اور مقبول اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

علمِ تفسیرِ قرآن، اقسامِ تفسیر، اصولِ تفسیر اور مفسرین

قرآن کریم اللہ تعالی کی جانب سے نازل کردہ ہدایت نامہ ہے، جس میں ساری انسانیت کے لیے رہنمائی ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر:۹)

حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (بنی اسرائیل:۹)

حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راستہ دِکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا ہے۔

لہذا جو شخص بھی اس کو اپنائے گا اس کو اللہ کی جانب سے صحیح راستہ دکھایا جائے گا اور جو اس سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے دنیاوی زندگی بھی تنگ کر دی جائیگی اور آخرت میں تو سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَى o وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكاً وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى"۔

(طٰہٰ:۱۲۳،۱۲۴)

جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہو گا اور نہ مشکل میں گرفتار ہو گا اور جو میری نصیحت سے منہ موڑے گا تو اس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔

الغرض رب کائنات کی جانب سے انسان کی رہبری کے لیے قرآن ایک مکمل دستور اور ضابطۂ حیات ہے اور اس کتاب کے بغیر انسانیت نامکمل ہے۔

تفسیر قرآن کریم

جب یہ کتاب رہبری کے لیے نازل کی گئی تو اس کو آسان کرنا بھی ضروری ہے؛ جیسا کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے:

"وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ "۔ (القمر:۱۷)

اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بنادیا ہے، اب کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔

اِسی سورت میں یہ آیت چار جگہ پر آئی ہے؛ نیز اس کو آسان کرنے کی مختلف شکلیں حق تعالیٰ نے واضح فرمائی ہیں، مثلاً سورۂ قیامہ میں فرمایا:

"اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ o فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ o ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَه"۔ (القیامۃ:۱۷۔۱۹)

یقین رکھو کہ اس کو یاد کروانا اور پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے، پھر جب ہم اسے (جبرئیل کے واسطے سے) گویا اس کو پڑھ رہے ہوں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔

تفسیر کا اولین حق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ہی حاصل ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی برحق (فداہ ابی وامی) ﷺ کے ذریعہ واضح کیا؛ چنانچہ فرمایا:

"وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ"۔ (النحل:۴۴)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر بھی یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے ان باتوں کی واضح تشریح کردو جو ان کے لیے اتاری گئی ہیں اور تاکہ وہ غور وفکر سے کام لیں۔

آیت شریفہ میں "الذکر" سے مراد قرآن کریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی تبیین وتفسیر کی ذمہ داری آپ ﷺ پر ہے اور پھر اس کے بعد عوام پر یہ ذمہ داری ہے کہ اس پر غور وفکر سے کام لیں؛ الغرض یہ ہے تفسیر وتاویل وتبیین۔

تفسیر کے اصول

چونکہ ہرکام کی ایک اصل ہوتی ہے اور اصول کے ساتھ ہونے والے کام کو کام کہا جاتا ہے، بے اصولی تو کسی بھی شعبہ میں اچھی نہیں سمجھی جاتی؛ اسی اصول پر تفسیر کے اصول بھی ہیں؛ تاکہ اس میں دلچسپی پیدا ہو، اب ایک بات ضروری طور پر یہ رہ جاتی ہے کہ وہ کیا ذرائع اور طریقے ہیں جن کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر کی جاسکے، یقیناً ہم کو اس کے لیے حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے رہبری کی گئی ہے؛ چنانچہ فرمایا:

"هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ"۔ (آل عمران:۷)

اے رسول! وہی اللہ ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی ہے جس کی کچھ آیتیں تو محکم ہیں جن پر کتاب کی اصل بنیاد ہے اور کچھ دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔

آیات کی اولین تقسیم

گویا اس آیت کی روسے آیات کی اولین تقسیم دوطرح پر کی گئی ہے۔

(۱) آیات محکمات (۲) آیات متشابہات؛ پھر متشابہات دوقسم پر ہیں:

(۱) جو لفظ بھی سمجھ سے باہر ہو جیسے حروف مقطعات

(۲) لفظ تو سمجھ میں آتے ہوں؛ لیکن مفہوم ان کا قابل فہم نہ ہو۔

پھر آیاتِ محکمات کو مفسرین نے دو طرح پر تقسیم کیا ہے

(۱) وہ آیتیں جن کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو جو بالکل واضح ہوں یعنی جس زبان میں بھی ان کا ترجمہ کیا جائے سمجھنے والے کو مشکل معلوم نہ ہوں اور بظاہر مفسرین کے پاس کوئی اختلاف رائے نہ ہو، جیسے پچھلی قوموں سے متعلق واقعات اور جنت و جہنم سے متعلق آیات۔

(۲) دوسری وہ آیتیں ہیں جن کے سمجھنے میں کوئی ابہام یا اجمال یا اور کوئی دشواری پائی جائے یا اُن آیتوں کو سمجھنے کے لیے ان کے منظر و پس منظر کو سمجھنا ضروری ہو جیسے وہ آیتیں جن سے دقیق مسائل اور احکام نکلتے ہوں یا اسرار و معارف اُن سے نکلتے ہوں، ایسی آیات کو سمجھنے کے لیے انسان کو صرف زبان اور اس کی باریکیوں کو جاننا کافی نہیں ہوتا؛ بلکہ اور بھی بہت سی معلومات کی ضرورت پڑتی ہے، انہیں معلومات میں سے ایک "ماخذ" تفسیر کہلاتا ہے۔

تفسیر کی ضرورت و اہمیت

امام جلال الدین سیوطی شافعی رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں

"جس زمانے میں قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا اس وقت عربی کی فصاحت و بلاغت کے ماہرین موجود تھے، وہ اس کے ظاہر اور اس کے احکام کو تو جانتے تھے لیکن اس کی باطنی باریکیاں ان پر بھی غور و فکر کرنے اور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے سوالات کرنے کے بعد ہی ظاہر ہوتی تھیں جیسے جب یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ" تو صحابۂ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُم نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی خدمت میں عرض کی "ہم میں سے ایسا کون ہے جو اپنی جان پر ظلم نہیں کرتا۔ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے اس کی تفسیر بیان کی کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے اور اس پر اس آیت "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ" سے استدلال فرمایا۔ اسی طرح جب حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے یہ ارشاد فرمایا "مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ" یعنی جس سے اعمال کے حساب کے معاملے میں جرح کی گئی تو وہ عذاب میں گرفتار ہو جائے گا۔ تو حضرت عائشہ صدیقہ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہا نے ان آیات "فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًاۙ(۸) وَّ یَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًاؕ(۹)" کے بارے میں حضور پرنور صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے دریافت کیا۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا "یہ تو صرف اعمال کا پیش ہونا ہے۔ (یعنی یہ وہ مناقشہ نہیں ہے جو حدیث میں فرمایا گیا ہے) (جب میدانِ فصاحت و بلاغت کے شہسواروں کو قرآن کے معانی سمجھنے کے لئے الفاظِ قرآنی کی تفسیر کی حاجت ہوئی) تو ہم تو اُس چیز کے زیادہ محتاج ہیں جس کی انہیں ضرورت پڑی بلکہ ہم تو سب لوگوں سے زیادہ اس چیز کے محتاج

ہیں کیونکہ ہمیں بغیر سیکھے لغت کے اسرار ورموز اور اس کے مراتب معلوم نہیں ہوسکتے۔(الاتقان فی علوم القرآن، النوع السابع والسبعون، فصل واما وجہ الحاجۃ الیہ۔۔۔الخ، ۲/ ۵۴۶-۵۴۷، ملخصاً)

قرآن فہمی بہت بڑی عبادت وسعادت ہے، لہٰذا تلاوتِ قرآن کے ساتھ مستند تفاسیر کے ذریعے معانیِقرآن بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حضرت اِیاس بن معاویہ رَحْمَۃُاللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں: جو لوگ قرآنِ مجید پڑھتے ہیں اور وہ اس کی تفسیر نہیں جانتے ان کی مثال اُن لوگوں کی طرح ہے جن کے پاس رات کے وقت ان کے بادشاہ کا خط آیا اور ان کے پاس چراغ نہیں جس کی روشنی میں وہ اس خط کو پڑھ سکیں تو ان کے دل ڈر گئے اور انہیں معلوم نہیں کہ اس خط میں کیا لکھا ہے؟ اور وہ شخص جو قرآن پڑھتا ہے اور اس کی تفسیر جانتا ہے اس کی مثال اس قوم کی طرح ہے جن کے پاس قاصد چراغ لے کر آیا تو انہوں نے چراغ کی روشنی سے خط میں لکھا ہوا پڑھ لیا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ خط میں کیا لکھا ہے۔(تفسیر قرطبی، باب ماجاء فی فضل تفسیر القرآن واہلہ، ۱/ ۴۱، الجزء الاول، ملخصاً)

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو قرآنِ مجید سمجھ کر پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اٰمین

تفسیر قرآن کے آداب

تفسیر و تاویل کا مفہوم تفسیر کے معنی ہیں: ”کسی چیز کا کھولنا، ظاہر کرنا، بیان کرنا۔“ اور اہل علم کی اصطلاح میں تفسیر قرآن کے معنی ہیں: ”قرآن کریم کے معانی کو بیان کرنا اور مرادِ خداوندی کا تعیین کرنا۔“ تاویل کے معنی ہیں: ”پھیرنا، لوٹانا“ اور اہل علم کی اصطلاح میں تاویل سے مراد ہے: ”قرآن کریم کے الفاظ اور جملوں کو ان کی اصل مراد کی طرف لوٹانا۔“ تفسیر و تاویل کے الفاظ عموماً ہم معنی استعمال کیے جاتے ہیں اور بعض اہل علم ان دونوں کے درمیان یہ فرق کرتے ہیں کہ تفسیر کا لفظ زیادہ تر مفرد الفاظ کی تشریح کے لیے استعمال ہوتا ہے اور تاویل کا لفظ جملوں کا مفہوم بیان کرنے کے لیے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ: جس فقرے کا مفہوم قطعی طور پر متعین ہو اور اس میں کسی دوسرے مفہوم کی گنجائش نہ ہو ایسے مفہوم کو بیان کرنا تفسیر کہلاتا ہے اور جہاں متعدد معانی کا احتمال ہو وَہاں غور و فکر کے بعد ایک پہلو کو متعین کرنے کا نام ”تاویل“ ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ: جو مفہوم منقول ہو اس کا نام تفسیر ہے اور جو اجتہاد و استنباط سے تعلق رکھتا ہو اسے تاویل کہا جائے گا۔(مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: الاتقان، نوع: ۷۷)
خلاصہ یہ کہ: ”علم تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن کریم کے معنی بیان کیے جائیں اور اس کے احکام اور حکمتوں کو کھول کر واضح کیا جائے۔“

ایک نازک ترین ذمہ داری، قرآن کریم کی تفسیر و تشریح ایک کٹھن کام اور نہایت نازک ترین ذمہ داری ہے، اس لیے کہ قرآن کریم حق تعالیٰ شانہٗ کا مقدس کلام ہے اور قرآن کریم کی تفسیر در حقیقت حق تعالیٰ شانہٗ کی ترجمانی کا نام ہے، جب ہم قرآن کریم کے کسی لفظ، کسی جملے یا کسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو گویا ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہی مراد ہے، اس طرح اپنے بیان کیے ہوئے مفہوم کو حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف منسوب کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں ذرا سی لغزش اور سہل انگاری افتراء علی اللہ کا موجب ہو سکتی ہے، افتراء علی اللہ نہایت سنگین جرم ہے، حق تعالیٰ شانہٗ کا

ارشاد ہے: "وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ، إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ۔" ترجمہ: "اور اس سے زیادہ کون بے انصاف ہو گا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے یا اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھوٹا بتلادے، ایسے بے انصافوں کی رستگاری نہ ہو گی۔" (ترجمہ اشرف علی تھانوی)
سربراہانِ مملکت اور شاہانِ عالم کی ترجمانی کے فرائض ادا کرنا سب جانتے ہیں کہ کس قدر نازک ذمہ داری ہے اور جو شخص اس ذمہ داری پر فائز ہو اس کے لیے کیسی لیاقت و مہارت شرط ہے؟ شاہانہ رسوم و آداب اور زبان و محاورات سے اس کا کس درجہ باخبر ہونا ضروری ہے، پھر ترجمانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے اسے کس قدر حزم واحتیاط اور بیدار مغزی سے کام لینا چاہیے اور پھر دانستہ ونادانستہ غلط ترجمانی پر کس قدر عتاب شاہی کا اندیشہ ہے، جب سلاطین دنیا کی ترجمانی اس قدر نازک کام ہے تو اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شہنشاہِ مطلق، احکم الحاکمین کی ترجمانی کا کام کس قدر مشکل اور کتنا نازک ہو گا۔ قرآن کریم کی تفسیر اپنے اندر نزاکت کا ایک اور پہلو بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم ہی سے شاہراہِ انسانیت کی نشاندہی ہوتی ہے، اسی سے عقائد وعبادات کی مشکلیں متعین ہوتی ہیں، اسی سے معاملات و معاشرت کی تشکیل ہوتی ہے، اسی سے حق تعالیٰ شانہٗ کی پسند وناپسند، جائز وناجائز اور حلال وحرام کی حدبندی ہوتی ہے، اسی سے اخلاقی قدریں وجود پذیر ہوتی ہیں، اسی سے انسانیت وعبدیت کے پیمانے ڈھلتے ہیں، اسی سے اسلام کا عالم گیر قانون وجود میں آتا ہے، الغرض دین ومذہب، عقائد واعمال، اخلاق ومعاشرت، سیاست وتمدن اور عدل وانصاف کے قانونی، اخلاقی اور انسانی پہلوؤں کا مدار قرآن کریم ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر وتشریح میں ذرا سی بے احتیاطی بھی کتنے ہولناک مفاسد کا سبب بن سکتی ہے؟ اور ایسے بے احتیاط مفسر اور اس پر اعتماد کرنے والے کے حق میں شدید خطرہ ہے کہ یہ کتابِ ہدایت "يَهْدِي بِهِ كَثِيرًا" کے بجائے "يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا" کا منظر پیش کرے۔ تفسیر قرآن میں سلف صالحین کی احتیاط ورزی تفسیر قرآن کی اسی عظمت ونزاکت کے پیش نظر بہت سے سلف صالحین صحابہؓ وتابعینؒ تفسیر کے باب میں لب کشائی سے گریز کرتے تھے، چنانچہ جماعتِ صحابہؓ کے گل سرسبد اور انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد انسانیت کے سب سے افضل ترین شخص حضرت ابو بکر صدیق ؓ ہیں، ان کے بارے میں منقول ہے کہ ان سے قرآن کریم کے کسی لفظ کے معنی دریافت کیے گئے تو فرمایا: "أي أرض تقلّني وأي سماء تظلني إذا قلتُ في كتاب الله ما لا أعلم"(تفسیر ابن کثیر، ج:۱، ص:۵) اور سید التابعین حضرت سعید بن مسیّبؒ کے بارے میں منقول ہے کہ جب ان سے قرآن کریم کی کسی آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا جاتا تو فرماتے: "إنا لا نقول في القرآن شيئًا۔" (تفسیر ابن کثیر، ج:۱، ص:۶) یعنی "ہم قرآن کریم کی تفسیر میں کچھ نہیں کہا کرتے تھے۔" یحیٰ بن سعیدؒ کہتے ہیں کہ حضرت سعید بن مسیّبؒ قرآن کریم کی صرف انہی آیات میں لب کشائی کرتے تھے جن کا مفہوم قطعی طور پر معلوم ہوتا تھا۔ یزید بن ابی یزیدؒ کہتے ہیں کہ جب سعید بن مسیّبؒ سے حلال وحرام اور جائز وناجائز کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ یہ دنیا کے سب سے بڑے عالم ہیں، لیکن جب ہم ان سے قرآن کریم کی کسی آیت کے بارے میں سوال کرتے تو ایسے خاموش ہو جاتے گویا انہوں نے سنا ہی نہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ "اعلم الصحابہؓ" ہیں اور حضرت سعید بن مسیّبؒ "اعلم التابعین" ہیں، لیکن علم وفضل، دانش وبصیرت، تقویٰ وطہارت اور نورِ قلب میں بلند مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود وہ قرآن کریم میں لب کشائی سے گریز کرتے ہیں، کیونکہ وہ اس کی نزاکت سے باخبر ہیں اور جانتے ہیں کہ تفسیر میں معمولی بے احتیاطی کا وبال کتنا سنگین ہے۔

شرائط مفسر

شرائطِ مفسر قرآن کریم کی تفسیر کے لیے کیسی لیاقت درکار ہے اور ایک مفسر قرآن میں کن اوصاف وشرائط کا پایا جانا ضروری ہے؟ علمائے امت نے اس پر تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے، حافظ جلال الدین سیوطیؒ (متوفی:۹۱۱ھ) نے "الاتقان" کی ۷۸ویں نوع میں اس کا خلاصہ درج کر دیا ہے۔ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ: بعض اہل علم تو اس کے قائل ہیں کہ کسی شخص کے لیے خواہ وہ کیسا عالم وفاضل ہو قرآن کریم کی تفسیر جائز ہی نہیں، بلکہ جو کچھ آنحضرت ﷺ سے منقول ہے اسی پر بس کرنا ضروری ہے۔ (مگر یہ قول عامہ علماء کے نزدیک صحیح نہیں، ناقل) اور علماء کی ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ جو شخص ان علوم میں مہارت رکھتا ہو، جو تفسیر کے لیے ضروری ہیں اس کے لیے قرآن کریم کی تفسیر جائز ہے اور یہ مندرجہ ذیل پندرہ علوم ہیں:
۱:۔۔۔۔۔علم لغت، ۲:۔۔۔۔۔علم صرف، ۳:۔۔۔۔۔علم نحو، ۴:۔۔۔۔۔علم اشتقاق، ۵:۔۔۔۔۔علم معانی، ۶:۔۔۔۔۔علم بیان، ۷:۔۔۔۔۔علم بدیع، ۸:۔۔۔۔۔علم قراءات، ۹:۔۔۔۔۔علم اصول الدین، ۱۰:۔۔۔۔۔علم اصول فقہ، ۱۱:۔۔۔۔۔علم اسباب النزول، ۱۲:۔۔۔۔۔علم ناسخ ومنسوخ، ۱۳:۔۔۔۔۔علم فقہ، ۱۴:۔۔۔۔۔علم حدیث، ۱۵:۔۔۔۔۔نورِ بصیرت اور وہبی علم۔

تفسیر کے آداب

اول

تفسیر کے مأخذ میں سب سے پہلا مأخذ قرآن کریم ہے، اس لیے مفسر کا فرض ہے کہ وہ کسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس کے سیاق وسباق کے ساتھ ساتھ اس مضمون کی دوسری آیات کو بھی پیش نظر رکھے، کیونکہ قرآن کریم میں ایک ہی مضمون کو مختلف انداز وعنوان سے بیان کیا جاتا ہے، ایک مضمون ایک جگہ مجمل ہو گا تو دوسری جگہ مفصل، ایک جگہ مختصر ہو گا تو دوسری جگہ مطوّل، ایک جگہ مطلق ہو گا تو دوسری جگہ مقیّد، پس قرآن کریم کی کسی آیت سے ایسا مفہوم کشید کرنا جائز نہیں ہو گا، جو خود قرآن کریم کی آیات بینات کے خلاف ہو۔

دوم

اسی طرح مفسر قرآن کا یہ بھی فرض ہے کہ کسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس ضمن میں آنحضرت ﷺ کے قول وفعل، ہدی وسیرت اور آپ ﷺ کی سنت وطریقہ کو پیش نظر رکھے اور تفسیر قرآن میں کوئی ایسی بات نہ کہے جو آنحضرت ﷺ کی سنت ثابتہ کے خلاف ہو، کیونکہ حق

تعالیٰ شانہٗ نے جس طرح قرآن کریم کے الفاظ آپ ﷺ پر نازل فرمائے ہیں، اسی طرح اس کی تشریح وتوضیح کا بھی خود ذمہ لیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:
"ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" (القیامۃ) "پھر اس کا بیان کرا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔" (ترجمہ تھانوی) اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ
آنحضرت ﷺ کو قرآن کریم کی مراد (بیان) بھی حق تعالیٰ شانہٗ کی طرف سے بتائی جاتی تھی، اس لیے قرآن کریم کے شارح ومفسر خود حق تعالیٰ شانہٗ ہیں اور چونکہ آنحضرت ﷺ نے وحی جلی وخفی اور نورِ نبوت کے ذریعہ قرآن کریم کو سمجھا تھا، اسی لیے آپ قرآن کریم کی تشریح وتفسیر میں بھی تلمیذ الرحمن تھے اور امت کو قرآن کریم کے مفہوم ومقصود سے آگاہ کرنا بھی آپ ﷺ کے فرائض میں شامل تھا، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:
"وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ" (النحل:۴۴) ترجمہ: "اور آپ پر بھی یہ قرآن اتارا ہے، تاکہ جو جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ان کو آپ ان پر ظاہر کر دیں اور تاکہ وہ فکر کیا کریں۔"

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ" (النحل:۶۴) ترجمہ: اور ہم نے تم پر یہ کتاب نہ اتاری مگر اس لیے کہ تم لوگوں پر روشن کر دو جس بات میں اختلاف کریں اور ہدایت اور رحمت ایمان والوں کے لیے۔" (ترجمہ کنز الایمان) ایک اور جگہ ارشاد ہے: "إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرٰكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا۔" (النساء:۱۰۵) ترجمہ: اے محبوب بے شک ہم نے تمہاری طرف سچی کتاب اتاری کہ تم لوگوں میں فیصلہ کرو جس طرح تمہیں اللہ دکھائے اور دغاوالوں کی طرف سے نہ جھگڑو۔" (ترجمہ کنزالایمان) پس امت کے لیے قرآن کریم کے سب سے پہلے شارح ومفسر خود
آنحضرت ﷺ تھے اور آنحضرت ﷺ کے تمام اقوال وافعال، احکام وفرامین اور آپ ﷺ کی سیرت وسنت قرآن حکیم ہی کی شرح وتفصیل ہے، اسی حقیقت کو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بنت صدیق ؓ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: "کان خلقه القرآن۔" (صحیح مسلم، ج:۱، ص:۲۵۶)۔۔۔۔ترجمہ: "آپ ﷺ کا اخلاق قرآن تھا۔" مطلب یہ کہ آپ ﷺ کے اخلاق وعادات، طور وطریق اور سیرت وکردار سب قرآن کریم کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے اور آپ ﷺ جو کچھ بھی فرماتے یا کرتے تھے وہ سب قرآن کریم ہی کی تعلیم تھی، اس لیے آپ ﷺ کا ہر حکم قرآن کریم کا شارح تھا، اسی کو امام شافعیؒ نے ذرا کھول کر یوں بیان فرمایا: "کل ما حکم به رسولُ الله صلی الله علیه وسلم فهو مما فهمهٗ من القرآن، قال تعالیٰ: إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ، فی آیات أخر"

(الاتقان فی علوم القرآن، ج:۲، ص:۱۷۶) ترجمہ: "رسول اللہ ﷺ نے جو فیصلے بھی فرمائے وہ آپ ﷺ نے قرآن کریم ہی سے سمجھے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک ہم آپ کے پاس یہ نوشتہ بھیجا ہے واقع کے موافق، تاکہ آپ ﷺ ان لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں، جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بتلا دیا ہے۔"

شارح اول سید المرسلین ﷺ ہیں

قرآن کریم کی تشریح و تفسیر کے لیے قرآن کریم کے شارح اول حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریح و تبیین کس قدر ناگزیر ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں سے ہو گا:

۱:۔۔۔۔ قرآن کریم میں بار بار "اقامتِ صلوٰۃ" کا حکم دیا گیا ہے، کس وقت کی نماز کی کتنی رکعات ہیں؟ نماز کے شرائط و ارکان کیا ہیں؟ نماز کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ بیسیوں سوالات ایسے ہیں جن کی تشریح سید عالم ﷺ نے اپنے قول و فعل سے فرمائی ہے اور ان تشریحات نبوی کے بغیر کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ قرآن کریم کے حکم "اقامتِ صلوٰۃ" کا مفہوم متعیّن کر سکے۔

۲:۔۔۔۔ قرآن کریم میں بہت سی جگہ زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، لیکن زکوٰۃ کس مال پر فرض ہے؟ کس پر نہیں؟ زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟ زکوٰۃ کی کتنی مقدار فرض ہے؟ یہ اور اس قسم کے تمام امور آنحضرت ﷺ کی تشریح سے امت کو معلوم ہوئے ہیں، ورنہ کوئی شخص مرادِ خداوندی کو دریافت نہیں کر سکتا تھا۔

۳:۔۔۔۔ قرآن کریم میں حج بیت اللہ کا حکم دیا گیا ہے، لیکن حج کا طریقہ کیا ہے؟ اور اس کے ارکان و لوازمات کیا ہیں؟ ان تمام امور کی تفصیل آنحضرت ﷺ کی قولی و عملی تشریح سے معلوم ہوئی، اس کے بغیر کوئی شخص "قرآنی حج" کا طریقہ کار متعیّن نہیں کر سکتا تھا۔ یہ چند مثالیں اسلام کے اہم ترین ارکان کی عرض کی گئی ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کی مراد آنحضرت ﷺ کے قول و فعل اور ہدی و سیرت میں متشکل ہو کر سامنے آتی ہے۔

مفسر کے لئے ضروری ہے کہ حضور سید عالم ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے مستنیر ہو

مفسر کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ تفسیر میں آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے انوار سے روشنی حاصل کرے اور کسی آیت کی ایسی تفسیر نہ کرے جو حضرات صحابہؓ کی تفسیر کے خلاف ہو، کیونکہ صحابہ کرامؓ مدرسۂ نبوت کے بلاواسطہ شاگرد ہیں اور حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے آنحضرت ﷺ ایسے معلم انسانیت کو، ان کا معلم و مرشد اور ہادی بنایا گیا، جیسا کہ متعدد مقامات پر فرمایا ہے: "وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم کتاب و حکمت کے بعد قرآن فہمی میں صحابہ کرام ؓ کا ہمسر کون ہو سکتا ہے؟ پھر صحابہ کرامؓ نزولِ وحی اور اس

کی عملی تشکیل کے عینی شاہد ہیں، سیوطیؒ نے الاتقان میں امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد نقل کیا ہے: "واللہ ما نزلت آیۃ إلا وقد علمتُ فیمَ أنزلت وأین أنزلت، إن ربی وھب لی قلبا عقولا ولسانا سئولا۔" (الاتقان، نوع:۸)

ترجمہ: "اللہ کی قسم! جو آیت بھی نازل ہوئی اس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ کس بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی؟ میرے رب نے مجھے بہت سمجھنے والا دل اور بہت پوچھنے والی زبان عطا فرمائی ہے۔" ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؓ نے بر سر منبر فرمایا: "سلونی، فواللہ لا تسألون عن شیء إلا أخبرتکم وسلونی عن کتاب اللہ، فواللہ ما من آیۃ إلا وأنا أعلم أبلیلٍ نزلت أم بنھار، أم فی سھل أم فی جبل۔" (حوالہ بالا) ترجمہ: "مجھ سے سوال کرو، پس اللہ کی قسم! مجھ سے جو بات بھی پوچھو گے اس کا جواب دوں گا اور مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں پوچھو، پس اللہ کی قسم! قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں مجھے یہ علم نہ ہو کہ وہ رات کے وقت اتری تھی یا دن کے وقت، میدان میں اتری تھی یا پہاڑ پر۔" اسی طرح فقیہ الامت حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ کا ارشاد نقل کیا ہے: "والذی لا إلٰہ غیرہٗ ما نزلت آیۃ من کتاب اللہ إلا وقد علمت فیمن نزلت وأین نزلت ولو أعلم مکان أحد أعلم بکتاب اللہ منی تنالہ المطایا لأتیتہٗ۔" (حوالہ بالا) ترجمہ: "اس ذات کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کتاب اللہ کی جو آیت بھی نازل ہوئی اس کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ کس کے حق میں نازل ہوئی؟ اور کہاں نازل ہوئی؟ اور اگر مجھے معلوم ہو کہ کوئی شخص کتاب اللہ کا مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے اور اس تک پہنچنا ممکن ہو تو میں ضرور اس کی خدمت میں حاضر ہوتا۔" پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایسی محنت وجانفشانی سے فہم قرآن میں مہارت حاصل کی تھی کہ کوئی دوسرا شخص اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا، اس سلسلہ میں صحابہ کرامؓ کے بہت سے عجیب وغریب واقعات نقل کیے گئے ہیں، ان تمام واقعات کو نقل کرنا موجب طوالت ہوگا، یہاں حضرت ابو عبد الرحمن اسلمیؒ کا صرف ایک فقرہ نقل کر دینا کافی ہوگا، وہ فرماتے ہیں: "حدثنا الذین کانوا یقرءون القرآن، کعثمان بن عفانؓ وعبد اللہ بن مسعودؓ وغیرھما أنھم کانوا إذ تعلموا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر آیات لم یتجاوزوھا حتّٰی یعلموا ما فیھا من العلم والعمل، قالوا: فتعلمنا القرآن والعلم جمیعا ولھٰذا کانوا یبقسون مدۃ فی حفظ السورۃ۔" (الاتقان، نوع:۷۸) ترجمہ: "جو حضرات ہمیں قرآن پڑھاتے تھے جیسے حضرت عثمانؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور دیگر حضرات ؓ، انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ جب آنحضرت ﷺ سے دس آیتیں سیکھ لیتے تھے تو آگے نہیں پڑھتے تھے، یہاں تک کہ ان آیات میں جو کچھ علم وعمل ہے اس کا علم حاصل نہ کر لیں، وہ فرماتے تھے کہ ہم نے قرآن کریم، علم اور عمل تینوں کو اکٹھے سیکھا تھا، اسی بنا پر وہ مدت تک ایک سورت کے حفظ میں مشغول رہتے تھے۔"

الغرض تفسیر نبوی کے بعد صحابہ کرامؓ کی تفسیر سب سے مقدم ہے اور حقیقت میں وہ بھی آنحضرت ﷺ ہی کی تعلیم کا ثمرہ ہے، اس لیے ایک مفسر کے لیے اس کا نظر انداز کرنا کسی طرح ممکن نہیں اور اسی ضمن میں اکابر تابعینؒ کی تفسیر آتی ہے جنھوں نے صحابہ کرامؓ سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی، اس لیے مفسر پر لازم ہے کہ وہ صحابہؓ وتابعینؒ کی تفسیر کے خلاف نہ چلے۔

مفسر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اہل حق کے عقائد واعمال اور اخلاق کا پابند ہو

،''الإتقان''میں امام ابوطالب طبریؒ سے نقل کیا ہے:''إن من شرطه صحة الاعتقاد أولا ولزوم سنة الدين، فإن من كان مغموصًا عليه في دينه لا يؤتمن على الدنيا فكيف على الدين، ثم لا يؤتمن في الدين على الاخبار عن عالم فكيف يؤتمن في الأخبار عن أسرار الله تعالى ولأنه لا يؤمن إن كان متهما بالإلحاد أن يبغي الفتنة ويغر الناس بليّه وخداعه۔'' (الاتقان، نوع:۷۸)

ترجمہ:''مفسر کے شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پہلے تو اس کا عقیدہ صحیح ہو، دوسرے وہ سنت دین کا پابند ہو، کیونکہ جو شخص دین میں مخدوش ہو کسی دنیوی معاملے میں بھی اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تو دین کے معاملے میں اس پر کیا اعتماد کیا جائے گا؟ پھر ایسا شخص اگر کسی عالم سے دین کے بارے میں کوئی بات نقل کرے اس میں بھی وہ لائق اعتماد نہیں، اسرارِ الٰہی کی خبر دینے میں تو کیا لائق اعتماد ہو گا۔ نیز ایسے شخص پر اگر الحاد کی تہمت ہو تو اس کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ تفسیر لکھ کر کوئی فتنہ نہ کھڑا کر دے اور لوگوں کو اپنی چرب زبانی و مکّاری سے گمراہ کرے۔''

خواہشات نفسانی سے پاک ہو

پنجم:۔۔۔۔اسی طرح ہر قسم کی بدعت وکجروی سے مفسر کے ذہن کا پاک ہونا بھی ضروری ہے، ورنہ اس کی تفسیر ناقابل اعتماد ہو گی، کیونکہ وہ قرآن کریم کو اپنی بدعت کے رنگ میں ڈھالنا شروع کر دے گا، نام تو ہو گا تفسیر قرآن کا، لیکن جو کچھ وہ لکھے گا وہ قرآن کریم کی تفسیر نہیں ہو گی، بلکہ اس کے بدعت آلود ذہن کا بخار ہو گا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں پر فہم قرآن کو حرام کر دیا ہے جو بدعت وخواہش نفسانی کا چشمہ لگا کر قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں۔''الاتقان''میں امام زرکشی کی''البرہان''سے نقل کیا ہے:''اعلم أنه لا يحصل للناظر فهم معاني الوحي ولا يظهر له أسرارهٗ وفي قلبه بدعة أو كبر أو هوىً أو حب الدنيا أو هو مصرّ على ذنب أو غير متحقق بالإيمان أو ضعيف التحقيق أو يعتمد على قول مفسر ليس عندهٗ علم أو راجع إلى معقوله وهٰذه كلها حجب وموانع بعضها آكد من بعض۔'' (الاتقان، ج:۲، نوع:۷۸، ص:۸۱) ترجمہ:''جاننا چاہیے کہ قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والے پر وحی کے معانی ظاہر نہیں ہوتے اور اس پر وحی کے اسرار نہیں کھلتے، جبکہ اس کے دل میں بدعت ہو یا تکبر ہو یا اپنی ذاتی خواہش ہو یا دنیا کی محبت ہو یا وہ گناہ پر اصرار کرنے والا ہو یا اس کا ایمان پختہ نہ ہو یا اس میں تحقیق کا مادہ کمزور ہو، یا وہ کسی ایسے مفسّر کے قول پر اعتماد کرے جو علم سے کورا ہو، یا وہ قرآن کریم کی تفسیر میں محض عقل کے گھوڑے دوڑاتا ہو، یہ تمام چیزیں فہم قرآن سے حجاب اور مانع ہیں، ان میں بعض دوسری بعض سے زیادہ قوی ہیں۔''

تفسیر بالرائے سے اجتناب

ششم:۔۔۔۔۔ تفسیر بالرائے جس طرح مفسّر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے خیالات وافکار سے خالی الذہن ہو کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ اس آیت میں قرآن کریم کی دعوت کیا ہے، اور کن کن مسائل پر روشنی ڈالی جارہی ہے، خود اپنے خیالات وافکار قرآن کریم میں ٹھونسنے کی کوشش نہ کرے، اسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہے کہ تفسیر بالرائے سے اجتناب کرے، کیونکہ تفسیر بالرائے حرام ہے اور اس پر سخت وعید آئی ہے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "من قال في القرآن برأيه فليتبوأ مقعدهٗ من النار وفي رواية: من قال في القرآن بغير علم فليتبوأ مقعده من النار۔" (رواہ الترمذی، مشکوۃ، ص:۳۵)

ترجمہ: "جس شخص نے قرآن میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے اور ایک روایت میں ہے کہ جس شخص نے بغیر علم کے قرآن میں کوئی بات کہی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے۔"

ایک اور حدیث میں ہے: "من قال في القرآن برأيه فأصاب فقد أخطأ۔" (رواہ الترمذی وابوداؤد)

ترجمہ: "جس شخص نے قرآن میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی اس نے اگر ٹھیک کیا تب بھی غلط کیا۔" تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے؟ امام سیوطیؒ "الاتقان، نوع:۷۸" میں ابن النقیبؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

تفسیر بالرائے سے مراد

تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے؟ اس میں اہل علم کے پانچ قول ملتے ہیں:

اول:۔۔۔۔۔ یہ کہ تفسیر قرآن کے لیے جن علوم کی ضرورت ہے کوئی شخص ان کو حاصل کیے بغیر تفسیر کرنے بیٹھ جائے۔

دوم:۔۔۔۔۔ کوئی شخص ان متشابہات کی تفسیر کرنے لگے جن کی مراد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

سوم: غلط مذہب کو ثابت کرنے کے لیے تفسیر کرنا، یعنی کوئی شخص اپنے مذہب فاسد کو تو اصل بنائے اور تفسیر کو اس کے تابع کرے اور جس طرح بھی ممکن ہو کھینچ تان کر قرآن کریم کو اپنے مذہب پر چسپاں کرے۔

چہارم: بغیر دلیل کے کسی آیت کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی قطعی مراد یہ ہے۔

پنجم: محض اپنی خواہش وپسند کے مطابق تفسیر کرنا۔ (الاتقان، جلد دوم، ص:۱۸۳)

تحریف معنوی

تحریفِ معنوی خلاصہ یہ کہ یہ تمام صورتیں تفسیر بالرائے کے تحت داخل ہیں، ہمارے زمانے میں قادیانی، پرویزی وغیرہ دیگر گمراہ اور کجرو فرقوں کی تفسیروں کا یہی حال ہے، ان کی تفسیر ' تفسیر بالرائے سے بڑھ کر قرآن کریم کی کھلی کھلی تحریف معنوی ہے، چنانچہ قرآن کریم کی آڑلے کر قطعیاتِ دین کا انکار کیا جاتا ہے، آنحضرت ﷺ کی سنت متواترہ کو پس پشت ڈالا جاتا ہے، اسلام کے قطعی واجماعی عقیدہ کو جھٹلایا جاتا ہے، چودہ سو سالہ اکابر امت کے اجماع مسلسل سے (جس کو قرآن کریم نے "سبیل المؤمنین" فرمایا ہے) انحراف کیا جاتا ہے اور لغت وزبان کے قواعد سے آزاد ہو کر قرآن کریم کو جاہلانہ تحریفات کا تختۂ مشق بنایا جاتا ہے، ضروری تھا کہ ایسی تحریفات کی بھی چند مثالیں ذکر کر دی جاتیں، لیکن افسوس کہ اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں۔ ترجمۂ قرآن کے آداب قرآن کریم کا ترجمہ بھی تفسیر وترجمانی ہی کی ایک صورت ہے، اس لیے ترجمۂ قرآن میں بھی مندرجہ بالا اصول کا لحاظ رکھنا اشد ضروری ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا صحیح ترجمہ کرنا اس کی تفسیر سے بھی مشکل اور نازک کام ہے، اس لیے اس میں حزم واحتیاط کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے، ترجمہ کرتے وقت قرآن کریم کے الفاظ واسلوب کی رعایت رکھنا چاہیے اور یہ ایسی مشکل اور دشوار گزار گھاٹی ہے کہ اچھے اچھے لوگ اس میں لڑکھڑا جاتے ہیں،

اولاً تفاسیر

1) تفسیر ابن ماجہ 250ہجری میں لکھی گئی۔)
2) (تفسیر ابن جریر 250ہجری میں۔
3) معالم التنزیل، تفسیر بغوی تقریباً 500ہجری۔
4) تفسیر ابن کثیر المولود 700 المتوفی 774۔
5) تفسیر رازی المتوفی 600ہجری۔
6) البحر المحیط لابن صیانی المتوفی 745 وغیرہ وغیرہ۔

تفسیری مآخذ

یعنی وہ ذرائع جن سے قرآن کریم کی تفسیر معلوم ہو سکتی ہے، یہ تقریباً چھ قسم کی بتلائی گئی ہیں:

(۱) تفسیر القرآن بالقرآن۔(قرآن کریم کی کسی آیت یالفظ کی تشریح قرآن ہی کی کسی دوسری آیت یالفظ سے کی جائے)

(۲) تفسیر القرآن بالاحادیث النبویہ صلی اللہ علیہ وسلم۔(قرآن مجید کے کسی آیت کی وضاحت آنحضرت ﷺ کے کسی قول یا فعل سے کی جائے)

(۳) تفسیر القرآن باقوال الصحابۃ رضی اللہ عنہم اجمعین۔(قرآن پاک کے کسی آیت کی تشریح حضرات صحابہ کرام میں سے کسی صحابی کے قول سے کی جائے، تفسیری شرائط کے ساتھ)

(۴) تفسیر القرآن باقوال التابعین رحمہم اللہ۔(قرآن مجید کے کسی آیت کی وضاحت حضرات تابعین میں سے کسی تابعی کے قول سے کی جائے، تفسیری شرائط کے ساتھ)

(۵) تفسیر القرآن بلغۃ العرب۔(قرآن مجید کے کسی آیت یا کسی لفظ کی تشریح اہل عرب کے اشعار اور عربی محاورات کے مطابق کی جائے، تفسیری شرائط کے ساتھ)

(۶) تفسیر القرآن بعقل السلیم۔(قرآن مجید کی تشریح وتوضیح اپنی صحیح سمجھ بوجھ اور منشائے خداوندی کو ملحوظ رکھ کر علوم اسلامیہ کی روشنی میں، حالات وواقعات، مواقع ومسائل پر اس کا صحیح انطباق کرنا اور اس کے اسرار ورموز کو کھولنا اور بیان کرنا تفسیر القرآن بعقل سلیم کہلاتا ہے)

ہر ایک کی تھوڑی سی تفصیل ضروری مثالوں سے ذیل میں ذکر کی جاتی ہے:

تفسیر القرآن بالقرآن

اختصار کی غرض سے اس کی صرف تین مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

پہلی مثال

سورۃ الفاتحہ کو ہی لیجئے، اِس کی دونوں آیتیں اس طرح ہیں:

"اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ. صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ"۔

(الفاتحۃ:۷،۶)

ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما، ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام کیا ہے۔

جن پر انعام کیا گیا ہے اس کی تفسیر "سورۃ النساء" کی درجِ ذیل آیت میں کی گئی ہے:

"وَمَنْ يُطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا"۔ (النساء:٦٩)

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں گے تو وہ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین اور وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں۔

دوسری مثال

"فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭاِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ"۔ (البقرة:٣٧)

پھر آدمؑ نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) کچھ الفاظ سیکھ لیے (جن کے ذریعہ انہوں نے توبہ مانگی) چنانچہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کرلی، بے شک وہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔

اس آیت میں کلمات کا تذکرہ ہے مگر وہ کلمات کیا تھے؟ دوسری آیت میں اس کی تفسیر موجود ہے:

"قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ"۔ (الاعراف:٢٣)

دونوں بول اٹھے کہ: اے ہمارے پروردگار! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گزرے ہیں اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔

تیسری مثال

"سورۃ الانعام" کی آیت نازل ہوئی:

"اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ"۔ (الانعام:٨٢)

جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کے ساتھ کسی ظلم کا شائبہ بھی آنے نہ دیا، امن و چین تو بس ان ہی کا حق ہے اور وہی ہیں جو صحیح راستے پر پہنچ چکے ہیں۔

تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم میں سے کون ایسا ہے کہ جس سے (کسی نہ کسی طرح کا) ظلم صادر نہ ہوا ہو، تو اللہ نے ظلم کی تفسیر و مراد کو واضح کرنے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی:

"إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ"۔ (لقمان:١٣)

کہ شرک ظلم عظیم ہے۔

یعنی آیت بالا میں ایمان کے ساتھ جس ظلم کا تذکرہ آیا ہے وہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ (بخاری، باب ظلم دون ظلم، حدیث نمبر:۳۱)

تفسیر القرآن بالقرآن کے موضوع پر ایک گرانقدر کتاب مدینہ منورہ کے ایک عالم شیخ محمد امین بن محمد مختار کی تالیف ہے جو "اضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

تفسیر القرآن بالحدیث والسیرۃ

قرآن پاک کی تفسیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کی روشنی میں کرنا تفسیر القرآن بالحدیث والسیرۃ کہلاتا ہے، خود قرآن کریم کی متعدد آیات میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں بھیجے جانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اقوال وافعال اور عملی زندگی سے آیات قرآنیہ کی تفسیر وتشریح فرمائیں۔ (النحل:۴۴)

توجس طرح اللہ تعالی نے انسانی زندگی کو بندگی بنانے کے لیے اپنے احکامات کو قرآن حکیم کی شکل میں نازل فرمایا، اسی طرح ان احکامات پر عمل آوری کے لیے آپ ﷺ کے پوری عملی زندگی کو درحقیقت قرآن پاک کی عملی تفسیر بنا کر مبعوث فرمایا، جو کچھ احکامات قرآن کریم کی شکل میں نازل کیے گئے ان پر سب سے پہلے آپ ﷺ ہی نے عمل کرکے دکھلایا اور ان احکامات خداوندی کو عملی جامہ پہنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا یہ آپ کی خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت ہے، خواہ وہ حکم ایمان، توحید، نماز، روزہ، زکوۃ، حج، صدقہ وخیرات، جنگ وجدال، ایثار و قربانی، عزم واستقلال، صبر وشکر سے تعلق رکھتا ہو یا حسن معاشرت وحسن اخلاق سے، ان سب میں قرآن مجید کی سب سے پہلی وعمدہ عملی تفسیر نمونہ وآئیڈیل کے طور پر آنحضرت ﷺ ہی کی ذات اقدس میں ملے گی، اس میں بھی دو قسم کی تفسیر ہے ایک تفسیر تو وہ قرآن پاک کے مجمل الفاظ وآیات کی تفسیر وتوضیح ہے جن کی مراد خداوندی واضح نہیں تو ان کی مراد واجمال کی تفصیل کو زبان رسالت مآب ﷺ نے واضح فرمادیا اور دوسری قسم عملی تفسیر کی ہے، یعنی قرآن حکیم کی وہ آیات جن میں واضح احکامات دئے گئے ہیں جن کا تعلق عملی زندگی کے پورے شعبۂ حیات سے ہے، خواہ وہ عقائد، عبادات، معاملات کی روسے ہوں یا حسن معاشرت وحسن اخلاق کی روسے اس میں بھی آپ ﷺ نے وہ کمال درجہ کی عبدیت اور اطاعت وفرمانبرداری کی ایسی بے مثال وبے نظیر عملی تفسیر وتصویر امت کے سامنے پیش فرمائی کہ جس طرح کلام اللہ تمام انسانی کلاموں پر اعجاز وفوقیت رکھتا ہے اسی طرح آپ کی عملی زندگی کا ہر قول وفعل بھی تمام انسانی زندگیوں پر اعجاز وفوقیت رکھتا ہے، دوسری قسم کی مثالیں کتب سیر، کتب مغازی، کتب تاریخ، کتب دلائل اور کتب شمائل میں بکثرت ملیں گے؛ بلکہ یہ کتابیں تو آپ ہی کی عملی تفسیر پیش کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں جن کی مثالوں کو یہاں ذکر نہیں کیا جارہا ہے پہلی قسم کی مثالیں کتب احادیث وتفسیر میں بکثرت ملیں گی ان میں سے بغرض اختصار صرف تین مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

پہلی مثال

سورۂ بقرہ کی آیت شریفہ:

"وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ"۔ (البقرۃ:۱۸۷)

اور اس وقت تک کھاؤ پیو جب تک صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے ممتاز ہو کر تم پر واضح (نہ) ہو جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیط ابیض اور خیط اسود کی مراد کو اپنے ارشاد مبارک سے واضح فرمایا:

"إِنَّمَا ذَلِكَ سَوَادُ اللَّيْلِ وَبَيَاضُ النَّهَار"۔

(بخاری، بَاب قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى، وَكُلُوا وَاشْرَبُوا، حدیث نمبر:۱۷۸۳، شاملہ، موقع الإسلام)

کہ خیط ابیض سے مراد صبح صادق اور خیط اسود سے مراد صبح کاذب ہے۔

دوسری مثال

سورہ نور کی آیت:

"اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ"۔ (النور:۲)

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے دین کے معاملہ میں ان پر ترس کھانے کا کوئی جذبہ تم پر غالب نہ آئے اور یہ بھی چاہیے کہ مؤمنوں کا ایک مجمع ان کی سزا کو کھلی آنکھوں دیکھے۔

ظاہر ہے کہ اس آیت سے زانیہ اور زانی کی سزا میں سو کوڑے مارنے کا ذکر ہے، اس میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کا کوئی فرق نہیں کیا گیا؛ اس کی تفسیر احادیث پاک سے واضح ہوتی ہے کہ غیر شادی شدہ کو کوڑوں کی سزا دی جائے گی جیسا کے بخاری شریف میں ہے:

"عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ أَمَرَ فِيمَنْ زَنَى وَلَمْ يُحْصَنْ بِجَلْدِ مِائَةٍ وَتَغْرِيبِ عَامٍ"۔ (بخاری، بَاب شَهَادَةِ الْقَاذِفِ وَالسَّارِقِ وَالزَّانِي، حدیث نمبر:۲۴۵۵، شاملہ، موقع الإسلام)

زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غیر شادی شدہ زنا کرنے والوں کو سو کوڑے مارنے کا اور ایک سال کے لیے وطن سے نکالنے کا حکم دیا۔

اور شادی شدہ مرد و عورت کو سنگسار کیا جائے گا:

"الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوهُمَا أَلْبَتَّةَ، رَجَمَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ"۔

(ابن ماجہ، باب الجرم، حدیث نمبر: ۲۵۴۳، شاملہ، موقع الإسلام)

شادی شدہ مرد و عورت جب زنا کے مرتکب ہوں تو ان کو رجم کرو، یعنی سنگسار کر دو، راوی کہتے ہیں کہ خود حضور ﷺ نے اپنی زندگی میں ایسی سزا دی ہے اور بعد میں ہم نے بھی ایسی سزا دی ہے۔

تیسری مثال

قرآن کی تفسیر حدیث سے کرنے کی مثال میں یہ آیت پیش کی جاسکتی ہے:

"غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ"۔ (الفاتحۃ:۷)

نہ کہ ان لوگوں کے راستے پر جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ ان کے راستے کی جو بھٹکے ہوئے ہیں۔

قرآن پاک میں المغضوب اور الضال کا مصداق متعین نہیں کیا گیا ہے؛ لیکن ان دونوں کا مصداق متعین کرتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ أَلْيَهُودُ وَإِنَّ الضَّالِّينَ النَّصَارَىٰ"۔

(مسند احمد بن حنبل، بقیۃ حدیث بن حاتم، حدیث نمبر: ۹۴۰۰، شاملہ، موقع الإسلام)

جن پر غضب نازل ہوا اس سے مراد یہود ہیں اور جو راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں اس سے مراد نصاری ہیں۔

تفسیر القرآن باقوال الصحابۃ رضی اللہ عنہم

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم چونکہ بجاطور پر خیر امت کہلانے کے مستحق ہیں جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست قرآن کریم کی تعلیم وتربیت حاصل کی، ان میں سے بعض وہ ہیں جو اپنی پوری زندگی اس کام کے لیے وقف کردیں کہ قرآن کریم اور اس کی تفسیر وتاویل کو بلاواسطہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کریں، اہل زبان ہونے کے باوجود ان کو صرف زبان دانی پر بھروسہ نہ تھا؛ چنانچہ بعض صحابہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سبقاً سبقاً قرآن کریم کو پڑھا، مشہور تابعی ابوعبدالرحمن سلمی فرماتے ہیں:

"حَدَّثَنَا الَّذِينَ كَانُوا يَقْرَؤُونَ الْقُرْآنَ كَعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ وَعَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ وَغَيْرِهِمَا أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا تَعَلَّمُوا مِنَ النَّبِيِّ ﷺ عَشَرَ آيَاتٍ لَمْ يَتَجَاوَزُوهَا حَتَّى يَعْلَمُوا مَا فِيهَا مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ"۔

(الاتقان فی علوم لقرآن، الفصل فی شرف التفاسیر، النوع الثامن والسبعون: ۲/۴۶۸، شاملہ، المؤلف: عبدالرحمن بن الکمال جلال الدین السیوطي)

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جو قرآن کی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا کرتے تھے، مثلاً حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ انہوں نے ہمیں یہ بتایا کہ وہ لوگ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں سیکھتے تو ان آیتوں سے آگے نہ بڑھتے جب تک ان آیتوں کی تمام علمی وعملی باتوں کو نہ جان لیتے۔

یہ ہے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم وتربیت کا سیکھنا کہ جتنا سیکھتے اتنا عمل کا بھی اہتمام فرماتے شاید اسی وجہ سے مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ اثر منقول ہے:

"كَانَ الرَّجُلُ إِذَا قَرَأَ الْبَقَرَةَ وَآلَ عِمْرَانَ جَدَّ فِينَا"۔

(مسند احمد، مسند انس بن مالک، حدیث نمبر: ۱۱۷۶۹)

یعنی جب کوئی شخص سورۃ بقرہ وآل عمران کو پڑھ لیتا تو وہ ہماری نظروں میں بہت ہی عزت والا سمجھا جاتا اور موطا مالک کی روایت میں ہے:

"أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ مَكَثَ عَلَى سُورَةِ الْبَقَرَةِ ثَمَانِيَ سِنِينَ يَتَعَلَّمُهَا"۔

(مَوَطامالک، كِتَابُ النِّدَاءِ لِلصَّلَاةِ، بَاب مَا جَاءَ فِي الْقُرْآنِ، حدیث نمبر: ۴۲۸، شاملہ، موقع الِاسلام)

حضرت عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کو سورۂ بقرہ یاد کرنے میں آٹھ سال لگے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اتنے کمزور ذہن والے تھے کہ سورۂ بقرہ یاد کرنے میں آٹھ سال لگے، جبکہ موجودہ دور میں کمزور سے کمزور طالب علم اتنے عرصہ سے کم میں پورا قرآن کریم حفظ کرلیتا ہے، دراصل بات یہ تھی کہ آٹھ سال کی مدت حضرت ابن عمر رضی

اللہ عنہ کو سورۂ بقرہ کے الفاظ اور اسکی تفسیر و تاویل اور اسکے متعلقات کے ساتھ حاصل کرنے میں لگی، اسکی تائید حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس اثر سے ہوتی ہے جسکو ابن کثیر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے:

"والذی لا إله غيره مانزلت آية من، كتاب الله إلا وأنا أعلم فيمن نزلت؟ وأين نزلت؟ ولو أعلم أحدا أعلم بكتاب الله مني تناله المطايا لاتيته"۔ (ابن کثیر:۱/۳)

قسم ہے اس ذات کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نازل نہیں ہوئی جسکے بارے میں مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کس بارے میں اور کہاں نازل ہوئی اور اگر مجھے معلوم ہو تا کہ کوئی شخص ایسی معلومات مجھ سے زیادہ رکھتا ہے اور سواریاں اس شخص تک پہونچا سکتی ہیں تو میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا۔

یہ چند نمونے ہیں حضرات صحابہ کی جانفشانی اور ان کی محنت کے جو تفسیر قرآن کے سلسلہ میں پیش کئے گئے، یوں تو بہت سی آیات کی تفسیر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال سے ثابت ہیں ان میں سے کچھ برائے نمونہ پیش ہیں۔

پہلی مثال:

ایک دفعہ حضرت بن عمرؓ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور درج ذیل آیت کی تفسیر دریافت کی:

"أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا"۔ (الانبیاء:۳۰)

کیا کفار نے دیکھا نہیں کہ آسمان وزمین بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا۔

حضرت بن عمرؓ نے اس سے فرمایا کہ تم ابن عباسؓ کے پاس جاؤ اور ان سے اس کی تفسیر معلوم کرو اور وہ جو تفسیر بتائیں وہ مجھے بھی بتاتے جانا، وہ شخص ابن عباسؓ کے پاس پہنچا اور درج بالا آیت کی تفسیر پوچھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

آسمان خشک تھے ان سے بارش نہیں ہوتی تھی اور زمین بانجھ تھی اس سے کچھ اُگتا نہیں تھا، بارش کے طفیل یہ پودے اگانے لگی؛ گویا آسمان کا فتق (پھٹنا) بارش کے ساتھ ہے اور زمین کا پھل پودے اگانے سے۔

اس شخص نے حضرت ابن عمرؓ کو جب یہ تفسیر بتائی تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالی کی جانب سے ان کو خصوصی علم عطا ہوا ہے۔

(روح المعانی، ۱۲/۳۶۹ش، املہ)

دوسری مثال

"وَاَنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ‌ۛ‌ۚ وَاَحۡسِنُوۡا ‌ۛ‌ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ"۔

(البقرۃ:۱۹۵)

اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں اور نیکی کرو، بیشک اللہ تعالی دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو۔

اس آیت کی تشریح میں مفسرین نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ:

"التهلكة الاقامة فى الاهل والمال وترك الجهاد"۔

(تفسیر بن کثیر، تحت قولہ وَلَاتُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ)

"التھلکۃ "سے مراد گھر اور مال کی مصروفیات میں لگا رہنا اور جہاد کو چھوڑ بیٹھنا ہے۔

عام مفسرین نے اپنی اپنی تفاسیر میں اس تفسیر کو خاص طور سے نقل کیا ہے۔

تیسری مثال

علامہ طبری روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے درج ذیل آیت کے متعلق دریافت کیا:

"أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ"۔ (البقرۃ:۲۶۶)

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں (اور) اس کو اس باغ میں اور بھی ہر طرح کے پھل حاصل ہوں اور بڑھاپے نے اسے آ پکڑا ہو اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں، اتنے میں ایک آگ سے بھرا بگولا آ کر اس کو اپنی زد میں لے لے اور پورا باغ جل کر رہ جائے۔

کوئی بھی اس کا شافی جواب نہ دے سکے، حضرت ابن عباسؓ نے عرض کیا کہ میرے دل میں ایک بات آ رہی ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آپؓ بلا جھجک برملا بیان کیجیے، ابن عباسؓ نے فرمایا:

"اللہ تعالی نے اس آیت میں ایک مثال بیان کی ہے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ عمر بھر نیکی کا کام کرتا رہے اور جب اس کا آخری وقت آئے جب کے نیکیوں کی اسے زیادہ ضرورت ہو تو بُرا کام کر کے سب نیکیوں کو برباد کر دے"۔

(تفسیر طبری، ۵/۵۴۵، شاملہ)

ایک اہم بات اس بارے میں اہل اصول نے بتلائی ہے کہ جن صحابہ رضی اللہ عنہم کے تفسیری اقوال میں صحیح وسقیم ہر طرح کی روایتیں ملتی ہیں تو ان اقوال کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کئے جانے سے پہلے اصولِ حدیث کے اعتبار سے انکی جانچ ضروری ہے۔

۲۔ نیز دوسرے یہ کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال تفسیر اسی وقت حجت، دلیل سمجھے جائیں گے جبکہ آپ ﷺ سے آیت شریفہ کی کوئی صریح تفسیر مستند طور پر ثابت نہ ہو؛ چنانچہ اگر آپ ﷺ سے تفسیر منقول ہو تو پھر صحابہ رضی اللہ عنہ سے اقوال محض اس تفسیر کی تائید شمار کئے جائنگے اور اگر آپ ﷺ کے معارض کوئی قول صحابی رضی اللہ عنہ ہو تو اس کو قبول نہ کیا جائے گا۔

۳۔ تیسرے یہ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال تفسیر میں اگر تعارض اور ٹکراؤ ہو تو جہاں تک ہو سکے انکے اقوال میں مطابقت پیدا کی جائیگی اگر مطابقت نہ ہو سکے تو پھر مجتہد کو اس بات کا اختیار ہو گا کہ دلائل کی روشنی میں جس صحابی رضی اللہ عنہ کا قول مضبوط ہے اسکو اختیار کر لے۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے مقدمہ تفسیر ابن کثیر ۱/۳)۔ (واللہ تعالی اعلم)

اس موضوع پر مستقل کتاب، تنویر المقیاس فی تفسیر ابن عباس" ہے اور اس کے علاوہ دیگر کتب تفاسیر میں صحابہ کی تفسیری روایات مذکور ہیں۔

تفسیر القرآن باقوال التابعین

واضح ہونا چاہئے کہ تابعین سے مراد تمام ہی تابعین نہیں ہیں؛ بلکہ وہ حضرات تابعین جنہوں نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ کی صحبت اٹھائی ہو اور انکی صحبت سے علمی استفادہ کیا ہو، اہل علم میں اس بات پر بھی اختلاف ہے کہ تفسیر قرآن کے بارے میں اقوال تابعین حجت ہیں یا نہیں، اس معاملہ میں علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہت ہی معتدل بات لکھی ہے کہ اگر کوئی تابعی کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے تفسیر نقل کر رہے ہوں تو اس کا حکم صحابی کی تفسیر جیسا ہو گا اور اگر خود تابعی اپنا قول بیان کریں تو دیکھا جائے گا کہ دوسرے کسی تابعی کا قول ان کے خلاف تو نہیں اگر خلاف میں کوئی قول ہو تو پھر اس تابعی کے قول کو حجت نہیں قرار دیا جائے گا؛ بلکہ ایسی آیات کی تفسیر کے لیے قرآن کی دوسری آیتیں، احادیث نبویہ، آثار صحابہ رضی اللہ عنہم اور لغت عرب جیسے دوسرے دلائل پر غور کر کے فیصلہ کیا جائے گا، ہاں اگر تابعین کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو تو ان کے تفسیری اقوال کو بلاشبہ حجت اور واجب الاتباع قرار دیا جائے گا۔

(بحوالہ تفسیر ابن کثیر، ۱-۵، مطبوعہ المکتبہ التجاریۃ الکبری)

جب تابعین کے اقوال پر تفسیر کی جاسکتی ہے تو اس کے کچھ نمونے بھی ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

پہلی مثال

ارشاد باری تعالی ہے:

"وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ، رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ "۔

(التوبہ:١٠٠)

اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے پیرو ہوئے نیکی کے ساتھ اللہ تعالی راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے اور اللہ نے تیار کر رکھا ہے ان کے واسطے ایسے باغات کہ بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں رہا کریں ان میں وہ ہمیشہ یہی ہے بڑی کامیابی۔

اس آیت شریفہ میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ کے مختلف درجاتِ فضیلت بیان کئے گئے ہیں ایک سابقین اولین کا، دوسرے انکے بعد والوں کا، اب سابقین اولین کون ہیں، اس میں مفسرین کے مختلف اقوال نقل کئے جاتے ہیں، کبار تابعین حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ، ابن سیرین رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ اس سے مراد وہ صحابہ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی اور عطاء بن ابی رباح کا یہ قول ہے کہ سابقین اولین سے مراد بدر میں شریک ہونے والے صحابہ ہیں اور شعبی نے فرمایا کہ وہ جو کہ حدیبیہ کے موقع پر بیعت رضوان میں شامل رہے۔

(تفسیر روح المعانی، تفسیر سورۂ توبہ، آیت نمبر ١٠٠)

اس آیت میں تابعین رحمہ اللہ کے مختلف اقوال سامنے آئے، مفسرین نے کسی قول کو رد نہیں کیا اور ان کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔

دوسری مثال

ارشاد باری تعالی ہے:

" اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ، وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ "۔

(التوبہ:١١٢)

توبہ کرنے والے، اللہ کی بندگی کرنے والے، اس کی حمد کرنے والے، روزے رکھنے والے، رکوع میں جھکنے والے، سجدہ گزارنے والے، نیکی کی تلقین کرنے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کی حفاظت کرنے والے (اے پیغمبر) ایسے مؤمنوں کو خوشخبری دے دو۔

آیت میں ایک لفظ " اَلسَّائِحُوْنَ " آیا ہے، جس کا مطلب جمہور مفسرین کے ہاں " صَائِمُوْنَ "یعنی روزہ دار مراد ہیں اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن میں جہاں کہیں بھی سائحین کا لفظ آیا ہے وہاں صائمین مراد ہیں، حضرت عکرمہؒ جو کبارِ تابعین میں سے ہیں انہوں نے کہا سیاحت کرنے والوں سے مراد طالب علم ہیں جو علم کی طلب میں ملکوں میں پھرتے ہیں۔

(تفسیر روح المعانی، تفسیر سورۂ توبہ، آیت نمبر:١١٢)

اس تفسیر کو مفسرین نے رد نہیں کیا ہے اگرچیکہ حضرت عکرمہ رحمہ اللہ اس تفسیر میں منفرد ہیں۔

تیسری مثال

ارشاد باری تعالی ہے:

"اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ (التوبہ:٦٠)

صدقات تو صرف غریبوں کے لیے ہیں..الخ۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے غنی اور فقیر کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے، غنی سے متعلق امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ غنی وہ شخص ہے جس کے پاس اصلی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد بقدر نصاب زکوۃ مال باقی رہے۔

(تفسیر روح المعانی، سورۂ توبہ: آیت نمبر:٦٠)

عام مفسرین نے امام ابو حنیفہؒ کے ذکر کردہ تعریف غنی کو اپنی تفاسیر میں بلا کسی نکیر کے ذکر فرمایا ہے۔

اس موضوع پر بھی بہت سی تفاسیر لکھی گئی ہیں؛ چنانچہ علامہ نیشاپوری رحمہ اللہ کی تفسیر "غرائب القرآن اوررغائب الفرقان" قابل ذکر ہے اور علامہ نسفیؒ کی مدارک التنزیل بھی قابل ذکر ہے اور علامہ آلوسی کی روح المعانی بھی ایک وقیع تفسیر ہے۔

نیز اردو تفاسیر میں علامہ غلام رسول سعیدیؒ کی تفسیر تبیان القرآن بھی اہم تفاسیر میں سے ایک ہے۔

تفسیر القرآن بلغۃ العرب

لغت عرب کو تفسیر کا ماخذ ماننے میں اگرچہ اہل علم کے یہاں اختلاف ہے، جیسے کہ امام محمد رحمہ اللہ نے لغۃ عرب سے قرآن کی تفسیر کو مکروہ قرار دیا ہے(حوالہ البرھان ٢/١٦٠انوع ٤١) کیونکہ؛ عربی زبان ایک وسیع زبان ہے اور بعض اوقات ایک لفظ کئی معانی پر مشتمل ہوتا ہے اور ایک جملے کے

بھی متعدد اور کئی مفہوم ہو سکتے ہیں تو ایسے مواقع پر صرف لغت عرب کو بنیاد بنا کر ان میں سے کوئی ایک مفہوم متعین کرنا تفسیر میں مغالطہ کا سبب بن سکتا ہے اور اسی وجہ سے اسکو مکروہ بھی کہا گیا ہے مگر محققین کا کہنا ہے کہ مغالطہ اسی وقت ہوتا ہے جبکہ لغت کے کثیر الاستعمال معانی کو چھوڑ کر انتہائی قلیل الاستعمال معنی مراد لیے جائیں اس لیے ایسی جگہ جہاں قرآن وسنت وآثار صحابہ وتابعین میں سے کوئی صراحت نہ ملے تو آیت کی تفسیر لغت عرب کے عام محاورات (جن کا چل چلاؤ ہو) کے مطابق کی جائیگی۔

پہلی مثال

ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے صحابہ کرامؓ سے درج ذیل آیت کے معنی دریافت کیے:

"أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ"۔ (النحل:۴۷)

یا انہیں اس طرح گرفت میں لے کہ وہ دھیرے دھیرے گھٹتے چلے جائیں۔

یہ سن کر قبیلہ بنو ھذیل کا ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ ہماری زبان میں "تخوف" کمی اور نقصان کو کہتے ہیں، حضرت عمرؓ نے پوچھا عربی اشعار میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ اس نے کہا جی ہاں اور فوراً یہ شعر پڑھ دیا:

*تَخَوَّفَ الرَّحْلُ منها تامِكاً قَرِداً * كما تَخَوَّفَ عُودَ النبعةِ السَّفِنُ*

ترجمہ: کجاوہ کی رسی اونٹنی کے کوہان کے بال کو کم کرتی رہتی ہے، جیسا کہ لوہا کشتی کی لکڑی کو کم کرتا رہتا ہے۔

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا اپنے دیوان کو تھامے رکھو، صحابہ نے عرض کیا دیوان سے کیا مراد ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا جاہلی شاعری، اس میں قرآن کی تفسیر اور تمہاری زبان کے معانی موجود ہیں۔

(روح المعانی ۱۰/۱۷۹، شاملہ)

دوسری مثال

علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ صحن کعبہ میں تشریف فرما تھے سوال کرنے والوں کا ایک ہجوم تھا دو آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم آپ سے تفسیر قرآن کے متعلق کچھ سوالات کرنا چاہتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا دل کھول کر پوچھئے، انہوں نے پوچھا کہ آپؓ اس آیت باری تعالی کی تفسیر بتائیے:

"عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ"۔ (المعارج:۳۷)

دائیں بائیں حلقے باندھے ہوں گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا عزین کے معنی ہیں ساتھیوں کے حلقے، انہوں نے پھر سوال کیا کہ کیا اہل عرب اس معنی سے واقف ہیں؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: جی ہاں پھر آپ نے عبید بن الابرص کا شعر پڑھا۔

فَجَاؤُا يُهْرَعُوْنَ إِلَيْهِ حَتّٰ
يَكُوْنُوْا حَوْلَ مِنْبَرِهٖ عِزِيْنًا

وہ لوگ اس کی طرف بھاگتے ہوئے آتے ہیں
اس کے منبر کے گرد حلقہ باندھ لیتے ہیں

(الاتقان، ۲/ ٦٨، شاملہ)

دیکھیے یہاں حضرت ابن عباسؓ نے آیت بالا کی تفسیر لغت عرب کی مدد سے کی ہے۔

تیسری مثال

اُسی صاحب نے آپ رضی اللہ عنہ سے درج ذیل آیت کی تفسیر دریافت کی:

"وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ"۔ (المائدۃ:۳۵)

اور اس تک پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وسیلہ حاجت اور ضرورت کو کہتے ہیں اس نے پوچھا کہ اہل عرب اس معنی سے واقف ہیں: آپ ﷺ نے فرمایا کیا آپ نے عنترۃ نامی شاعر کا شعر نہیں سنا ہے؟ پھر شعر پڑھا:

إِنَّ الرِّجَالَ لَهُمْ إِلَيْكِ وَسِيلَةٌ إِنْ يَأْخُذُوكِ تَكَحَّلِي وَتَخَضَّبِي

(الاتقان:۲/ ٦٩)

اس شعر میں وسیلہ کا لفظ حاجت وضرورت کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ ابن عباسؓ نے آیت بالا کی تفسیر لغت عرب سے کی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے بہت سی تفاسیر لکھی گئی ہیں، ان میں تفسیر خازن جس کا اصل نام "لباب التاویل فی معانی التنزیل(۲) السراج المنیر فی الاعانۃ علی معرفۃ بعض معانی کلام ربنا الحکیم الخبیر، للخطیب شربنی" قابل ذکر ہیں۔

تفسیر القرآن بعقل سلیم

عقل سلیم جس کی اہمیت وضرورت سے کسی کو انکار نہیں، دنیا کے ہر کام میں اسکی اہمیت ہوتی ہے اور پچھلے مآخذ سے فائدہ اٹھانا بغیر عقل سلیم کے معتبر نہیں اس ماخذ کو علیحدہ لکھنے کی ضرورت محض اس لیے پڑتی ہے کہ قرآن کریم کے معارف ومسائل، اسرار ورموز یقیناً ایک بحر بیکراں ہیں اور پچھلے مآخذ سے ان کو ایک حد تک سمجھا جاسکتا ہے؛ لیکن کسی نے بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ قرآن کریم کے اسرار ومعارف کی انتہاء ہوگئی اور مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی، یہ بات خود قرآن کریم کی صریح آیتوں کے خلاف ہوگی، فرمان خداوندی ہے:

"قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ، الخ"۔ (الکہف:۱۰۹)

کہہ دو کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر روشنائی بن جائے، تو میرے رب کی باتیں ختم نہیں ہوں گی کہ اس سے پہلے سمندر ختم ہو چکا ہو گا، چاہے اس سمندر کی کمی پوری کرنے کے لیے ہم ویسا ہی ایک سمندر کیوں نہ لے آئیں۔

گویا اس آیت میں وضاحت ہے کہ ساری مخلوق مل کر بھی کلمات الہی کا احاطہ کرنا چاہے تو ممکن نہیں سارا سامان تسوید ختم ہو جائیگا اور لامتناہی کسی طرح بھی متناہیوں کی گرفت میں نہ آسکے گا، متناہی صفات والے لامتناہی صفات والی ہستی کو کیونکر اپنی گرفت میں لاسکتے ہیں اور یقیناً قرآن کریم بھی صفات باری میں سے ایک ہے لہذا عقل سلیم کے ذریعہ ان حقائق اور اسرار پر غور وفکر کا دروازہ قیامت تک کھلا ہوا رہے گا اور جس شخص کو بھی اللہ تعالی نے علم وعقل اور خشیت وتقوی اور رجوع الی اللہ کی صفات سے مالامال کیا وہ تدبیر کے ذریعہ نئے نئے حقائق تک رسائی حاصل کر سکتا ہے؛ چنانچہ ہر دور کے مفسرین کی تفسیریں اس بات کی واضح دلیل ہیں۔

اور نبی اکرم ﷺ کی دعا جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے تھی:

"اَللّٰھُمَّ عِلِّمْہُ الْکِتَابَ وَفقهُ فِي الدِّيْنِ"۔

(کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال:۱۳/۴۵۸، شاملہ، المؤلف: علي بن حسام الدين المتقي الهندي۔ بخاری، كِتَاب الْوُضُوءِ، بَاب وَضْعِ الْمَاءِ عِنْدَ الْخَلَاءِ، حدیث نمبر:۱۴۰، شاملہ، موقع الإسلام)

ترجمہ: اے اللہ ان کو تاویل یعنی تفسیر قرآن اور دین کی سمجھ عطا فرما۔

یہ دعا بھی اشارہ کرتی ہے کہ اس باب میں راہیں کھلی ہیں البتہ اہل علم نے اس معاملہ میں یہ اصول ضرور بتلایاہے کہ عقل سلیم کے ذریعہ مستنبط ہونے والے وہی مسائل اور معارف معتبر ہوں گے جو سابق مآخذ سے متصادم نہ ہوں،یعنی ان سے نہ ٹکراتے ہوں،اصول شرعیہ کے خلاف کوئی نکتہ آفرینی کی جائے تواسکی کوئی قدر وقیمت نہ ہوگی۔

ہم کو ایمان رکھنا چاہئے کہ کل کائنات خدا کی بنائی ہوئی اور اس کے قبضۂ قدرت میں ہے،لہذا قرآن کریم کی بعض آیتوں سے اگر کوئی ڈاکٹر یا سائنس داں معلومات کو اخذ کرتاہے اور وہ معلومات مذکورہ اصولوں سے متصادم نہ ہوں تو ایسی تفسیر بھی قابل اعتبار ہوگی۔

پہلی مثال

"لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنَاثاً وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُورَo أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَاناً وَإِنَاثاً وَيَجْعَلُ مَنْ يَشَاءُ عَقِيماً إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ"o۔ (الشوری:۴۹،۵۰)

سارے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کی ہے،وہ جو چاہتاہے پیدا کرتاہے،وہ جس کو چاہتاہے لڑکیاں دیتاہے اور جس کو چاہتاہے لڑکے دیتاہے یا پھر ان کو ملا کر لڑکے بھی دیتاہے اور لڑکیاں بھی اور جس کو چاہتاہے بانجھ بنادیتاہے،یقیناًوہ علم کا بھی مالک ہے قدرت کا بھی مالک۔

بعض لوگوں کا کہناہے کہ اس آیت میں خنثیٰ(ایسا شخص جو نہ مرد ہو نہ عورت)کا تذکرہ نہیں کیاہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے؛لیکن ابن العربیؒ نے اس کا جواب دیاہے کہ ایسا کہنا عقل کے خلاف بات ہے اس لیے کہ اللہ نے آیت کے ابتداء ہی میں فرمادیا"يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ"وہ جو چاہتاہے پیدا کرتاہے،لہذا اس میں خنثیٰ بھی شامل ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن:۱۶/۵۲،شاملہ)

دوسری مثال

حضرت موسیٰ جب کوہ طور پر تیس دن کے لیے تشریف لے گئے تھے اور انہیں چالیس یوم تک وہاں رہنا پڑا تھا تو ان کے غائبانہ ان کی قوم نے بچھڑے کی پرستش شروع کردی تھی اس واقعہ سے متعلق ایک حصہ کو قرآن پاک نے یوں بیان کیاہے:

"وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَى مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا"۔ (الاعراف:۱۴۸)

موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان کے بعد زیورات سے ایک بچھڑا بنالیا۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ تستری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بچھڑے سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی محبت میں گرفتار ہوکر انسان اللہ سے منہ موڑلے ؛مثلاً اہل واولاد اور مال وغیرہ انسان تمام خواہشات کو ختم کردے جس طرح بچھڑے کے پجاری اس سے اسی حالت میں چھٹکارا پاسکتے ہیں جب وہ اپنی جانوں کو تلف کردیں۔ (التفسیر التستری:۱/۱۶۹،شاملہ)

یہ تفسیر بھی عقل سلیم کی روشنی میں کی جانے والی تفسیر کے قبیل سے ہے اور یہ اصول شرعیہ کے مخالف بھی نہیں ہے۔

تیسری مثال

قرآن پاک نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ذکر کیا ہے جس میں اللہ تعالی نے ان کو اپنے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم دیا تھا قرآن پاک میں یوں ہے:

"وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ "۔ (الصافات:۱۰۷)

اور اس کے عوض ہم نے ایک بڑا جانور دے دیا۔

اس کی تفسیر میں علامہ تستری لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بتقاضائے بشریت اپنے بیٹے سے محبت کرتے تھے اس لیے اللہ تعالی نے آزمائش کے طور پر اس کو ذبح کرنے کا حکم دیا، منشأ خداوندی دراصل یہ نہ تھا کہ ابراھیمؑ بیٹے کو ذبح کرڈالیں؛ بلکہ مقصود یہ تھا کہ غیر اللہ کی محبت کو دل سے نکال دیا جائے، جب یہ بات پوری ہوگئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی عادت سے باز آگئے تو اسماعیل کے عوض ذبح عظیم عطا ہوئی۔ (التفسیر التستری:۱/۴۳۹، شاملہ)

یہ تفسیر بھی اسی قبیل سے ہے اور اصول شرعیہ کے معارض بھی نہیں ہے اس لیے اس کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اس عنوان پر تفسیریں بھی لکھی گئی ہیں، علامہ ابوالسعود کی "ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم" اور " تفسیر التستری" قابل ذکر ہیں۔

تفسیر کے لیے ضروری علوم

قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں، ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، جنت و دوزخ کا تذکرہ اور فکر آخرت پیدا کرنے والی باتیں وغیرہ جس کو ہر عربی داں شخص سمجھ سکتا ہے؛ بلکہ مستند ترجمہ کی مدد سے اپنی مادری زبان میں بھی ان آیات کو سمجھ سکتا ہے، ان آیات کے متعلق اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ "۔ (القمر:۱۷)

اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بنادیا ہے؛ اب کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟۔

دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام و قوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس قسم کی آیتوں کو پوری طرح سمجھنے اوران سے احکام و مسائل مستنبط کرنے کے لیے علم تفسیر کا جاننا ضروری ہے، صرف عربی زبان کا سمجھنا اس کے لیے کافی نہیں ہے، صحابہ کرامؓ اہل عرب ہونے کے باوجود ایسی آیتوں کی تفسیر اللہ کے رسول ﷺ سے معلوم کیا کرتے تھے، اس کی تفصیلی مثالیں اس مقالہ میں آچکی ہیں؛ یہاں سمجھنے کے لیے ایک مثال پر اکتفا کیا جارہاہے، روزوں سے متعلق جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

"وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ"۔ (البقرۃ:۱۸۷)

اور کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ سفید اور سیاہ دھاگے میں تمہیں فرق معلوم ہونے لگے۔

اس آیت کو سننے کے بعد حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ (۶۷ھ) نے سفید اور سیاہ دھاگے اپنے تکئے کے نیچے رکھ لیے؛ تاکہ جب دونوں ایک دوسرے سے ممتاز ہونے لگیں تو اس سے وہ اپنے روزے کی ابتداء کرلیا کریں؛ اسی طرح اور ایک روایت میں حضرت سہل بن سعدؓ (۹۱ھ) کہتے ہیں: کچھ لوگ جنھوں نے روزے کی نیت کی ہوتی وہ اپنے دونوں پاؤں سے سفید اور سیاہ دھاگے باندھ رہتے اور برابر سحری کھاتے رہتے؛ یہاں تک کہ وہ دونوں دھاگے آپس میں ممتاز نہ ہوجائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو سمجھایا کہ یہاں سفید اور سیاہ دھاگے سے مراد دن کی سفیدی اور شب کی سیاہی ہے۔

(بخاری، بَاب قَوْلِ اللہِ تَعَالَى، وَكُلُوا وَاشْرَبُوا، حدیث نمبر:۱۷۸۳، شاملہ، موقع الاسلام)

الغرض! قرآن کریم کی تفسیر کرنے کے لیے علم تفسیر کا جاننا ضروری ہے، کسی بھی آیت کی تفسیر اپنی رائے سے کرنے والا غلطی پر ہے، خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا، قرآن کریم کی تفسیر سمجھنے کے لیے مستند تفاسیر کا مطالعہ کرنا چاہیے اور علماء سے استفادہ کرنا چاہیے، اس مضمون کے آخر میں مستند اردو تفاسیر کے نام ذکر کیے گئے ہیں، درج ذیل احادیث میں تفسیر قرآن کی باریکی کا اندازہ ہوتا ہے:

تفسیر بالرائے

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"۔

جو شخص قرآن میں بغیر علم کے گفتگو کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

[مسند أحمد:2069-2429، سنن الترمذي:2950، السنن الكبرى-النسائي:8030]

حضرت جندب سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ قَالَ فِي كِتَابِ اللَّهِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ.»

جو شخص قرآن کے معاملے میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح بات بھی کہہ دے تب بھی اس نے خطا (یعنی قصور، گناہ، جرم، غلطی) کی۔

[سنن أبي داود:3652، سنن الترمذي:2952، السنن الكبرى-النسائي:8032]

علامہ ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض غلو پسند لوگوں نے اس حدیث سے یہ مطلب سمجھا کہ قرآن کریم کے بارے میں کوئی بات فکر ورائے کی بنیاد پر کہنا جائز نہیں؛ یہاں تک کہ اجتہاد کے ذریعے قرآن کریم سے ایسے معانی بھی مستنبط نہیں کیے جاسکتے جو اصول شرعیہ کے مطابق ہوں؛ لیکن یہ خیال درست نہیں؛ کیونکہ خود قرآن کریم نے تدبر اور استنباط کو جابجا مستحسن قرار دیا ہے اور اگر فکر وتدبر پر بالکل پابندی لگادی جائے تو قرآن وسنت سے شرعی احکام وقونین مستنبط کرنے کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا؛ لہٰذا اس حدیث کا مطلب ہر قسم کی رائے پر پابندی لگانا نہیں ہے۔

(الاتقان:۲/۱۸)

چنانچہ اس بات پر جمہور علماء متفق ہیں کہ خود قرآن وسنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں اس حدیث کا منشاء یہ ہر گز نہیں ہے کہ معاملہ میں غور وفکر اور عقل ورائے کو بالکل استعمال نہیں کیا جاسکتا؛ بلکہ اس کا اصل منشاء یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے لیے جو اصول اجماعی طور پر مسلم اور طے شدہ ہیں ان کو نظر انداز کرکے جو تفسیر محض رائے کی بنیاد پر کی جائے وہ ناجائز ہوگی اور اگر اس طرح تفسیر کے معاملہ میں دخل دے کر کوئی شخص اتفاقاً کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ جائے تو وہ خطاکار ہے، اب

اصول تفسیر کو نظر انداز کرنے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں

مثلاً:

۱۔ جو شخص تفسیر قرآن کے بارے میں گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا وہ محض اپنی رائے کے بل بوتے پر تفسیر شروع کردے۔

۲۔کسی آیت کی کوئی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یاصحابہ وتابعین سے ثابت ہواور وہ اسے نظر انداز کرکے محض اپنی عقل سے کوئی معنی بیان کرنے لگے۔

۳۔جن آیات میں صحابہ کرام وتابعین سے کوئی صریح تفسیر منقول نہیں ان میں لغت اور زبان وادب کے اصولوں کو پامال کرکے کوئی تشریح بیان کرے۔

۴۔قرآن وسنت سے براہ راست احکام وقوانین مستنبط کرنے کے لیے اجتہاد کی اہلیت نہ رکھتا ہواور پھر بھی اجتہاد شروع کردے

۵۔قرآن کریم کے متشابہ آیات (جن کے بارے میں قرآن نے خود کہہ دیاہے کہ ان کی سو فیصد صحیح مراد سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا) ان کی جزم ووثوق کے ساتھ کوئی تفسیر بیان کرے اور اس پر مصر ہو۔

۶۔قرآن کریم کی ایسی تفسیر بیان کرے جس سے اسلام کے دوسرے اجماعی طور پر مسلم اور طے شدہ عقائد یااحکام مجروح ہوتے ہوں

۷۔تفسیر کے معاملہ میں جہاں عقل وفکر کا استعمال جائز ہے وہاں کسی قطعی دلیل کے بغیر اپنی ذاتی رائے کو یقینی طور پر درست اور دوسرے مجتہدین کی آراء کو یقینی طور سے باطل قرار دے۔

یہ تمام صورتیں اس تفسیر بالرائے کی ہیں جن سے مذکورہ بالا حدیث میں منع کیا گیاہے؛ چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ان تمام صورتوں کو اس مختصر جملے میں سمیٹ دیا گیاہے:

من قال في القرآن بغير علم فليتبوأ مقعده من النار۔

[مسند أحمد:2069-2429، سنن الترمذي:2950، السنن الكبرى-النسائي:8030]

جو شخص قرآن کریم کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

البتہ تفسیر کے اصولوں اور اسلام کے اجماعی طور پر طے شدہ ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے اگر تفسیر میں کسی ایسی رائے کا اظہار کیا جائے جو قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو تو وہ حدیث کی وعید میں داخل نہیں ہے؛البتہ اس قسم کا اظہار رائے بھی قرآن وسنت کے وسیع وعمیق علم اور اسلامی علوم میں مہارت کے بغیر ممکن نہیں اور علماء نے اس کے لیے بھی کچھ کار آمد اصول مقرر فرمائے ہیں جو اصول فقہ اور اصول تفسیر میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں اور ان کا ایک نہایت مفید خلاصہ علامہ بدرالدین زرکشی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "البرہان فی علوم القرآن کی نوع ۴۱ میں بالخصوص اقسام التفسیر کے زیر عنوان (صفحہ:۱۶۴۔۱۷۰) بیان فرمایاہے، یہ پوری بحث نہایت قابل قدر ہے؛لیکن چونکہ عربی زبان وعلوم کی مہارت کے بغیر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا، اس لیے اس کا ترجمہ یہاں نقل کرنا بے فائدہ ہے جو عربی داں حضرات چاہیں وہاں ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

ناسخ اور منسوخ

"نسخ" کے لغوی معنی ہیں مٹانا، ازالہ کرنا، اور اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے:

رَفْعُ الْحُكْمِ الشَّرْعِيِّ بِدَلِيْلٍ شَرْعِيٍّ "کسی حکم شرعی کو کسی شرعی دلیل سے ختم کردینا"

(مناہل العرفان: ماھو النسخ ۲/ ۱۷۶)

مطلب یہ ہے کہ بعض مرتبہ اللہ تعالی کسی زمانے کے حالات کے مناسب ایک شرعی حکم نافذ فرماتا ہے پھر کسی دوسرے زمانے میں اپنی حکمت بالغہ کے پیش نظر اس حکم کو ختم کرکے اس جگہ کوئی نیا حکم عطافرمادیتاہے اس عمل کو نسخ کہا جاتا ہے اور اس طرح جو پرانا حکم ختم کیا جاتا ہے اس کو منسوخ اور جو نیا حکم آتا ہے اسے ناسخ کہتے ہیں۔

نسخ کا مطلب رائے کی تبدیلی نہیں ہوتا بلکہ ہر زمانے میں اس دور کے مناسب احکام دینا ہوتا ہے، ناسخ کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ منسوخ کو غلط قرار دے؛ بلکہ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے حکم کی مدت نفاذ متعین کردے اور یہ بتادے کہ پہلا حکم جتنے زمانے تک نافذ رہا اس زمانے کے لحاظ تو وہی مناسب تھا لیکن اب حالات کی تبدیلی کی بناپر ایک نئے حکم کی ضرورت ہے، جو شخص بھی سلامتِ فکر کے ساتھ غور کرے گا وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ تبدیلی حکمت الہیہ کے عین مطابق ہے، حکیم وہ نہیں جو ہر قسم کے حالات میں ایک ہی نسخہ پلاتا رہے بلکہ حکیم وہ ہے جو مریض اور مرض کے بدلتے ہوئے حالات پر بالغ نظری کے ساتھ غور کرکے نسخہ میں ان کے مطابق تبدیلیاں کرتا رہے۔

منسوخ آیات قرآنی

متقدمین کی اصطلاح میں نسخ کا مفہوم بہت وسیع تھا، اسی لیے انھوں نے منسوخ آیات کی تعداد بہت زیادہ بتائی ہے لیکن علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے متأخرین کی اصطلاح کے مطابق لکھاہے کہ پورے قرآن میں کل انیس آیتیں منسوخ ہیں۔

(الاتقان، علامہ سیوطی: ۲۲، ۲)

پھر آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے ان انیس آیتوں پر مفصل تبصرہ کر کے صرف پانچ آیتوں میں نسخ تسلیم کیا ہے اور باقی آیات میں ان تفسیروں کو ترجیح دی ہے جن کے مطابق انھیں منسوخ ماننا نہیں پڑتا ان میں سے اکثر آیتوں کے بارے میں شاہ صاحب کی توجیہات نہایت معقول اور قابل قبول ہیں لیکن بعض توجیہات سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے، جن پانچ آیات کو انھوں نے منسوخ تسلیم کیا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالأقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوفِ حَقّاً عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔

(البقرۃ:۱۸۰)

جب تم میں سے کسی کے سامنے موت حاضر ہو جائے اگر وہ مال چھوڑ رہا ہو تو اس پر والدین اور اقرباء کے لیے وصیت بالمعروف کرنا فرض قرار دیدیا گیا ہے، یہ حکم متقیوں پر لازم ہے۔

یہ آیت اس زمانے میں لازم تھی جب میراث کے احکام نہیں آئے تھے اور اس میں ہر شخص کے ذمے یہ فرض قرار دیا گیا تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے ترکہ کے بارے میں وصیت کر کے جائے کہ اس کے والدین یا دوسرے رشتہ دار کو کتنا کتنا مال تقسیم کیا جائے؟ بعد میں آیات میراث یعنی یوصیکم اللہ فی اولادکم، الخ (النساء:۱۱) نے اس کو منسوخ کر دیا اور اللہ تعالی نے تمام رشتہ داروں میں ترکے کی تقسیم کا ایک ضابطہ خود متعین کر دیا اب کسی شخص پر مرنے سے پہلے وصیت کرنا فرض نہیں رہا۔

سورۂ انفال میں ارشاد ہے:

إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُواْ مِئَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّئَةٌ يَغْلِبُواْ أَلْفاً مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لاَّ يَفْقَهُونَ۔

(الأنفال:۶۵)

اگر تم میں سے بیس آدمی استقامت رکھنے والے ہونگے تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں سے سو آدمی ہوں گے تو ایک ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے کیونکہ یہ کافر ایسے لوگ ہیں جو صحیح سمجھ نہیں رکھتے۔

یہ آیت اگرچہ بظاہر ایک خبر ہے لیکن معنی کے لحاظ سے ایک حکم ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو اپنے سے دس گنا زائد دشمن کے مقابلہ سے بھاگنا جائز نہیں یہ حکم اگلی آیت کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا:

اَلآنَ خَفَّفَ اللّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفاً فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّئَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُواْ مِئَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُواْ أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللّهِ وَاللّهُ مَعَ الصَّابِرِيْنَ۔ (الأنفال:۶۶)

اب اللہ نے تم سے (اپنے حکم کا بوجھ) ہلکا کر دیا اسے معلوم ہے کہ تم میں (کسی قدر) کمزوری ہے سو (اب تخفیف کے بعد حکم یہ ہے کہ) اگر تم میں سے (ایک) سو (آدمی) ثابت قدم رہنے والے ہوں (تو) وہ دو سو (کفار) پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے (ایک) ہزار ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار (کافروں) پر غالب آئیں گے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (یہ مومنوں کے لئے ہدف ہے کہ میدانِ جہاد میں ان کے جذبۂ ایمانی کا اثر کم سے کم یہ ہونا چاہیئے)

اس آیت نہ پہلی آیت کے حکم میں تبدیلی پیدا کر دی اور دس گنے دشمن کے بجائے دوگنے کی حد مقرر کر دی کہ اس حد تک راہ فرار اختیار کرنا جائز نہیں

تیسری آیت جسے حضرت شاہ صاحب نے منسوخ قرار دیا ہے سورۂ احزاب کی یہ آیت ہے:

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ﴿۵۲﴾ (الاحزاب:۵۲)

اس کے بعد (کہ انہوں نے دنیوی منفعتوں پر آپ کی رضا و خدمت کو ترجیح دے دی ہے) آپ کے لئے بھی اور عورتیں (نکاح میں لینا) حلال نہیں (تاکہ یہی اَزواج اپنے شرف میں ممتاز رہیں) اور یہ بھی جائز نہیں کہ (بعض کی طلاق کی صورت میں اس عدد کو ہمارا حکم سمجھ کر برقرار رکھنے کے لئے) آپ ان کے بدلے دیگر اَزواج (عقد میں) لے لیں اگرچہ آپ کو ان کا حُسنِ (سیرت و اخلاق اور اشاعتِ دین کا سلیقہ) کتنا ہی عمدہ لگے مگر جو کنیز (ہمارے حکم سے) آپ کی مِلک میں ہو (جائز ہے)، اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید نکاح کرنے سے منع فرمادیا گیا تھا بعد میں یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اور اس کی ناسخ آیت وہ ہے جو قرآن کریم کی موجودہ ترتیب میں مذکور بالا آیت سے پہلے مذکور ہے یعنی:

"يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۫ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْۤ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۰﴾ (الاحزاب:۵۰)

اے نبی! بیشک ہم نے آپ کے لئے آپ کی وہ بیویاں حلال فرمادی ہیں جن کا مہَر آپ نے ادا فرما دیا ہے اور جو (احکامِ الٰہی کے مطابق) آپ کی مملوک ہیں، جو اللہ نے آپ کو مالِ غنیمت میں عطا فرمائی ہیں، اور آپ کے چچا کی بیٹیاں، اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں، اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں، اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں، جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے اور کوئی بھی مؤمنہ عورت بشرطیکہ وہ اپنے آپ کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح)

کے لئے دے دے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی) اسے اپنے نکاح میں لینے کا ارادہ فرمائیں (تو یہ سب آپ کے لئے حلال ہیں)، (یہ حکم) صرف آپ کے لئے خاص ہے (امّت کے) مومنوں کے لئے نہیں، واقعی ہمیں معلوم ہے جو کچھ ہم نے اُن (مسلمانوں) پر اُن کی بیویوں اور ان کی مملوکہ باندیوں کے بارے میں فرض کیا ہے، (مگر آپ کے حق میں تعدّدِ ازواج کی حِلّت کا خصوصی حکم اِس لئے ہے) تاکہ آپ پر (امت میں تعلیم و تربیتِ نسواں کے وسیع انتظام میں) کوئی تنگی نہ رہے، اور اللہ بڑا بخشنے والا بڑا رحم فرمانے والا ہے

حضرت شاہ صاحب وغیرہ کا کہنا ہے کہ اس کے ذریعہ سابقہ ممانعت منسوخ ہوگئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں نسخ یقینی نہیں ہے' بلکہ اس کی وہ تفسیر بھی بڑی حد تک بے تکلف اور سادہ ہے جو حافظ ابن جریر نے اختیار کی ہے یعنی یہ کہ یہ دونوں آیتیں اپنی موجودہ ترتیب کے مطابق ہی نازل ہوئی ہیں:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ۔ (الاحزاب:۵۰)

والی آیت میں اللہ تعالی نے کچھ مخصوص عورتوں کا ذکر فرمایا ہے کہ ان کے ساتھ نکاح آپ کے لیے حلال ہے پھر اگلی آیت لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ (احزاب:) میں ارشاد فرمایا ہے کہ ان کے علاوہ دوسری عورتیں آپ کے لیے حلال نہیں۔

(تفسیر ابن جریر)

(۴) چوتھی آیت جو حضرت شاہ صاحب کے نزدیک منسوخ ہے، سورۂ مجادلہ کی یہ آیت:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً ذَلِكَ خَيْرٌ لَكُمْ وَأَطْهَرُ فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ (المجادلہ:۱۲)

اے ایمان والو جب تم کو رسول سے سرگوشی کرنی ہو تو سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ کر دیا کرو یہ تمہارے لیے باعث خیر و طہارت ہے پھر اگر تمہارے پاس (صدقہ کرنے کے لیے) کچھ نہ ہو تو اللہ تعالی بخشنے والا اور مہربان ہے، یہ آیت اگلی آیت سے منسوخ ہوگئی۔

أَأَشْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَاتٍ فَإِذْ لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ۔ (المجادلہ:۱۳)

کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ تم اپنی سرگوشی سے پہلے صدقات پیش کرو پس جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تمہاری توبہ قبول کرلی (اب) نماز قائم رکھو اور زکوۃ ادا کرتے رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو" اس طرح سرگوشی سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم منسوخ قرار دیا گیا۔

پانچویں آیت سورۂ مزمل کی مندرجہ ذیل آیات ہے:

(۱)يَاأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ

(۲)قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلاً

(۳)نِصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلاً

اے مزمل (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں) رات کو (تہجد میں) کھڑے رہیے مگر تھوڑا سا حصہ آدھی رات یا اس میں سے بھی کچھ کم کر دیجیے "اس آیت میں رات کے کم از کم آدھے حصہ میں تہجد کی نماز کا حکم دیا گیا تھا، بعد میں اگلی آیتوں نے اس میں آسانی پیدا کر کے سابقہ حکم منسوخ کر دیا وہ آیتیں یہ ہیں:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾ (المزمل:۲۰)"

بے شک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ (کبھی) دو تہائی شب کے قریب اور (کبھی) نصف شب اور (کبھی) ایک تہائی شب (نماز میں) قیام کرتے ہیں، اور اُن لوگوں کی ایک جماعت (بھی) جو آپ کے ساتھ ہیں (قیام میں شریک ہوتی ہے)، اور اللہ ہی رات اور دن (کے گھٹنے اور بڑھنے) کا صحیح اندازہ رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ تم ہرگز اُس کے اِحاطہ کی طاقت نہیں رکھتے، سو اُس نے تم پر (مشقت میں تخفیف کر کے) معافی دے دی، پس جتنا آسانی سے ہو سکے قرآن پڑھ لیا کرو، وہ جانتا ہے کہ تم میں سے (بعض لوگ) بیمار ہوں گے اور (بعض) دوسرے لوگ زمین میں سفر کریں گے تاکہ اللہ کا فضل تلاش کریں اور (بعض) دیگر اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے، سو جتنا آسانی سے ہو سکے اُتنا (ہی) پڑھ لیا کرو، اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرضِ حسن دیا کرو، اور جو بھلائی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے حضور بہتر اور اَجر میں بزرگ تر پالو گے، اور اللہ سے بخشش طلب کرتے رہو، اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ تہجد کا حکم واجب تو پہلے بھی نہیں تھا؛ لیکن پہلے اس میں زیادہ تاکید بھی اور اس وقت بھی زیادہ وسیع تھا بعد میں تاکید بھی کم ہو گئی اور وقت کی اتنی پابندی بھی نہ رہی۔

یہ ہیں وہ پانچ آیتیں جن میں حضرت شاہ صاحب کے قول کے مطابق نسخ ہوا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ یہ پانچ مثالیں صرف اس صورت کی ہیں جس میں ناسخ اور منسوخ دونوں قرآن کریم کے اندر موجود ہیں اس کے علاوہ ایسی مثالیں قرآن کریم میں باتفاق بہت سی ہیں جن میں ناسخ تو قرآن کریم میں موجود ہے لیکن منسوخ موجود نہیں ہے مثلاً تحویل قبلہ کی آیات وغیرہ۔

(علوم القرآن:۱۷۲)

گمراہ فرقوں کو پہچاننے کا اصول

جتنے بھی گمراہ لوگوں نے اسلام میں نکالے ہیں ان سب گمراہوں میں ایک بات قدر مشترک کے طور پر آپکو ملے گی، وہ یہ کہتے ہیں کہ:

ہم براہِ راست خدا کی کتاب کو سمجھیں گے اور رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی احادیث وسنت کو اور ہمارے لئے صحابہ کرام کی سمجھ کوئی حجت ودلیل نہیں ہے۔ جس طرح کتاب وسنت ان کے سامنے تھی ویسے ہی ہمارے سامنے ہے، ہم ذاتی (رائے کے) طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔(یعنی اپنی رائے کو اسلام کہیں گے)۔ جیسے: حضرت علی کو نعوذ باللہ کافر قرار دینے والے خارجی قرآن سے دلیل دیتے۔

سابقہ تمام تفصیل سے یہ ثابت ہوا کہ تفسیر قرآن مجید کے لیے کچھ ضروری علوم ہوتے ہیں جن کے بغیر تفسیر کرنا ایسا ہے جیسے بغیر آلات کے صناعی کرنا، کہ جیسے کوئی بھی فن بغیر آلاتِ ضروریہ کے نہیں آتا ایسے ہی ہر علم کا بھی یہی مسئلہ ہے؛ چنانچہ مفسرین اور اہل علم نے ضروری علوم کی تفصیل یوں بتلائی ہے: علم لغت، صرف ونحو، معانی، بیان، بدیع، عربی ادب، علم کلام، منطق، حکمت وفلسفہ، علم عقائد، علم تفسیر، پھر اس میں درجات اہل علم کے ہاں مانے گئے ہیں، چنانچہ ابتدائی لغت وصرف نحو ادب یہ عربی زبان سیکھنے اور اس کی باریکیوں کو جاننے کے لیے ہیں؛ کیونکہ قرآن مجید عربی زبان میں نازل کیا گیا نیز معانی بیان وبدیع وغیرہ اس کی رعنایوں کو سمجھنے کے لیے اور منطق، حکمت وفلسفہ وکلام، دوسری زبانوں سے مستعار علوم کے ذریعہ جو گمراہیاں آسکتی ہیں اس کے دفع کے لیے، پھر علم تفسیر کے اندر بھی کئی تفصیلات بتلائی گئی ہے؛ مثلاً وحی اور اس کی ضرورت کو سمجھنا پھر وحی کی اقسام مثلاً، وحی قلبی، وحی ملکی، پھر وحی کی مختلف شکلیں جیسے صلصلۃ الجرس اور فرشتے کا انسانی شکل میں آنا، رویائے صادقہ، نفث فی الروع، پھر وحی متلو وغیر متلو، پھر قرآن کریم کے نزول کے متعلق تفصیلات اور سورتوں کی تدوین مکی ومدنی ہونے کے اعتبار سے نیز بعض مدنی سورتوں میں مکی آیتیں اور بعض مکی سورتوں میں مدنی آیتیں کونسی ہیں اسکا استقصاء پھر قرآن کریم سات حروف پر نازل ہونے کا کیا مطلب ہے؛ پھر ناسخ ومنسوخ آیتوں کی تفصیلات، سبعہ احرف سے کیا مراد ہے اور حفاظت قرآن اور جمع قرآن کی تفصیلات پھر اس کے اندر دیئے ہوئے علامات وقف کی تفصیلات اور اسی میں پاروں کی تقسیم اور اس کے اعراب وحرکات سے متعلق تفصیلات پھر قرآن کریم میں جو مضامین ذکر کئے گئے ہیں، مثلاً عقائد، واقعات اور ایام اللہ وانعم اللہ، پھر

آیات مقطعات و متشابہات و محکمات وغیرہ کی تفصیلات، بہر حال یہ توچند ضروری علوم کی طرف اشارہ کیا گیاہے، ان کی تفصیل میں جائیں تو بہت وقت لگ جائے۔

مخالفت سلف سے اجتناب

تفسیر قرآن کا ایک بنیادی اصول

قرآن کریم کی تفسیر میں ایسے نظریہ کا اختراع کرنے سے آدمی کو کچھ حیا کرنی چاہئے جس سے سلف کے اصول و نظریات سے مزاحمت لازم آتی ہے' اس لئے صرف وہی تفسیر لائقِ اعتماد ہوگی جو صحابہ کرام' تابعین اور ائمہ ٔامت کے ذوق کے ہم آہنگ ہوگی۔
خلیفہ ٔراشد حضرت عمر بن عبد العزیز کا یہ زریں قول کتنا وزنی ہے؟ وہ فرماتے تھے (خطاب اہل علم سے تھا)

"خذوا من الرأي ما يصدق من كان قبلكم ولا تأخذوا الخلاف لهم فانهم اخير منكم واعلم..."۔(تاریخ الخلفاء للسیوطی)

ترجمہ:..."صرف وہی (نظریہ) اور رائے اختیار کرو جو تم سے پہلے لوگوں (یعنی صحابہ کرام اور اکابر تابعین) کی تصدیق کرے' ایسی رائے نہ لو جو ان کے خلاف ہو' اس لئے کہ وہ تم سے بہتر بھی تھے اور زیادہ علم والے بھی"۔
بلاشبہ اپنے سے پہلے لوگوں کے متعلق "هم اخير واعلم" کا نظریہ جب تک قائم رہے گا' امت میں خیر باقی رہے گی' کیوں نہ ہو' جن کے سامنے وحی نازل ہوتی رہی' جن کو اول وحی کی کیفیات واحوال کے مشاہدہ کے مواقع نصیب ہوئے' قرآن کی کونسی آیت: کس وقت' کس جگہ نازل ہوئی اور کب نازل ہوئی' کس کے حق میں نازل ہوئی' سفر میں نازل ہوئی یا حضر میں' حجرۂ عائشہ میں نازل ہوئی یا تبوک سے واپسی پر۔ الغرض اسی قسم کے جزئیاتی امور ایک ایک کرکے جن کے حافظہ میں نقش تھے' قرآن کے ایک ایک حرف پر جن کو صاحبِ قرآن اکی نگرانی میں عملی مشق کی سعادت میسر آئی' پھر جن کے علم و تقویٰ' فضل وکمال' زہد وورع اور فہم وذکاء کی قرآن ہی نے شہادت دی' جن کی جان بازی اور سرفروشی' ایثار اور قربانی کی نظیر پیش کرنے سے اولین وآخرین عاجز رہے' جن کی عفت وپارسائی' توکل اور قناعت جبرئیل ومیکائیل کے لئے باعثِ رشک بنی رہی' اگر ان کی اور ان کے تربیت یافتہ شاگردوں کی تفسیر پر اعتماد نہ ہوگا تو ان کے بعد اللہ کی کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے کا سلیقہ کس کو نصیب ہوسکتا ہے؟

فقیہ الامت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے

"والذی لا الٰہ غیرہ ما نزلت آیۃ من کتاب اللہ الا وانا اعلم فیمن نزلت، واین نزلت، ولو اعلم احداً اعلم بکتاب اللہ منی تنالہ المطایا لاتیتہ"۔ (ابن کثیر: ج:۱، ص:۵)

ترجمہ:... "معبودِ حقیقی کی قسم، کتاب اللہ کی جو آیت بھی نازل ہوئی، مجھے اس کے متعلق علم ہے کہ کس کے حق میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی اور اگر میری دانست میں کتاب اللہ کا مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی موجود ہوتا اور وہاں تک سواری جاسکتی تو میں ضرور اس کی خدمت میں حاضر ہوتا"۔
اسی قسم کا مضمون حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی منقول ہے: الغرض تفسیرِ قرآن کے سلسلہ میں ان ہی دو قاعدوں کو جو حضرت ابو بکر صدیق کے "طرز عمل" سے میں نقل کرچکا ہوں، اگر سامنے رکھا جائے تو کجرائی کا راستہ بڑی حد تک بند ہوسکتا ہے۔

تفسیر کا اصل سرمایہ صحابہ اور تابعین کے آثار ہیں

یہاں ایک اور نکتہ پر تنبیہ ضروری ہے، وہ یہ کہ یوں تو کتاب اللہ کے اسرار کا سلسلہ غیر متناہی ہے، ایک عامی سے لے کر ایک اعلیٰ درجہ کے مفکر، فلسفی، ادیب اور عالم تک سب ہی اس میں غور کرتے رہے ہیں اور کررہے ہیں اور کرتے چلے جائیں گے اور ہر ایک اپنی اپنی استعداد اور فراخ دامنی کے بقدر اس خزانۂ عامرہ سے استفادہ کرتا رہے گا، لیکن جہاں تک اس کے نفسِ مفہوم کا تعلق ہے اور اس کی وضاحت جہاں تک انسانی وسعت کے دائرہ میں آسکتی ہے، اس سے صحابہ کرام اور ثقات تابعین کے علوم نے بعد میں آنے والے تمام انسانوں کو مستغنی کردیا ہے، اس لئے قرآن کی شرح و تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام اور ان کے تربیت یافتہ شاگردوں کے آثار جو صحیح اور مقبول اسناد کے ساتھ مروی ہیں، اصل سرمایہ ہیں۔ کوئی آیت ایسی نہیں جسے ان حضرات نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا کے موافق نہ سمجھا دیا ہو، قرآن سے متعلقہ اشکالات میں سے کوئی دشواری ایسی نہیں جسے ان "نفوس قدسیہ" نے جزئیاتی یا کلیاتی انداز میں حل نہ کردیا ہو اور قرآن سے پیدا ہونے والے علوم کی طرف اشارہ نہ کردیا ہو۔
الغرض جس طرح قرآن کے الفاظ ان حضرات نے امت کو بلاکم وکاست پہنچادیئے ہیں، ان میں نہ ان حضرات نے بخل سے کام لیا، نہ ہوا وہوس کی آمیزش ہونے دی، نہ اوہام وظنون کی تاریکی میں ان کو گم کیا، بلاشبہ اسی طرح قرآن کے مفاہیم اور معانی کی امانت بھی انہوں نے کامل طور پر امت کے سپرد کردی۔ اس "جنون" کی کوئی گنجائش نہیں کہ الفاظِ قرآن میں ان کو قابل اعتماد قرار دیا جائے، مگر الفاظ کی شرح و تفسیر میں ان کی امانت کو مشتبہ بنا ڈالنے پر مغربی فوج (مستشرقین) کا تمام اسلحہ استعمال کیا جائے۔

بہر حال صحابہ کرام اور اکابر تابعین سے جو تفسیری سرمایہ منقول ہے، وہ قرآن فہمی کے لئے قطعاً کافی ہے، بعد میں آنے والوں کا کام اس قیمتی سرمایہ کی حفاظت اور اس کی پرورش کرنا تو ہوسکتا ہے، لیکن باپ دادا کے محنت کے ساتھ جمع کئے ہوئے سرمایہ کو گلی کوچہ میں پھینک کر خود قلاش اور مفلس ہوجانا اور جن خزانوں میں آباء واجداد کے جواہر ریزے بھرے ہوئے تھے، ان میں خزف ریزوں کو بھرلینا، قرآنی خدمت نہیں بلکہ حماقت ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے جن "صدیقی اصولِ تفسیر" کو ذکر کرتا چلا آرہا ہوں، اسی سلسلہ کی یہ روایت خاص اہمیت کی حامل ہے یعنی حضرت ابو بکر صدیق نے ایک دفعہ حاضرین سے دریافت فرمایا کہ قرآن کی ان دو آیتوں کا کیا مطلب سمجھے ہو؟

۱-"ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا"۔

۲-"الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم"۔

مطلب یہ کہ پہلی آیت میں استقاموا کے معنی اور دوسری آیت میں ظلم کا مفہوم حضرت ابو بکر صدیق نے حاضرین سے دریافت کرنا چاہا۔

جواب میں ان کی طرف سے عرض کیا گیا: "ثم استقاموا ای فلم یذنبوا، ولم یلبسوا ایمانھم ای بخطیئۃ" یعنی ثم استقاموا کے معنی یہ کہ "پھر گناہ نہ کیا" اور ظلم سے مراد بھی "گناہ" ہے۔ آیت کے ظاہری الفاظ سے یہی معنی مفہوم ہوتے ہیں جو انہوں نے بیان کر دیئے، لیکن قرآن ہی میں دوسری آیتیں ایسی بھی ہیں جن کو سامنے رکھنے کے بعد یہ معنی درست نہیں رہتے، بہر حال ان کی اس تفسیر کے سن لینے کے بعد خود حضرت ابو بکر نے ان دونوں آیتوں کی تفسیر فرمائی، حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا:

"لَقَدْ حَمَلْتُمُوهَا عَلَى غَيْرِ الْمَحْمَلِ، ثُمَّ قَالَ: قَالُوا: رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَمْ يَلْتَفِتُوا إِلَى إِلَهٍ غَيْرِهِ، وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِشِرْكٍ"۔

[حلیۃ الأولیاء لأبي نعیم » أَبُو بَكْرٍ الصِّدِّيقُ... رقم الحدیث:62, جامع البیان عن تأویل آي القرآن » تفسیر سُورَةُ فُصِّلَتْ... رقم الحدیث:28157, الجامع لأحکام القرآن (قرطبي) » سورۃ فصلت :30]

ترجمہ:... "تم نے دونوں آیتوں کو غیر محمل پر حمل کر دیا (ان دونوں آیتوں کے یہ معنی نہیں) بلکہ ثم استقاموا کے معنی تو یہ ہیں کہ پھر اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کی طرف مائل نہ ہوئے اور ظلم سے مراد شرک ہے"

اس مقام پر قابل توجہ امر یہی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق نے کس بنیاد پر ان حضرات کی تفسیر کو "بے محل" قرار دیا؟ اور ان حضرات کی تفسیر میں کیا گنجلک پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے ان کی تفسیر غیر صحیح قرار پائی؟ روایت کے الفاظ میں چونکہ اس سوال سے تعرض نہیں، اس لئے قرائنِ خارجیہ کی طرف رجوع کرنے کے بعد ہی ان کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

امام بخاری نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کی روایت جو

"ولم یلبسوا ایمانھم بظلم"

کے جواب میں نقل کی ہے، اس سے یہ اشکال رفع ہو جاتا ہے یعنی یہ آیت جب نازل ہوئی تو اصحابِ رسول اللہ نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ ﷺ! اس آیت میں امن اور اہتداء کو ایمان اور ترکِ ظلم پر معلق کیا گیا ہے، اور ہم میں ایسا کون ہے جس نے ظلم بمعنی کوئی گناہ نہ کیا ہو؟ اس پر آیت

"ان الشرك لظلم عظیم"

نازل ہوئی، جس کا حاصل یہ ہوا کہ ظلم سے مراد آیت زیر بحث میں شرک ہے، مطلق گناہ مراد نہیں۔ بلکہ مسند احمد کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کی عام بے چینی جو اس آیت سے ان کو لاحق ہوئی تھی، اسے سن کر فرمایا:

"انه لیس الذی تعنون، الم تسمعوا ما قال العبد الصالح "یابنیّ ان الشرك لظلم عظیم" انما هو الشرك"۔

(ابن کثیر: ج:۲، ص:۱۵۳)

یعنی: اس کا یہ مفہوم نہیں جو تم مراد لے رہے ہو، کیا تم نے عبد صالح (لقمان علیہ السلام) کا قول نہیں سنا کہ بیٹا! واقعۃً شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے، پس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے۔

اس روایت سے واضح ہوا کہ یہ آیت جس کے متعلق حضرت ابو بکر صدیق اپنی عام روش کے خلاف لوگوں کو چھیڑ چھیڑ کر ان کے علم کی تصحیح فرمارہے تھے، اس کی تفسیر خود قرآن ہی میں دوسری جگہ کی جاچکی ہے اور آنحضرت ﷺ، صحابہ کرام کے استفسار پر اس آیت کا حوالہ بھی دے چکے ہیں، جس میں اس آیت کی تفسیر قرآن میں کی گئی ہے (یعنی ان الشرک لظلم عظیم) اس لئے اس سوال کے جواب میں جو اوپر عرض کر چکا ہوں، کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق کی طرف سے ان حضرات کی تفسیر کے غیر صحیح قرار دیئے جانے کی بنیاد یہی آیت ہے جس کا حوالہ خود آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام کے سامنے پیش فرمایا، اور یہیں سے دوسرے سوال کا جواب بھی نکل آیا کہ ان بزرگوں کی تفسیر میں جس کو حضرت ابو بکر صدیق نے "بے محل" قرار دیا، بنیادی نقص یہی تھا کہ ان حضرات نے صرف اسی مقام کو سامنے رکھ کر تفسیر فرمادی، دوسرے مقام پر ان کی نظر نہیں گئی، جہاں اس اجمال کو مفصل کر دیا گیا تھا۔

بہر حال! اگر اس صدیقیؓ روایت کا مطلب یہی ہے جو میں نے عرض کیا، (یہ خدا ہی جانتا ہے کہ میں اس روایت کے سمجھنے اور سمجھی ہوئی بات کے صحیح ادا کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں یا حضرات اہل علم سے توقع ہے کہ وہ تصحیح فرمادیں) تو اس میں جس اصول کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، اس پر ہمیں غور کرنا چاہئے۔ آپ مجھ ہی سے سن چکے ہیں کہ کتاب اللہ کے معاملہ میں "صدیقی ذوق" احتیاطی دقائق رکھتا تھا، وہ لوگوں کے بار بار سوال کرنے پر بھی تفسیرِ کتاب اللہ پر حرف زنی کے لئے حتی الوسع تیار نہ ہوتے تھے، لیکن یہاں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق از خود لوگوں سے سوال کرتے ہیں، پھر ان کے علم کی تصحیح فرماتے ہیں اور اپنے علم کو پیش فرماتے ہیں، کہنے کو تو یہ ایک جزئی واقعہ ہے جو شاید اپنی جزئیت ہی کی وجہ سے لوگوں کے نزدیک زیادہ توجہ کا مستحق نہ ہو، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ ہر جزئیہ کسی کلیہ کے تحت مندرج ہوتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس تفسیری اصلاح کو جزئیہ تک ہی محدود مانا جائے اور صدیقی نظر کو اس جزئیہ سے کلیہ کی طرف متعدی نہ مانا جائے۔

تاویل

قرآن مجید میں تفسیر کے لئے لفظ "تاویل" بھی استعمال ہوا ہے۔ علماء سلف اس لفظ کا استعمال بکثرت کرتے۔ مگر بعد کے علماء میں یہ بحث چھڑ گئی کہ آیا یہ دونوں الفاظ ہم معنی ہیں یا ان میں کچھ فرق ہے؟

لغت میں

لغوی طور پر تاویل "اَوْلَ" سے نکلا ہے جس کے معنی ایسی حقیقت کی طرف رجوع کرنا، واپس لانا یا لوٹانا کے ہیں جس کی طرف کلام اشارہ کر رہا ہو۔ جیسے:

{وما یعلم تأویله إلا الله}۔

اصطلاح میں

کسی کلام کی تشریح و توضیح کرنا تأویل ہے۔ تأویل الکلام سے مراد: تعبیر، بیان، عمل، ثبوت، انجام اور تحقیق وغیرہ ہیں۔ اسی معنی میں یہ آیت ہے:

{هَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلاَّ تَأْوِيلَهُ...} (الأعراف:۵۳)

وہ اس کی حقیقت کا انتظار کر رہے ہیں۔

اور یہ دعا بھی:

اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ تَأْوِيْلَ الْكِتَابِ۔

اے اللہ! اسے کتاب کی تاویل یعنی مراد، بیان یا وضاحت سکھا دے۔

امام ابن عیینہؒ فرماتے ہیں:

اَلسُّنَّةُ هِيَ تَأْوِيْلُ الأَمْرِ وَالنَّهْيِ أَيْ عَمَلَهُ وَالْقِيَامَ بِهِ فِي الْحَقِيْقَةِ۔

سنت در حقیقت امر و نہی پر عمل کرنے اور اسے قائم کرنے کا نام ہے۔

علماء کی اکثریت کا کہنا ہے کہ تاویل اور تفسیر دونوں ہم معنی ہیں۔ جن میں ابو عبید، مجاہد اور ابن جریر الطبری بھی شامل ہیں۔ ابن جریر نے تو اپنی تفسیر کا نام بھی)جامِعُ البَیَانِ فِی تَأوِیْلِ آیِ الْقُرآنِ (رکھا ہے۔ اس لئے وہ ہر آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہی کہتے ہیں :اخْتَلَفَ أَهْلُ التَّأوِيْلِ یا اَلْقَوْلُ فِی تَأوِیْلِ الآیَۃِ۔ ایک اور رائے ہے: کہ تاویل کا لفظ کئی لحاظ سے تفسیر سے بالکل ہی مختلف معنی رکھتا ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ کے نزدیک تفسیر سے مراد کلام الٰہی اور کلام انسانی دونوں کی تشریح کرنا ہے جبکہ تاویل صرف کتب الٰہیہ کی تشریح کا نام ہے۔ امام منصورؒ کہتے ہیں: تفسیر، قرآن کی مراد کو قطعی طور پر متعین کرنے کا نام ہے جبکہ تاویل الفاظ قرآن کے زیر احتمال معانی میں سے کسی ایک کو غیر یقینی طور پر معین کرنے کا نام ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کچھ مفسرین ان دونوں الفاظ کا فرق نہ جان سکے۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ تفسیر کا تعلق نص اور اس سے ماخوذ مفہوم سے ہے جبکہ تاویل نص کی گہرائی میں اترنے کا نام ہے۔ یا پھر لفظ قرآن کے مختلف محتمل معانی کی وضاحت کو کہتے ہیں۔ بعض نے تفسیر اسے کہا جو بذریعہ روایت ہو اور تاویل وہ جو بذریعہ درایت ہو۔

ان تمام آراء میں سب سے بہتر رائے امام ابو عبیدؒ کی ہے کیونکہ قرآن وسنت میں تفسیر کی جگہ تاویل کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً: ارشاد باری ہے } :۔۔۔وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهُ إِلاَّ اللّٰهُ۔۔۔ { (ال عمران:۷) اور دعائے رسول بھی ہم پڑھ آئے ہیں :اللھم عَلِّمْهُ تَأْوِيْلَ الْكِتَابِ۔ فقہ وعقائد کے صحیح احکام تک رسائی کا نام بھی تاویل ہے تاکہ عام مسلمان کو ان احکام کی تمام حدود وقیود کا علم ہو سکے۔ رسائی اگر برعکس ہو تو نتیجہ غلط ہو سکتا ہے جسے تاویل فاسد کہا جاتا ہے جیسے }وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا { (النساء:۱۲۵) میں خلیل سے مراد فقیر لینا اور اصلی معنی نامناسب کہنا، تاویل فاسد ہے۔

نوٹ: تاویل کا علم ایک بیش بہا علم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو تاویل الأحادیث کا علم عطا کیا تھا۔ ابن عباسؓ کے لئے حضور ﷺ نے دعا فرمائی کہ قرآن مجید کی تفسیر وتاویل کا علم انہیں عطا ہو۔ آپ ﷺ کی اسی دعا کا نتیجہ ہے کہ ابن عباسؓ کے تفسیری اقوال میں قرآنی الفاظ کی وضاحت ومعانی کا تعین بہت سادہ اور عام فہم انداز میں کیا گیا ہے۔ تفسیر میں جزی طور پر مراد الٰہی تک نہیں پہنچا جا سکتا، الا یہ کہ صحیح روایت میں رسول اللہ ﷺ سے اس کی تفسیر منقول ہو یا صحابہ کرام سے جو نزول وحی کے وقت موجود تھے اور انہوں نے حوادث وواقعات کا مکمل احاطہ کیا ہو یا اشکال کے وقت انہوں نے آپ ﷺ کی طرف اس کے مفہوم کے لئے رجوع کیا ہو۔ قرآن کا لفظ یا عبارت ایک سے زائد مفہوم کے اگر متحمل ہوں تو پھر ان کی تفسیر یا تاویل انتہائی احتیاط اور ٹھوس دلائل کی محتاج ہے۔ بصورت دیگر خود ساختہ نظریہ وتخیل کی ترجمانی ہوگی نہ کہ خدمت قرآن۔ اس میں مفسر کی اپنی اجتہادی کوشش جو لفظ قرآن کی بذریعہ لغت عرب صحیح معرفت ہو، سیاق وسباق کے مطابق اس کا استعمال وہ کرے اور اسالیب عرب کی معرفت کے بعد معانی کا استنباط وغیرہ بھی۔ امام زرکشی لکھتے ہیں:

وَكَانَ السَّبَبُ فِی اصْطِلاَحِ كَثِيْرٍ عَلَى التَّفْرِقَةِ بَيْنَ التَّفْسِيْرِ وَالتَّأْوِيْلِ، اَلتَّمْيِيْزُ بَيْنَ الْمَنْقُوْلِ وَالْمُسْتَنْبَطِ، لِيُحِيْلَ عَلَى

الاِعْتِمَادِفِي الْمَنْقُولِ، وَعَلَى النَّظَرِ فِي الْمُسْتَنْبَطِ۔ (البرہان ۲/ ۱۷۲)

بہت سے علماء کے ہاں تفسیر و تاویل کی اصطلاح میں اختلاف کا سبب منقول و مستنبط کے درمیان امتیاز کرنا تھا تاکہ منقول پر اعتماد ہو اور مستنبط پر غور۔

معتزلہ کا تأویل سے مراد

لفظ کو اس کے اصل معنی سے پھیر کر دوسرے معنی کی طرف لے جانا لیا ہے۔ یہ اس صورت میں تو جائز ہے جب کوئی ایسی دلیل یا قرینہ موجود ہو جو ظاہری معنی مراد لینے سے روکتا ہو۔ تاویل کی یہ اجازت عام الفاظ میں تو دی جاسکتی تھی۔ مگر قرآن مجید میں وارد صفات الٰہی کے مرادی معنی لینے کی کوئی دلیل نہیں۔ اس سے تو مخلوق خدا سے تشبیہ ہو جاتی ہے جو رب کریم کی ذات اقدس کے حق میں تنقیص ہے۔ اس کی تنزیہ و تقدیس کے بارے میں صحیح نکتہ نظر یہی ہے کہ جس طرح اس نے اپنا تعارف کرایا ہے اسے ویسا ہی لیا جائے کوئی تأویل مشابہت اور کیفیت والی نہ کی جائے۔ اس لئے کہ لیس کمثلہ شيء۔ اس جیسی کوئی شے ہے ہی نہیں۔ اور {فلا تضربوا الله الأمثال}۔ اللہ کو متعارف کرانے کے لئے مثالیں مت دیا کرو۔ ایسا کرنا اصل معنی کو دوسرے معنی کی طرف پھیرنا ہے۔

یہی تاویلی اور مرادی معنی آج متعدد تراجم قرآن اور تفاسیر میں بخوبی نوٹ کیا جاسکتا ہے۔ جن سے مترجمین اور مفسرین کے رجحانات کا بھی علم ہوتا ہے اور قرآن کریم سے دشمنی رکھنے والوں کا بھی۔ یہ منہج فتنہ ابھارنے کا اگر نہ بھی ہو تو کم از کم اپنی من مانی تأویل اور سلف صالحین کے منہج سے ہٹا ہوا ہے۔ جیسے:

{ استوى على العرش} سے مراد جلوہ افروز ہونا۔ یا {جاء ربك والملك} سے مراد تمہارا رب جلوہ فرما ہو گا یا بعض صحیح احادیث جن میں اللہ تعالی کی صفات بیان ہوئی ہیں ان کا محض عقلی معنی لینا نہ کہ اصل۔ سوال یہ ہے کہ پھر اس سے مراد کیا ہے؟ اس کا سیدھا سادھا جواب یہی ہے کہ ہمیں اس کا معاملہ اللہ تعالی پر چھوڑ دینا چاہئے۔ اسلاف امت نے ان سب آیات و احادیث کا ایسا ظاہری معنی لیا ہے جو اس کی ذات جلیل کو زیبا ہے، تاکہ مشابہت و کیفیت کے بغیر خالق و مخلوق کی صفات میں فرق ہو سکے۔ اس لئے کہ یہ سب صفات باری تعالی ہیں جنہیں بلا تمثیل ماننا اور اللہ تعالی کو منزہ و پاک سمجھنا ضروری ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

مَا جَهِلَ النَّاسُ وَلاَ اخْتَلَفُوا إلاَّ لِتَرْكِهِمْ لِسَانَ الْعَرَبِ، وَمَيلِهِمْ إِلٰى لِسَانِ أَرَسَطَاطَالِيَس

۔لوگ دین سے جاہل تبھی ہوئے اور اختلاف میں تبھی پڑے جب انہوں نے عربی زبان ترک کر دی اور ارسطو فلسفی کی زبان کے شوقین بنے۔

امام سیوطیؒ لکھتے ہیں:

وَلَمْ يَنْزِلِ الْقُرْآنُ وَلَا أَتَتِ السُّنَّةُ إِلاَّ عَلَى مُصْطَلَحِ الْعَرَبِ وَمَذَاهِبِهِمْ فِي الْمُحَاوَرَةِ وَالتَّخَاطُبِ وَالِاحْتِجَاجِ وَالِاسْتِدْلَالِ، لَا عَلَى مُصْطَلَحِ الْيُونَانِ، وَلِكُلِّ قَوْمٍ لُغَةٌ وَاصْطِلَاحٌ، وَقَالَ اللهُ تَعَالَى: {وما أرسلنا من رسول إلا بلسان قومه ليبين لهم}۔
(صون المنطق والکلام:۱۵)

قرآن اترا اور سنت رسول ﷺ گویا ہوئی تو اہل عرب کی اصطلاحات میں، ان کی طرز گفتگو اور انداز تخاطب میں، ان کے طریقہ احتجاج اور استدلال میں۔ نہ کہ یونانی فلسفہ واصطلاحات میں۔ ہر قوم کی اپنی لغت اور اصطلاحات ہوا کرتی ہیں انہی میں ان کی کتب کو سمجھنا چاہئے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں: ہم نے کسی بھی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں تا کہ وہ ان کے لئے کھول کر بیان کر سکے۔

تفسیر اور اصول تفسیر کا ارتقاء

قرآن کریم کے نزول کے ساتھ ہی علم تفسیر کا آغاز ہو چکا تھا۔ قرآن نے اپنی تفسیر بعض مقامات پر خود کی نیز نبی اکرم ﷺ بھی قرآن کے اولین مفسر وشارح تھے۔ زبانی تفسیر کے علاوہ آپ ﷺ نے اپنے عمل میں بھی ان آیات کو سمویا۔ آپ ﷺ کے اخلاق وسیرت بھی تفسیر قرآن تھے۔ آپ ﷺ نے صرف ان حصوں کی تفسیر فرمائی جنہیں سمجھنا صحابہؓ کے لئے مشکل تھا۔ یہ مشکل اس وقت پیش آتی جہاں آیات کی فصاحت وبلاغت صحابہ کرامؓ کی علمی حد سے زائد ہوتی اور نا قابل فہم بھی۔ مثلاً: مجمل، مشکل، متشابہ آیات اور بعض اصطلاحات وغیرہ۔ جن کی تفسیر کے لئے وہ نبی اکرم ﷺ کی طرف رجوع کرتے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

لَمْ يَكُنِ النَّبِيفُ ﷺ يُفَسِّرُ شَيْئًا مِنَ الْقُرْآنِ إِلا آيَاتٌ تُعَدُّ، عَلَّمَهُنَّ إِيَّاهُ جِبْرِيْلُ۔

آپ ﷺ نے قرآن کریم کی چند گنی چنی آیات کی تشریح کی ہے جنہیں جبریل امین نے آپ ﷺ کو سکھایا تھا۔ (تفسیر القرطبی ۱/۳۱)

دراصل مسلمانوں سے مطلوب یہ تھا کہ وہ رسول اکرم ﷺ کی اتباع واطاعت میں کوئی کمی یا کوتاہی نہ کریں تا کہ قرآن کی صحیح عملی تفسیر کا خود بخود انہیں ادراک ہو تا جائے۔ صحابہؓ رسول اللہ ﷺ سے بھی آگاہ تھے کہ آپ ﷺ کے اخلاق وسیرت سبھی قرآن مجید کی تعلیمات کا عکس ہیں۔ اسی لئے امام سیوطیؒ فرماتے ہیں:

اَلَّذِيْ صَحَّ مِنْ ذَلِكَ قَلِيْلٌ جِدًّا بَلْ أَصْلُ الْمَرْفُوْعِ مِنْهُ فِي غَايَةِ الْقِلَّةِ۔ آپ ﷺ سے تفسیر بہت کم ہی ثابت ہے بلکہ مرفوع تفسیر تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ (الاتقان: ۲/۱۷۹)

نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد بے شمار عرب وعجم حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ جنکی اکثریت عربی زبان سے ناواقف تھی۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ اپنی مقدس کتاب کو جانیں اور اس کے علوم جیسے: اسباب نزول، مکی ومدنی وغیرہ سے واقف ہوں۔ چنانچہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن کے ان

حصوں کی تفسیر بیان کر دی جائے جنہیں نبی اکرم ﷺ نے بیان نہیں کیا۔ صحابہؓ کا یہی منہج رہا کہ وہ سب سے پہلے تفسیر کے لئے اقوال نبی اکرم ﷺ کو دیکھتے ورنہ وہ خود اس کے مطالب بیان کرتے۔

دور تابعین کرام میں تفسیر کی ضرورت اور بڑھ گئی۔ اس نسل نے بالمشافہ صحابہ کرامؓ سے تفسیر کا علم سیکھا۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ آیات کی تفسیر کرتے وقت سب سے پہلے احادیث نبویہ کو دیکھتے۔ پھر اقوال صحابہؓ کی طرف رجوع کرتے اور آخری درجے پر اپنے اجتہاد سے کام لیتے۔ اس دور میں تفسیر کے پہلو بہ پہلو بہت سی موقوف واسرائیلی روایات بھی شامل ہو گئیں۔ ایسی بحثیں شروع ہو گئیں جنہیں صحابہ کرامؓ نے غیر ضروری ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔

تبع تابعین کا دور آیا تو اسرائیلیات کی بھرمار ہو گئی۔ فرقہ بندی نے جنم لیا جن میں بالخصوص معتزلی، جہمی اور قدری افکار و نظریات نے تفسیری اختلافات کا دروازہ اور کشادہ کر دیا، تفسیر میں جعلی روایات کی کثرت ہوئی مگر صحیح نقل وروایت کا سلسلہ بھی اپنی آن بان کے ساتھ جاری رہا۔ عدم احتیاط سے جعلی روایات کی دیومالائی کہانیاں اور داستانیں جزو تفسیر بن گئیں۔ انہی روایات کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ کو یہ فرمانا پڑا:

ثَلَاثَةٌ لَيْسَ لَهَا أَصْلٌ: اَلتَّفْسِيْرُ، وَالْمَلَاحِمُ وَالْمَغَازِيْ۔

تین علوم ایسے ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں۔ تفسیر، جنگیں اور غزوات۔ ان تفاسیر میں کلبی اور مقاتل بن سلیمان کی تفاسیر سرفہرست ہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں:

فِيْ تَفْسِيْرِ الْكَلْبِيِّ مِنْ أَوَّلِهِ إِلَىٰ آخِرِهِ كِذْبٌ۔

تفسیر کلبی شروع تا آخر جھوٹ کا پلندہ ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا کہنا ہے:

إِنَّ النَّقْلَ عَنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ دَسِيْسَةٌ دَخَلَتْ فِيْ دِيْنِنَا۔

اسرائیلی روایات ہمارے دین میں درآئی سازش ہے۔ (الفوز الکبیر: ۵)

الحمد للہ علمائے اسلاف کی محنت اور تحقیق سے تفسیری روایات میں ضعیف وموضوع حصہ غالب نہ ہو سکا۔ جس کا تدارک عہد صحابہ میں روایت کے ذریعے ہوا اور احتیاط یہ برتی گئی کہ ہر روایت کی تفتیش ہو اور ہر ایک کی تفسیر کو میزان صحت قرار نہ دیا جائے۔

معتزلی حضرات اس فلسفے کے حامی تھے کہ احکام شریعت میں تعارض اور تضاد ہے۔ اس سوچ نے ذرا قدم بڑھائے تو صفات الٰہی کی نفی کر ڈالی اور اسی نے خبر واحد کے غیر یقینی علم ہونے کا مسئلہ چھیڑا۔ آیات قرآنیہ کی عجیب وغریب تأویلات کیں۔ حقیقت کو مجاز کا معنی دیا۔ صحیح عقائد واحادیث کا خون کیا۔ متفقہ مسائل کو متنازعہ بنایا مگر خود بھی مسائل کی گتھیوں کو سلجھا نہ سکے بلکہ ہمہ وقت پیچیدگی وابہام ہی ان کے مقدر میں رہی جو جدال ومباحثہ کی ایسی برائی ہے جس کا عمل سے کوئی تعلق نہیں۔ آزاد خیال مقلدین ومحققین اسی مدرسہ فکر کی بخشیش ہیں۔ دوسری طرف اس برائی نے بہت سے خدا ترس لوگوں کو رجوع الی الحق کی توفیق دی۔ امام ابوالحسن اشعری نے الإِبَانَةُ عَنْ أُصُوْلِ الدِّيَانَةِ لکھ کر علم کلام کے منہج اور اشاعرہ کے عقائد سے

رجوع کرلیا۔ فخر الدین رازی کی تفسیر پر یہ تبصرہ اسی لئے تو کیا گیا : فِيْهِ كُلُّ شَيْءٍ إِلَّا التَّفْسِيْرُ۔ اس میں سب کچھ ہے سوائے تفسیر کے۔ انہیں بھی خود بصد افسوس یہ کہنا پڑا: فلاسفہ کے تمام مناہج سمجھنے اور علم کلام کے سارے اصول جانچنے اور اپنانے کے باوجود میں ان میں وہ فائدہ نہیں پا سکا جو قرآن کریم میں پایا ہے۔ (عیون الأنباء ۲/ ۲۶)

تفسیر اور تاویل میں فرق

علامہ ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الفاظِ قرآنی کے معانی کو قطعیت کے ساتھ بیان کیا جائے کہ اس لفظ کے یہی معنٰی ہیں، اس کا نام تفسیر ہے ۔ اور تاویل کہتے ہیں کہ لفظ کے چند محتمل معانی میں سے کسی معنٰی کو بغیر قطعیت کے ترجیح دی جائے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ تفسیر کا تعلق روایات سے ہوتا ہے اور تاویل کا تعلق درایات سے ہوتا ہے یعنی آیات سے متعلق روایات بیان کرنے کو تفسیر کہتے ہیں اور معانیٔ قرآن اور اس کے احکام کے بیان وغیرہ کو تاویل کہتے ہیں۔

علامہ راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تفسیر اور تاویل میں فرق یہ ہے کہ لفظِ تفسیر الفاظ اور مفردات میں استعمال ہوتا ہے اور تاویل معانی اور جملوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور آگے فرماتے ہیں کہ کتبِ الٰہیہ کے لئے تاویل اور دیگر کتابوں کے لئے تفسیر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

ابو طالب التغلبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تاویل، مراد الٰہی اور اس کی حقیقت کی خبر دینے کا نام ہے اور تفسیر مراد کی دلیل بتانے کا نام ہے۔

[الاتقان فی علوم القرآن: النوع السابع والسبعون: فی معرفۃ تفسیرہ وتأویلہ وبیان شرفہ والحاجۃ الیہ]

جو شخص اپنے بھائی کو بغیر تاویل کے کافر کہے تو۔۔۔

حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ أَخْبَرَنَا وَكِيعٌ ح وحَدَّثَنَا يَحْيَى حَدَّثَنَا وَكِيعٌ عَنْ الْأَعْمَشِ عَنْ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ شَقَّ ذَلِكَ عَلَى أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالُوا أَيُّنَا لَمْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ كَمَا تَظُنُّونَ إِنَّمَا هُوَ كَمَا قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ۔ [بخاری:6103]

ترجمہ:

اسحاق بن ابراہیم، وکیع، ح، یحیی، وکیع، اعمش، ابراہیم، علقمہ، عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے نہیں ملایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر یہ بہت شاق گزرا اور ان لوگوں نے کہا کہ ہم میں سے کس نے اپنے

نفس پر ظلم نہیں کیا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بات یہ نہیں جیسا کہ تم گمان کرتے ہو، وہ تو صرف یہ ہے کہ لقمانؑ نے اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ اے بیٹے اللہ کا شریک نہ بنا بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی حدیث میں تاویل کرنا

أَخْبَرَنَا نُعَيْمُ بْنُ حَمَّادٍ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ ابْنِ عَجْلَانَ عَنْ عَوْنِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ أَنَّهُ قَالَ إِذَا حُدِّثْتُمْ بِالْحَدِيثِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَظُنُّوا بِهِ الَّذِي هُوَ أَهْيَأُ وَالَّذِي هُوَ أَهْدَى وَالَّذِي هُوَ أَتْقَى۔

[دارمی:611]

عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، قَالَ: «إِذَا حَدَّثْتُكُمْ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدِيثًا، فَظُنُّوا بِهِ الَّذِي هُوَ أَهْنَاهُ، وَأَهْدَاهُ، وَأَتْقَاهُ»

[ابن ماجہ:20]

حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں جب تم نبی اکرم ﷺ کے حوالے سے کوئی حدیث بیان کرو تو اس کے بارے میں وہی بات سوچو جو زیادہ بہتر ہدایت کے زیادہ قریب اور زیادہ پرہیز گاری پر مشتمل ہو۔

غیر مقلدوں کے خاص امراض

غیر مقلدوں میں یہ دو مرض زیادہ غالب ہیں: ایک بدگمانی، دوسرے بدزبانی، اسی وجہ سے وہ ائمہ کو حدیث کا مخالف سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک تاویل وقیاس کے معنی ہی مخالفتِ حدیث ہیں گو وہ مستند الی الدلیل ہی ہوں اور اگر ان ہی کے اصول کو مانا جائے تو من ترك الصلاة متعمدًا فقد كفر اور لا صلاة لمن لم يقرء بأم الكتاب۔ من ترك الصلاة متعمداً فقد كفر۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جس نے قصداً نماز چھوڑی اس نے فعلِ کفر کیا۔ یعنی نماز ترک کرنا اور نہ پڑھنا یہ کافروں کا فعل ہے اور مسلمانوں کا فعل نماز پڑھنا ہے یعنی کافر اور مسلمان میں پہچان یہ بتائی ہے کہ مسلمان نماز پڑھتا ہو اور کافر نماز نہیں پڑھتا ہے۔ اس سے کافر نہیں ہوتا، ترک نماز بھی بڑے گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ ہے۔ وہ کہتے ہیں

ان حدیثوں میں کوئی تاویل نہ ہو گی اور سارے حنفی تارکِ صلوٰۃ ہوئے اور تارکِ صلوٰۃ کافر ہے، تو سب حنفی کافر ہوئے نعوذ باللہ من ہذا الجہل۔

ابن قدامہ اپنی کتاب ذم التاویل میں لکھتے ہیں

ثم لو کان تأویلا فما نحن تأولنا و انما السلف رحمۃ اللہ علیھم الذی ثبت صوابھم و وجب اتباعھم ھم الذین تأولوہ فان ابن عباس و الضحاك و مالکا و سفیان و کثیرا من العلماء۔

"ترجمہ: پھر اگر یہ تاویل ہی ہو تو یہ تاویل ہم نے نہیں کی۔ یہ تاویل ان سلف نے کی ہے جن کی درستگی ثابت ہے اور جن کا اتباع واجب ہے۔ یہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور ضحاک اور مالک اور سفیان ثوری اور دیگر بہت سے اہل علم ہیں رحمہم اللہ)۔

امام احمد تاویل کرتے ہیں

(i)حکی حنبل عن الامام احمد انہ سمعہ یقول احتجوا علی یوم المناظرۃ فقالوا تجئ یوم القیامۃ سورۃ البقرۃ و تجئ سورۃ تبارك قال فقلت لھم انما ھو الثواب قال اللہ جل ذکرہ و جاء ربك و الملك صفا صفا و انما تاتی قدرتہ۔(العقیدہ و علم الکلام ص504)

(ترجمہ: امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا کہ مناظرہ کے دن فریق مخالف نے میرے خلاف یہ دلیل دی کہ حدیث میں ہے کہ سورہ بقرہ اور سورہ تبارک قیامت کے دن آئیں گی۔ میں نے جواب دیا کہ اس سے مراد ان کا ثواب ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَاۗءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (یعنی اس کی قدرت آئے گی)۔

(ii)قال ابن حزم الظاھری روینا عن الامام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فی قولہ تعالیٰ و جاء ربك انما معناہ جاء امر ربك کقولہ تعالیٰ ھل ینظرون الا ان تاتیھم الملائکۃ او یاتی امر ربك۔ و القرآن یفسر بعضہ بعضا ھکذا نقلہ ابن الجوزی فی تفسیرہ زاد المسیر (العقیدہ و علم الکلام ص504)

(ترجمہ: ابن حزم ظاہری نے نقل کیا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے وجاء ربک اور تمہارا رب آیا کے بارے میں فرمایا کہ اس سے مراد ہے ہ تمہارے رب کا حکم آیا جیسا کہ اس آیت میں ہے:

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ۔(نحل:33)

(وہ نہیں انتظار کرتے مگر اس کا کہ آئیں ان کے پاس فرشتے یا آئے تمہارے رب کا حکم۔)اور قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کرتا ہے۔ اسی طرح سے ابن الجوزی نے اپنی تفسیر زاد المسیر میں نقل کیا ہے۔

ان روایتوں کے مطابق امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے تاویل کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

ابن تیمیہ کے نزدیک تاویل غیر مکفرہ کے لئے قواعد وضوابط، اور اس بارے میں کچھ فوائد

1- دین میں جہالت یا تاویل کی بنا پر پیدا ہونے والے عذر میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ متأول کا عذر جاہل سے زیادہ قابلِ قبول ہونا چاہئے، اس لئے کہ وہ اپنے عقیدے سے بہرہ ور ہے، اور اسے سچا سمجھتے ہوئے اس پر دلائل بھی دیتا ہے، اور اسکا دفاع بھی کرتا ہے، اسی طرح عملی یا علمی مسائل میں بھی جہالت یا تاویل کے عذر بننے میں کوئی فرق نہیں ہے۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے کی چاہت کرنے والے متأول پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا، بلکہ اسے فاسق بھی نہیں کہنا چاہئے، بشرطیکہ اس سے اجتہاد میں غلطی ہوئی ہو، یہ بات علماء کے ہاں عملی مسائل میں معروف ہے، جبکہ عقائد کے مسائل میں بہت سے علماء نے خطاکاروں کو بھی کافر کہہ دیا ہے، حالانکہ یہ بات صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں، نہ ہی تابعین کرام سے اور نہ ہی ائمہ کرام میں سے کسی سے ثابت ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات اصل میں اہل بدعت کی ہے" انتہی، "منہاج السنۃ" (239/5)

2- اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان پر حدود جاری نہیں ہونگی، - جیسے کہ قدامہ بن مظعون کو شراب پینے کے بارے میں تاویل کرنے پر حد لگائی گئی- اور نہ ہی یہ مطلب ہے کہ اس کی مذمت نہ کی جائے یا تعزیری سزا نہ دی جائے، بلکہ انکے اس غلط نظریے کو گمراہی اور کفر کہا جائے گا، - جیسے کہ اسکی تفصیل آئندہ آئیگی- اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان سے جنگ بھی کرنی پڑے، کیونکہ اصل ہدف لوگوں کو انکے گمراہ کن عقیدہ سے محفوظ کرنا، اور دین کی حفاظت ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: "اگر کوئی مسلمان اجتہادی تاویل یا تقلید کی بنا پر واجب ترک کردے، یا پھر کسی حرام کام کا ارتکاب کرے اس شخص کا معاملہ میرے نزدیک بالکل واضح ہے، اسکی حالت تاویل کرنے والے کافر سے بہتر ہے، اور اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں تاویل کرنے والے باغی سے لڑائی نہ کروں، یا تاویل کرتے ہوئے شراب پینے پر کوڑے نہ لگاؤں، وغیرہ وغیرہ، اسکی وجہ یہ ہے کہ تاویل کرنے سے دنیاوی سزا مطلقا ختم نہیں ہو سکتی، کیونکہ دنیا میں سزا دینے کا مقصد شر کو روکنا ہوتا ہے" انتہی" مجموع الفتاوی" (14/22)

ایسے ہی شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے کہا: "اگر کسی نے ضرر رساں عقیدہ یا نظریہ پیش کیا تو اِس کے ضرر کو روکا جائے گا چاہے اس کے لئے سزا دینی پڑے، چاہے وہ فاسق مسلمان ہو یا عاصی، یا پھر خطاء کار عادل مجتہد، اس سے بڑھ کر چاہے صالح اور عالم ہی کیوں نہ ہو، اور چاہے وہ کام انسانی وسعت میں ہو یا نہ

ہو۔۔۔اسی طرح اس شخص کو بھی سزادی جائے گی جو لوگوں کو دین کیلئے نقصان دہ بدعت کی جانب دعوت دیتا ہے؛ اگر چہ اسے اجتہاد یا تقلید کی بنا پر معذور سمجھا جائے گا" انتہی، "مجموع الفتاوی"(10/375)

3-شریعت میں ہر تاویل جائز نہیں ہے؛ اس لئے شہادتین، وحدانیتِ الٰہی، رسالتِ نبوی، مرنے کے بعد جی اٹھنے، جنت، اور جہنم کے بارے میں کوئی بھی تاویل قبول نہیں ہوگی، بلکہ اس کو ابتدائی طور پر تاویل کہنا بھی درست نہیں ہے، اور حقیقت میں یہ باطنیت اور زندقہ ہے، جسکا مطلب دین کا یکسر انکار ہے۔

امام غزالیؒ کے نزدیک

ابو حامد الغزالی-رحمہ اللہ- کہتے ہیں:" یہاں ایک اور قاعدہ کے بارے میں جاننا ضروری ہے اور وہ ہے کہ: فریق ثانی کبھی متواتر نص کی مخالفت کو بھی تاویل سمجھ لیتا ہے، اور پھر ایسی کمزور سی تاویل پیش کرتا ہے جسکا لغت سے کوئی تعلق ہی نہیں، نہ دور کا نہ قریب کا، چنانچہ یہ کفر ہے اور ایسا شخص جھوٹا ہے، چاہے اپنے آپکو وہ مؤول سمجھتا رہے، اسکی مثال باطنیہ کی کلام میں ملتی ہے، انکا کہنا ہے کہ: اللہ تعالی واحد ہے یعنی وہ وحدانیت لوگوں کو عطا کرتا ہے اور اس وحدانیت کا خالق بھی ہے، ایسے ہی اللہ تعالی عالم ہے یعنی وہ دوسروں کو علم دیتا بھی ہے اور اسکا خالق بھی ہے، اللہ تعالی موجود ہے یعنی کہ وہ دوسری اشیاء کو وجود بخشتا ہے، اس لئے ان کے ہاں تینوں صفات کا معنی یہ لینا کہ وہ بذاتہ خود واحد ہے، موجود ہے اور عالم بھی ہے غلط ہے، اور یہ ہی واضح کفر ہے؛ اس لئے کہ وحدانیت کا ایجادِ وحدانیت معنی کرنا کوئی تاویل نہیں اور نہ ہی عربی لغت میں اسکی گنجائش ہے۔۔۔اس دعوے کی بہت سی دلیلیں ہیں جو سراسر جھوٹ کا پلندہ ہیں، جنہیں تاویل کا نام دیا گیا ہے" انتہی، "فیصل التفرقۃ" صفحہ (66-67)

ابن وزیرؒ کے مطابق

ابن وزیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:" ایسے شخص کے کفر میں بھی کوئی خلاف نہیں جو دین میں مسلّمہ اشیاء کا انکار کرے، پھر اس انکار کو تاویل کے لبادے میں چھپانے کی کوشش کرے، جیسے کہ مُلحد لوگوں نے اسمائے حسنی، قرآنی آیات، شرعی احکام، اخروی معاملات، جنت، جہنم کے بارے میں تاویل کرتے ہوئے کیا" انتہی، "إیثار الحق علی الخلق"(صفحہ:377)

4-جائز تاویل وہ ہوتی ہے جس سے دین پر کسی قسم کی قدغن نہ آئے، اور عربی زبان بھی اسکی اجازت دیتی ہو، اور مؤول کا مقصد حق بات تک پہنچنا ہو، علمی قواعد وضوابط کا اہتمام کیا گیا ہو، تو ایسی صورت میں انکو تاویل کے معاملے میں معذور سمجھا جائے گا، اور انکے لئے وہی عذر ہونگے جنہیں اہل علم نے علمی مسائل کے اختلافات بیان کرتے ہوئے انکے اسباب کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: "یہی حال کفریہ اقوال کا ہے، کہ کبھی انسان کو حق کی پہچان کروانے والی نصوص نہیں ملتی، یا ملتی تو ہیں لیکن پایا ثبوت تک نہیں پہنچتی، یا ثابت تو ہو جاتی ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتی، یا کبھی اسکے سامنے ایک شبہ آجاتا ہے جسکی بنا پر اللہ تعالی اسکا عذر قبول فرمائیں گے، چنانچہ جو کوئی مؤمن حق کی تلاش میں سرگرداں ہو اور پھر بھی اس سے غلطی ہو جائے تو اللہ تعالی اسکی غلطی کو معاف فرمائے گا چاہے وہ کوئی بھی ہو، غلطی چاہے نظری مسائل میں ہو یا عملی، یہ صحابہ کرام اور تمام ائمہ اسلام کا موقف ہے" "مجموع الفتاوی" (23/346)

حافظ ابن حجرؒ کے مطابق

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "علماء کے نزدیک ہر متأول کو اسوقت تک معذور سمجھا جاتا ہے جب تک عربی زبان میں اس تاویل کی گنجائش ہو، اور اسکی توجیہ بھی بنتی ہو" انتہی، "فتح الباری" (12/304)

5-ایک صحیح حدیث بھی موجود ہے جو مسائلِ اعتقاد میں تاویل کرنے والوں کی تکفیر سے روکتی ہے، بشرطیکہ انکی تاویل سے دین میں کسی قسم کا نقصان نہ ہو، اور وہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان، ("یہودی اکہتر (71) فرقوں میں تقسیم ہوئے، ستر (70) جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں جائے گا، عیسائی بہتّر (72) فرقوں میں بٹ جائیں گے اکہتر (71) جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں جائے گا، قسم ہے اس ذات کی جسکے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! میری امت تہتّر (73) فرقوں میں تقسیم ہو گی ایک جنت میں جائے گا اور باقی بہتّر (72) جہنم میں جائیں گے"، کہا گیا: یا رسول اللہ! وہ کون ہونگے؟ آپ نے فرمایا: "وہ بہت بڑی جماعت ہو گی") ابن ماجہ، (3992) اور البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا۔

ابو سلیمان الخطابی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا کہ "میری امت تہتّر (73) فرقوں میں تقسیم ہو گی" اسکا مطلب ہے کہ تمام کے تمام فرقے اسلام سے خارج نہیں ہونگے؛ اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو اپنی امت میں شمار کیا ہے، اور اس میں یہ بھی ہے کہ متأول اسلام سے خارج نہیں ہوتا چاہے تاویل کرتے ہوئے غلطی کر جائے" انتہی، "معالم السنن" از خطابی، (4/295) ایسے ہی دیکھیں، "السنن الکبری" از بیہقی، (10/208)

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"ایسے ہی تمام کے تمام بہتّر فرقے ہیں، ان میں سے کچھ منافق ہیں، جو کہ باطنی طور پر کافر ہوتے ہیں، اور کچھ منافق نہیں ہیں، بلکہ باطنی طور پر اللہ اور اسکے رسول پر ایمان رکھتے ہیں ان میں سے بعض باطنی طور پر کافر نہیں ہیں، چاہے تاویل کرتے ہوئے کتنی ہی گھناؤنی غلطی کر بیٹھے۔۔۔اور جو شخص ان بہتّر فرقوں کے بارے میں کفر کا حکم لگائے تو یقیناً اس نے قرآن، حدیث اور اجماعِ صحابہ کرام کی مخالفت کی، بلکہ ائمہ اربعہ اور دیگر ائمہ کے اجماع کی بھی مخالفت کی؛ اس لئے ان میں سے کسی نے بھی ان تمام بہتّر فرقوں کی تکفیر نہیں کی، ہاں کچھ فرقے آپس میں ایک دوسرے کو بعض نظریات کی بناپر کافر قرار دیتے ہیں" انتہی، "مجموع الفتاوی"(3/218)

6- علماء میں سے جس کسی نے بھی اہل بدعت - غیر مکفرہ - پر کفر کا حکم لگایا، ان کی مراد ایسا کفر ہے جس سے انسان دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، چنانچہ امام بیہقی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "جو کچھ امام شافعی وغیرہ سے اہل بدعت کی تکفیر کے بارے میں منقول ہے ان کا مقصود "کفر دون کفر" والا کفر ہے" انتہی، "السنن الکبری" از بیہقی (10/207)

امام بغوی ؒ کے مطابق

امام بغوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "امام شافعی رحمہ اللہ نے مطلق طور پر اہل بدعت کی گواہی اور انکے پیچھے نماز کی ادائیگی کو کراہت کے ساتھ جائز قرار دیا ہے، اس بناپر اگر کہیں امام شافعی رحمہ اللہ نے ان اہل بدعت کے بارے میں کفر کا حکم لگایا ہے تو اس کا مطلب "کفر دون کفر" والا کفر ہے، جیسے کہ فرمانِ باری تعالی ہے:

(ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الكافرون) المائدة/44

ترجمہ: اور جو کوئی بھی اللہ تعالی کے احکامات سے ہٹ کر فیصلہ کرے یہی لوگ کافر ہیں "شرح السنة"(1/228)

بسا اوقات ائمہ کرام کا لفظِ "کفر" بول کر تنبیہ کرنا مقصود ہوتا ہے

چنانچہ ابن تیمیہ کہتے ہیں:

"بسا اوقات ائمہ کرام سے کسی کی تکفیر نقل کی جاتی ہے حالانکہ ان کا مقصود صرف تنبیہ ہوتا ہے، اس لئے کفریہ قول کی بناپر ہر قائل جہالت یا تاویل کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا، اس لئے کہ کسی کے بارے میں کفر ثابت ہونا ایسے ہی ہے کہ جیسے اس کے لئے آخرت میں وعید ثابت کی جائے، جبکہ اسکے بارے میں شرائط وضوابط ہیں" انتہی، "منهاج السنة النبوية"(5/240)

7-اہل بدعت کے کفر کے بارے میں ائمہ کرام کے اقوال میں اختلاف کفریہ کام اور کفریہ کام کے مرتکب میں فرق کی وجہ سے ہے، چنانچہ وہ کفریہ عقیدہ پر کفر کا حکم لگاتے ہیں، لیکن فردِ معین پر کفر کا حکم اس وقت لگاتے ہیں جب اسکی شرائط مکمل ہوں اور کوئی چیز مانع بھی نہ ہو۔

خوارج، معتزلہ، قدریہ وغیرہ اہل بدعت کی مختلف اقسام ہیں

• ان میں سے بعض بلاشک وشبہ کافر ہیں جیسے غالی جہمی جنہوں نے اسماء وصفات کا انکار کر دیا، اور انہیں یہ بھی پتہ ہے کہ انکی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی کے مخالف ہے، لیکن اسکے باوجود انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی۔

• اور کچھ ایسے بھی ہیں جو گمراہ، بدعتی، فاسق ہیں مثلاً: تاویل کرنے والے خارجی اور معتزلی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب نہیں کرتے، لیکن اپنی بدعت کی وجہ سے گمراہ ہوگئے، اور اپنے تئیں سمجھتے رہے کہ ہم حق پر ہیں، اسی لئے صحابہ کرام خوارج کی بدعت پر حکم لگانے کیلئے متفق تھے، جیسے کہ انکے بارے میں احادیث صحیحہ میں ذکر بھی آیا ہے، اسی طرح صحابہ کرامؓ انکے اسلام سے خارج نہ ہونے پر بھی متفق تھے اگرچہ خوارج نے خونریزی بھی کی اور کبیرہ گناہوں کے مرتکب کیلئے شفاعت کے انکاری بھی ہوئے اسکے علاوہ بھی کافی اصولوں کی انہوں نے مخالفت کی، خوارج کی تاویل نے صحابہ کرامؓ کو تکفیر سے روک دیا۔

• کچھ اہل بدعت ایسے بھی ہیں جو سابقہ دونوں اقسام سے کہیں دور ہیں، جیسے بہت سے قدری، کلابی، اور جہمیہ، چنانچہ یہ لوگ کتاب وسنت کی مخالفت کرنے والے اپنے مشہور اصولوں میں بدعتی شمار ہونگے، پھر حق سے دوری کی بنیاد پر ہر ایک کے درجات مختلف ہونگے، اور اسی بنیاد پر کفر، فسق، اور بدعت کا حکم لگے گا، اور حکم لگاتے ہوئے تلاشِ حق کیلئے انکی کوشش کو بھی مد نظر رکھا جائے گا، یہاں اسکی تفصیل بہت لمبی ہو جائے گی" انتہی،

"توضیح الکافیۃ الشافیۃ"(156-158)

" امام ابوعبیدہ نے فضائل قرآن میں اور سعید بن منصور نے ابراہیم تیمی سے بیان کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ یہ بات سوچ رہے تھے کہ اس امت میں اختلاف کیسے واقع ہو سکتا ہے۔ پھر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنھما کو بلوایا اور فرمایا: اے ابن عباسؓ! اس امت کا نبی ایک، قبلہ ایک، کتاب ایک پھر یہ امت اختلاف میں کیسے پڑے گی....؟

(یعنی بظاہر یہ ممکن نہیں۔)

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنھما نے فرمایا: اے امیر المومنین یہ قرآن ہم میں نازل ہوا ہم نے اسکو نبی کریم ﷺ سے پڑھا اور ہمیں معلوم ہے (کون سی آیات) کس بارے نازل ہوئی۔ جبکہ ہمارے بعد کچھ لوگ آئیں گے جو قرآن تو پڑھیں گے لیکن انہیں یہ معلوم نہ ہو گا کہ کونسی آیت کس بارے نازل ہوئی اور وہ خود سے اس کے بارے رائے زنی کرینگے۔ جب اپنی اپنی آراء پہ چلیں گے تو ان میں اختلاف ہو گا۔۔۔

[فضائل قرآن لابی عبیدۃ]

اسی پہ امام شاطبی فرماتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما کا یہ فرمانا برحق ہے کہ جب آدمی کو علم ہو کہ یہ آیت کس بارے نازل ہوئی تو وہ اسکے ماخذ، تفسیر، اور شریعت کے مقصد کو معلوم کر لیتا ہے اور زیادتی کا شکار نہیں ہوتا تو جب کوئی آدمی اپنی نظر سے کئی احتمالات بنانا شروع کر دیتا ہے تو ایسے لوگوں کے علم میں۔ پختگی نہیں ہوتی اور یہ لوگ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

حروریہ کا طریقہ

اسکی وضاحت اس واقع سے بھی ہوتی ہے جب سیدنا نافع رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ صحابی رسول عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنھما کی حروریہ (خوارج) کے بارے کیا رائے ہے تو انہوں نے فرمایا: وہ انکو اللہ کی سب سے بدترین مخلوق سمجھتے ہیں کیونکہ وہ خوارج کفار کے بارے نازل شدہ آیات کو مسلمانوں پہ فٹ کرتے ہیں۔

یہ سن کے سعید بن جبیر تابعی رحمہ اللہ متوجہ ہوئے اور فرمایا یہ لوگ متشابہ آیات جو مختلف احتمال رکھتی ہیں انکی پیروی کرتے ہیں جیسے اللہ کا فرمان:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فأولئك الكافرون

اور جو اللہ کے نازل کردہ فرمان کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے

اور ساتھ یہ آیت ملا لیتے ہیں۔۔۔۔

وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَهُم بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ (الانعام:150)

وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لائے اور وہ اپنے رب کے ساتھ برابری کرنے والے تھے

اور نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ جس نے کفر کیا اس نے اللہ کی برابری کی اور جس نے رب کے ساتھ برابری کی اس نے شرک کیا۔۔۔!!!
پس یہ لوگ مشرک ہیں لہٰذا وہ خروج کرتے ہیں اور قتل وغارت کرتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے آیت کی تفسیر ہی ایسے لی تھی

[الاعتصام للشاطبی ج2، ص692_691]

اہل سنت و جماعت کے مطابق آیات تحکیم

اہل السنۃ والجماعۃ کے علماء کا اجماع ہے کہ آیات تحکیم سے ظاہر مراد نہیں ہے اور ان آیات کے ظاہر سے خوارج اور معتزلہ، کفر اکبر کا استدلال کرتے ہیں۔۔۔!!!!

مندرجہ ذیل علماء کے اقوال ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اس آیت کے ظاہر سے وہ لوگ کفر اکبر کی حجت بیان کرتے ہیں جو گناہوں کی وجہ سے کفر اکبر کا فتویٰ لگاتے ہیں اور وہ خوارج ہیں۔ اور اس آیت میں انکی کوئی حجت نہیں۔"

[المفہم جلد نمبر 5 صفحہ نمبر 117]

۲۔ حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اور اس باب میں اہل بدعت کی ایک جماعت گمراہ ہوئی۔ اس باب میں خوارج اور معتزلہ میں سے پس انہوں نے ان آثار سے حجت بیان کی کہ کبیرہ گناہوں کے مرتکب کافر ہیں اور اللہ تعالی کی کتاب میں سے ایسی آیات کو حجت بنایا جن سے ظاہر مراد نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا (وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ) (المائدۃ:44)"

[التمہید جلد 16، صفحہ 312]

۳۔ امام آجری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اور حروری (خوارج) جن متشابہ آیات کی پیروی کرتے ہیں ان میں سے یہ آیت بھی ہے"

(وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ [المائدۃ:44]

اور اس آیت کے ساتھ یہ آیت بھی بیان کرتے ہیں

ثُمَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ [الانعام:1]

”پس جب وہ کسی حکمران کو دیکھتے ہیں کہ وہ بغیر حق کے فیصلہ کرتا ہے، کہتے ہیں یہ کافر ہے اور جس نے کفر کیا اس نے اپنے رب کے ساتھ شریک بنالیا، پس یہ حکمران مشرک ہیں، پھر یہ لوگ نکلتے ہیں اور وہ کرتے ہیں جو آپ دیکھتے ہیں کیونکہ (وہ) اس آیت کی تاویل کرتے ہیں۔“

[الشریعہ صفحہ:44]

ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

”اور یہ وہ آیت ہے جسے خوارج ایسے حکمرانوں کی تکفیر کے لئے بطور حجت پیش کرتے ہیں جو اللہ تعالی کے نازل کردہ فیصلوں کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں۔“

[منہاج السنہ ج5 ص131]

علامہ ابوالحسن الملطی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ؛

یہ بات فیصلہ شدہ ہے کہ سب سے پہلے خوارج وہ تھے کہ جنھوں نے لاحکم الااللہ۔۔۔اللہ عزوجل کی ذات اقدس کے علاوہ کسی کا فیصلہ قابلِ قبول نہیں کا نعرہ لگایا تھا۔ اور ان کا دوسرا نعرہ یہ تھا کہ؛امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کفر کا ارتکاب کیا ہے والعیاذ باللہ کہ انہوں نے بندوں کے درمیان فیصلے کا اختیار حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ کو سونپ دیا تھا۔ جبکہ فیصلے کا اختیار تو صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔۔۔۔!!!!

خارجیوں کے فرقے کو اس وجہ سے بھی خوارج کہا جاتا ہے کہ انہوں حکمین والے دن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا تھا کہ جب انہوں نے جناب مولا علی کرم اللہ وجہہ اور ابوموسیٰ اشعری کے فیصلہ کرنے والے عمل کو ناپسندیدگی اور نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا تھا؛ لاحکم الااللہ۔۔۔۔

[التنبیہ والرد علی اھل الاھواء والبدع ص47]

تفسیر کی موجودہ اقسام

موجودہ دور میں تعلیم کی غرض سے بعض جامعات میں تفسیر کی تقسیم دوطرح سے کی گئی ہے۔

1۔ جدید تقسیم

2۔ مشہور تقسیم

جدید تقسیم کے مطابق تفسیر کی تین اقسام ہیں۔

ا

تفسیر تحلیلی

اس میں قرآنی آیات کو گرائمر کے ضابطوں کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے اور صرفی و نحوی مباحث سے قرآنی آیات والفاظ کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔اسے حقیقتاً تفسیر نہیں کہا جاسکتا کیونکہ تفسیر کی لغوی اور اصطلاحی دونوں تعریفات اس پر منطبق نہیں ہوتیں۔

تفسیر موضوعی

اس قسم میں ایک ہی موضوع سے متعلق قرآنی آیات کو جمع کر کے ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔ جیسے احکام کی آیات کو اکٹھا کر کے ان کی تفسیر کرنا اسی طرح آیات ایمانیات، آیات توحید، آیات اخلاق، آیات معاشرت، آیات معیشت وغیرہ۔

تفسیر مقارن

اس قسم میں قرآن مجید کی بعض مخصوص آیات کو لے کر مختلف مفسرین کی لکھی ہوئی تفسیری آراء کا باہمی موازنہ کیا جاتا ہے جن میں بنیادی طور پر ان آیات کے بارے میں ہر مفسر کے عقیدہ، مذہبی میلان اور اس کے مؤقف و دلائل کو سمجھا جاتا ہے۔

کتب تفسیر میں اختلاف

کتب تفسیر میں عموماً اختلاف دو قسم کا ہے:

اختلاف تنوع

ایسا اختلاف جس میں کوئی تناقض یا تضاد نہیں بلکہ نئے انداز فکر کا ہے۔ یہ ایسا اختلاف ہے جیسے اللہ تعالی اپنی یا رسول اللہ ﷺ کی یا کتاب کی مختلف صفات بیان کر دے جس میں ہر اسم اپنی صفت کی خبر دے دے۔ یہ بھی امکان ہے کہ اس تفسیر میں ہر مفسر حق پر ہو۔ ایسا اختلاف مفسرین صحابہ و تابعین اور دیگر ائمہ میں بھی عام تھا۔ مثلاً بعض مفسرین نے: اہدنا الصراط المستقیم کا مطلب کتاب اللہ یا کتاب اللہ کی اتباع کا لیا ہے اور کچھ دین اسلام لیتے ہیں اور بعض اہل السنۃ والجماعۃ لیتے ہیں اور کچھ عبادت کے طریقے یا خوف ورجاء اور اللہ تعالی سے محبت کے طریقے اور اس کے احکام کو ماننے اور نواہی سے بچنے، کتاب وسنت کی پیروی کرنے یا اللہ تعالی کی اطاعت کرنے کو کہتے ہیں۔ سب جانتے ہیں جس کا نام رکھا جاتا ہے وہ ایک ہوتا ہے مگر اس کی صفات وغیرہ متنوع ہو سکتی ہیں۔ جیسے محمد ﷺ کہا جائے تو وہی احمد ﷺ بھی ہیں، حاشر، وماحی بھی اور عاقب وخاتم المرسلین ﷺ بھی۔ وہی نبی رحمت بھی ہیں اور نبی ملحمہ بھی۔ اسی طرح قرآن کہا جائے تو وہ فرقان بھی ہے اور نور، شفاء، ذکر، حکیم اور الکتاب بھی۔ اسی طرح اللہ تعالی کے اسماء حسنی کو لے لیجئے۔ بہت سے تراجم وتفاسیر ایسے ہی ہیں۔

تعریفی یا حصری

مفسر کسی بھی لفظ کا متعین یا تمثیلاً ایسا معنی پیش کرے جو تعریفی یا حصری (restricted) ہو مثلاً ایک عجمی یہ پوچھے کہ ما الخبز؟ تو ایک رغیف (bread) کی طرف اشارہ کرکے کہہ دیا جائے یہ ہے جس سے مقصود وہی روٹی نہیں ہوتی بلکہ اس روٹی کے وجود کو متعین کرنا ہے۔ مفسر جب یہ بتائے کہ فمنہم ظالم لنفسہ یا صالحین اور ظالمین سے مراد کیا ہے تو وہ حسب حاجت ہی بتائے گا کہ ظالم اسے کہتے ہیں جس کی نماز رہ جائے جو وضوء اچھی طرح نہیں کرتا یا جو ارکان کو پورا نہ کرے۔ اور مقتصد وہ ہے جو وقت پر اور حکم کے مطابق ہی نماز پڑھے۔ وغیرہ۔ سیدنا ابن عباسؓ فرمایا کرتے:

تفسیر قرآن کی چار صورتیں ہیں

ایک وہ جسے عرب اپنے کلام سے جانتے ہیں۔ دوسری وہ جو جاہل بھی سمجھتا ہے اور ایک وہ جسے علماء ہی جانتے ہیں اور چوتھی تفسیر وہ جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس کے علم کا اگر کوئی دعوی کرتا ہے تو وہ جھوٹا انسان ہے۔

پھر یہ کہ اس اختلاف کی نوعیت وحقیقت سوائے راجح، مرجوع یا مباح اور مستحب کے اور کچھ نہیں۔ جیسے دیگر مسائل فقہیہ میں ائمہ اربعہ احترام باہمی کے ساتھ مختلف فیہ ہوتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کی تفسیر کا بھی یہی حال ہے۔ ہو تا یوں ہے کہ تفسیر میں مختلف اقوال صحابہ ہوتے ہیں جو آیت کے مختلف احتمالات کی وجہ سے تنوع پیدا کر دیتے ہیں جسے عام آدمی اختلاف سمجھ بیٹھتا ہے حالانکہ ان کا فائدہ یہ ہے کہ استخراج مسائل میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور فکر و نظر کی مزید راہیں کھلتی ہیں جس سے جمود ٹوٹتا ہے۔

تفسیر بالماثور کی یہ چاروں اقسام محدثانہ تفاسیر کہلاتی ہیں۔ گو یہ بدعات اور غلو سے خالی ہیں مگر قصص کے بیان میں صحت اسانید کا خیال نہیں رکھا گیا اور آثار بھی اسرائیلیات کی لپیٹ میں آگئے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں نسبتاً کافی محتاط رہے مگر پھر بھی ان کی تفسیر میں ایسے آثار آگئے جو مناسب تھا کہ نہ آتے۔ اس تفسیر کی تخریج احادیث وآثار نے اسے اب نکھار دیا ہے۔

تفسیر کلمات میں اختلاف کا اصولی حل

ایسے قرآنی کلمات جو ایک سے زائد معنی کے محتمل ہوں تو؟ ان کے صحیح معنوی انتخاب کے لئے ذیلی اصول پیش نظر رکھ کر ان شاءاللہ تفسیری کج روی سے محفوظ رہا جاسکتا ہے:

☆... قرآن مجید میں وارد الفاظ وکلمات اپنے سیاق وسباق کے مطابق جن شرعی یا لغوی مفاہیم کا تقاضا کرتے ہوں ان سے قرآن کی تفسیر کی جائے۔ یہی حکم الٰہی ہے: {اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ط} (النساء:۱۰۵) ہم نے آپ کی طرف کتاب، حق کے ساتھ نازل کی تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے ساتھ فیصلہ کریں جو اللہ تعالی آپ کو سجھائے۔ اسی طرح یہ ارشاد {اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ} (الزخرف:۳) ہم نے اسے عربی قرآن بنایا ہے تا کہ تم سمجھو۔ اور یہ ارشاد {وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ} (إبراہیم:۴)

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں تا کہ وہ انہیں بیان کرے۔

☆... اگر شرعی ولغوی معنی میں اختلاف ہو تو قاعدہ یہ ہے کہ وہ معنی لیا جائے گا جس کا شریعت تقاضا کرتی ہے۔ کیونکہ قرآن مجید شریعت کو بیان کرنے کے لئے نازل ہوا ہے نہ کہ لغت کو بیان کرنے کے لئے الا یہ کہ وہاں کوئی دلیل ہو تو پھر لغوی معنی کو ترجیح دی جاسکتی ہے اور اسے ہی لیا جاسکتا ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالی کا منافقین کے بارے میں یہ ارشاد {وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا} (التوبۃ:۸۴) صلاۃ: لغت میں دعا کو کہتے ہیں۔ شرع میں یہاں اس کا معنی میت کے لئے مخصوص حالت میں برائے دعا کھڑا ہونا ہے۔ تو یہاں شرعی معنی مقدم ہو گا کیونکہ یہی متکلم کا مقصود ہے اور مخاطب کو بھی اسی کی تنبیہ کی جارہی ہے باقی ان کے لئے دعا کرنے سے منع فرمانا تو وہ دوسری دلیل سے ہو سکتا ہے نہ کہ اس آیت سے۔

☆...ایک اور مثال جس میں دو مختلف معنی ہیں مگر لغوی معنی مقدم کیا گیا ہے۔ جیسے: {خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ}(التوبۃ:۱۰۳)صلاۃ سے مراد یہاں دعاء ہے۔ جس کی دلیل صحیح مسلم کی یہ حدیث(۲۴۹۲) ہے۔ ابن ابی اوفیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے پاس جب کسی کے صدقہ کا مال لایا جاتا تو آپ انہیں دعا دیتے۔ آپ ﷺ کے پاس میرے والد بھی اپنا صدقہ لے کر گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى آلِ أَبِي أَوْفٰى۔

☆...رہی وہ مثالیں جن میں شرعی اور معنوی معنی دونوں پائے جاتے ہوں تو وہ بکثرت ہیں جیسے: سماء، أرض، صدق وکذب، حجر وانسان۔ وغیرہ۔

تفسیر بالرائے کی اقسام

تفسیر کی یہ دوسری قسم اجتہادی تفسیر کہلاتی ہے۔ یا اسے تفسیر درایت یا تفسیر معقول بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد قرآن کی تفسیر، احادیث اور اقوال صحابہؓ وتابعینؒ کی بجائے زیادہ تر اپنے اجتہاد اور رائے کی بنا پر کرنا ہے۔ یہ رائے دو قسم کی ہو سکتی ہے۔

رائے محمود

اس سے مراد وہ تفسیر ہے جو قرآن وسنت سے مستند ہو۔ یعنی جس میں مفسر، اپنی رائے کا اظہار کرنے سے قبل تفسیر بالماثور کی طرف رجوع کر چکا ہو اس نے کوشش کی ہو کہ اولاً قرآن کی تفسیر قرآن میں ڈھونڈے، وہاں نہ ملے تو اسے احادیث صحیحہ میں تلاش کرے۔ پھر بھی تفسیر نہ ملے تو یکے بعد دیگرے اقوال صحابہؓ اور اقوال تابعین کی طرف رجوع کرے۔ جہاں کوئی ایسا صحیح قول مل گیا جو اس آیت کی تفسیر میں ہو، اسے لے لے۔ جب کہیں بھی اس آیت کی تفسیر نہ ملے تو پھر قرآن وسنت کے مطالب، مفاہیم اور مقاصد کی روشنی میں آیات کی تفسیر کرے اور اپنی عقل ورائے سے کام لے کر تفسیر کر ڈالے۔ یہ تفسیر محمود یعنی پسندیدہ کہلائے گی اس لئے کہ مقصد قرآن کو وہ پورا کر رہی ہوتی ہے۔ اسے تفسیر بالدرایہ بھی کہتے ہیں۔ علماء ایسی تفسیر کو جائز سمجھتے ہیں جن کے یہ دلائل ہیں:

☆...اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

(أفلا يتدبرون القرآن أم على قلوب أقفالها)

کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔

یہ غور وفکر اور تدبر بغیر اسلامی مفاہیم کے نہ ہوا اور نہ ہی مقاصد شریعت سے ہٹا ہوا ہو۔ ایسی صورت میں یہ محمود رائے ہوگی۔

☆... آپ ﷺ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی:

اللّٰهمّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ وعَلِّمْهُ التَّأْوِيلَ۔

اللہ ! انہیں دین کی سمجھ اور قرآن کا معنی سکھادے۔ یہ بھی محمود رائے کی طرف اشارہ ہے۔

☆... صحابہ رسول بھی تفسیر میں مختلف وجود میں اختلاف رکھتے تھے۔ اس کی وجہ ان کا معنی ومفہوم سمجھنے میں اپنا اپنا اجتہاد تھا۔

رائے مذموم

جو مفسر، تفسیر کے لئے نہ قرآن سے رجوع کرے، نہ حدیث سے اور نہ اقوال صحابہؓ اور تابعینؒ سے، تو پھر اس کے ذہن میں کیا ہو سکتا ہے؟ یا تو وہ خود پسندی، خواہش نفس، بدعت وخرافات اور تعلی کا شکار ہے یا پھر جاہل وعدم صلاحیت کا مالک ہے۔ ایسے افراد کا عقیدہ غلط اور بلاسند ہوتا ہے۔ اپنا مخصوص ذہن لے کر، مخصوص آیات کا انتخاب کر کے اپنی دل پسند تفسیر کرتے ہیں تا کہ ان کے مذموم مقاصد کو سند شرعی مل سکے۔ یہ تفسیر، تفسیر مذموم اور حرام ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرمایا کرتے:

فأَمَّا تفسيرُ القرآنِ بِمُجَرّدِ الرَّأْيِ فَحَرَامٌ۔

تفسیر قرآن محض رائے سے کرنا حرام ہے۔

شریعت کا کوئی صحیح عالم اسے پسند نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ اللہ تعالی پر ایسی بات کہنا ہے جو اس نے نہیں کہی۔ اور جس کا اس مفسر کو علم ہی نہیں۔ آپ ﷺ نے بڑے سخت الفاظ میں تنبیہ فرمائی ہے: جو قرآن پاک میں بغیر علم کے کوئی بات کہتا ہے وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنا لے۔ (سنن ترمذی) اور یہ حدیث بھی: جس نے قرآن میں اپنی طرف سے کوئی رائے دی وہ صحیح بھی ہو اس نے خطا کی۔ (سنن ترمذی)۔ تاج الدین شہرستانی (م:۵۴۸ھ) نے کوشش کی کہ تفسیر قرآن میں فلسفہ اور حکمت کو بھی جمع کر دیں۔ چنانچہ جب وہ آیات کی تفسیر کو فلسفہ اور حکمت کے قوانین کے مطابق کرنے لگے تو ظہیر الدین بیہقی نے انہیں کہا:

هَذَا عَدُوْلٌ عَنِ الصَّوَابِ. وَالْقُرْآنُ لاَ يُفَسِّرُ إِلاَّ بِتَأْوِيْلِ السَّلَفِ وَالتَّابِعِيْنَ. وَالْحِكْمَةُ بِمَعْزِلٍ عَنْ تَفْسِيْرِ الْقُرآنِ. خُصُوصاً مَا كُنْتَ تُؤَوِّلُهُ. وَلاَ تُجْمَعُ بَيْنَ الشَّرِيْعَةِ وَالْحِكْمَةِ أَحْسَنَ مِمَّا جَمَعَهُ الْغَزَالِيُّ. فَامْتَلأَ غَضَباً۔

یہ راستی سے ہٹاہوا انداز ہے۔ قرآن کی تفسیر وہی ہونی چاہئے جو سلف اور تابعین میں رہی۔ حکمت کا تفسیر قرآن سے کیا تعلق؟ بالخصوص جو آپ معنی لے رہے ہیں۔ آپ غزالی سے بہتر طریقہ نہیں اپناسکتے جنہوں نے شریعت اور حکمت کو باحسن یکجا کر دیا ہے۔ شہرستانی یہ بات سن کر غصے سے بھڑک اٹھے۔

سیدنا عمرؒ بن عبد العزیز نے ایک شخص کو یہ جواب دیا جس نے خواہشات یا جو من کہے اس کا سوال کیا تھا:

عَلَيْكَ بِدِينِ الصَّبِي الذي في الكُتّاب والأَعرابِ، والْهَ عما سِواهُما۔

تم بچے کا طریقہ ہی اپناؤ جس کا ہر لمحہ کتابت سیکھنے میں اور بدوؤں میں گذرتا ہے اور باقی تمام اشغال سے بے پرواہو جاؤ۔یعنی اسے ذہنی طور پر انہوں نے نابالغ کہا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں:

مَا قَلَّتِ الآثَارُ فِي قَوْمٍ إِلا ظَهَرَتْ فِيهِمُ الأَهْوَاءُ، وَلاَ قَلَّتِ الْعُلَمَاءُ إِلا ظَهَرَ فِي النَّاسِ الْجَفَاءُ۔

جب کبھی بھی آثار واحادیث کسی قوم میں کم ہوئیں وہاں اہواء خواہشات نفس ڈیرہ ڈال دیتے ہیں اور جب کہیں علماء کی کمی ہوئی وہاں لوگوں کے مزاج میں ظلم رچ بس جاتا ہے۔

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مَنْ طَلَبَ الدِّيْنَ بِالْكَلاَمِ تَزَنْدَقَ۔

جس نے دین کو علم کلام کے ذریعے سمجھنا چاہاوہ زندیق بنا۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

أَكْثَرُ النَّاسِ شَكًّا بِالْمَوتِ أَهْلُ الْكَلاَمِ۔

موت کے بارے میں شاکی افراد میں زیادہ تر یہی فلسفی اور کلامی لوگ ہی ہوتے ہیں۔

امام خطابیؒ نے علم الکلام کے بارے میں اپنا یہ خیال ظاہر فرمایا ہے:

حِجَجٌ تَهَافَتُ كَالزُّجَاجِ تَخَالُهَا حقاً، وكلٌ كاسرٌ مكسورٌ

بکھری حجتیں ہیں شیشے کی مانند جنہیں تم حق سمجھتے ہو مگر درحقیقت یہ سب ٹوٹی پھوٹی ہیں۔

تفسیر اشاری یا باطنی

اس تفسیر کا دارو مدار روایت، رائے یا علم واجتہاد پر نہیں بلکہ الفاظ قرآنی کا جو ظاہری معنی ومفہوم مراد ہے اس سے ہٹ کر یا ترک کر کے اپنے خیال یا فکر کے مطابق جو پوشیدہ معنی مفسر لے اسے تفسیر اشاری یا باطنی کہتے ہیں۔ ایسے معانی روافض اور صوفیا کرام کے ہاں عام رائج ہیں۔ بظاہر اس تفسیر کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے کم اور انہونی چیزوں کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے۔ عام عقائد واعمال میں بھی یہی اشارے ان کے ہاں چلتے ہیں جو ان تشیع وصوفیاء کو سوجھتے یا خواب میں بتائے جاتے ہیں۔ مثلاً أَلا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ سنو! اللہ کے اولیاء کو نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ اس آیت میں ولی کا اشاری معنی جو زبان زد صوفیاء ہے وہ انسان ہے جو بہت پہنچا ہوا ہو اور جس سے خوارق عادت کرامات ظاہر ہوتی ہوں، جو انہونی کو ہونی کر دے۔ اس لئے ایسے اولیاء کے دس طبقات ہیں جو غوث، ولی، قطب، ابدال، دستگیر، مشکل کشا، داتا، امام غائب جیسے مناصب کے ذریعے نظام دنیا سنبھالے ہوئے ہیں۔ مگر یہ سب مناصب، عطا کنندہ سمیت ایک اہم راز ہیں جن کی حقیقت سوائے صدری نسخوں کے اور کوئی نہیں۔ اس لئے مسئلہ ولایت دونوں کے ہاں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ دونوں کے ہاں ولی کی افضلیت یا ولایت کا عموماً اشاری یا باطنی معنی یہ لیا جاتا ہے کہ ولایت ایک طویل مگر مسلسل مشقت کی عبادت وریاضت کا نام ہے جو ولی کو مدتوں بعد نصیب ہوتا ہے جبکہ نبوت ایک وہبی چیز ہے جو ولایت جیسی قربانیاں نہیں چاہتی۔ وہ تو اس کے برعکس محض بیٹھے بٹھائے سکون سے نصیب ہو جاتی ہے۔ اس لئے ولایت، نبوت سے افضل ہے۔ امامت بالاتر است از رتبہ پیغمبری۔ (حیات القلوب ۳/۱۰ از علامہ باقر مجلسی) اسی تعریف کے عملی مظاہرے خانقاہوں، مزاروں، درگاہوں، عرسوں اور چہلموں پر ہی ہوتے ہیں۔ جس نے رسول کے ساتھ عشق کے اضافے کے بعد اس کی اطاعت کی اہمیت ہر اعتبار سے کم کر دی ہے۔ اور بقول سیدنا علی رضی اللہ عنہ أتباع كل ناعق ہر زور سے بولنے والے کے پیچھے لگ جانے والے۔ ولی کی اس تعریف کا یہ تکلف کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی اگر قرآن مجید میں اسی آیت کو ذرا مزید لیا جاتا جہاں اللہ تعالی نے ولی کی تعریف فرما دی ہے۔ ارشاد ہے:

{أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ} (یونس: ۶۳،۶۲)

سنو! اللہ کے اولیاء کو نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے ہیں۔

جن افراد میں یہی دو نشانیاں، ایمان اور تقوی ہوں گے وہی صحیح معنوں میں اولیاء اللہ ہیں۔

تشیع کی باطنی تفسیر کے چند نمونے

امام ابن تیمیہؒ کے فتاوی (۷/۱۲۷) میں یہ نمونے موجود ہیں جو قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

صلاۃ سے مراد وہ نماز نہیں جو پڑھی جاتی ہے یا یہ وہ نماز ہے جو عوام کے لئے ہے مگر خواص کے لئے صلاۃ سے مراد۔ ہمارے اسرار کو جاننا، صیام سے مراد ہمارے اسرار کو چھپانا اور حج کرنے سے مراد ہمارے مقدس مشائخ کی زیارت کرنا ہے۔

جنت دراصل دنیا میں خواص کا لذتوں سے متمتع ہونے کا نام ہے اور نار سے مراد اپنے آپ کو شریعت کا پابند کرنا اور اس کے بوجھوں تلے لانا ہے۔ جن انبیاء کرام کو آپ ﷺ نے شب معراج دیکھا وہ آسمان کے ستارے ہیں۔ جس آدم کو آپ ﷺ ملے وہ چاند ہے، یوسف زہرہ ستارہ ہے اور ادریس سورج۔ سیدنا علیؓ باطنی علم کے شہوار تھے۔ ابو بکرؓ ظاہری علم کے۔ جب کہ اہل السنۃ کا اتفاق ہے کہ سیدنا ابو بکر شریعت کے تمام باطنی و ظاہری علوم کے گل سرسبد تھے۔

{۔۔۔وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ}(یس:۱۲)

امام سے مراد سیدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں۔۔

مزید لکھا نہیں جا سکتا کیونکہ دراصل وہ خلفائے راشدین کے لئے تبرے ہیں۔

معنویت سے عاری یہ تفسیر اکثر اوقات قرآن کے مقاصد سے ہٹی ہوئی اور صوفیانہ موشگافیوں سے پر ہوتی ہیں جسے وہی جان سکتا ہے جو باطنی مزاج کے ساتھ تصوف ورفض پر دسترس رکھتا ہو۔ واضح سی بات ہے کہ ایسا باطنی یا اشاری علم اگر شریعت کے ظاہری علم کے خلاف ہے۔ قرآن تو پھر کھیل تماشا بن گیا۔ ایسے معانی کے بعد کون قرآن کے شرعی احکام سمجھے گا؟ اور کیا یہ تفسیر مسلمانوں کو باہم مل بیٹھنے دے گی؟۔ شرعاً کوئی مسلمان باطنی علم پر ایمان لانے کا مکلف نہیں ہاں اسے علم غیب پر ایمان لانے کا ضرور کہا گیا ہے۔ اس لئے قرآن وحدیث کی تفسیر صحابہ و تابعین کے ظاہری علم سے ہٹ کر کرنا گویا اللہ تعالی پر افتراء باندھنا، کلام اللہ میں تحریف کا ارتکاب کرنا اور الحاد کو دعوت دینا ہے۔ سنن الترمذی (۲۹۵۰) میں یہ ارشاد رسول ﷺ ہے:

مَنْ قَالَ فِي الْقُرآنِ بِغَيرِ عِلْمٍ، فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔

جس نے قرآن مجید میں بغیر علم کے کوئی بات کہی تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ بنالے۔

خلیفہ رسول سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

أَيُّ أَرْضٍ تُقِلُّنِي وَأَيُّ سَمَاءٍ تُظِلُّنِي إِذَا قُلْتُ فِي كِتَابِ اللهِ مَا لَمْ أَعْلَمْ۔ (الفتاوی الکبری ۷/۱۹۹)

کونسی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھے سایہ دے گا جب میں کتاب اللہ کے بارے میں ایسی بات کہہ دوں جو میں نہیں جانتا۔

چند مفسر صحابہ و تابعین

صحابہ کرامؓ کی ایک قابل قدر تعداد تفسیر قرآن میں مشہور تھی۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے ان میں خلفاء اربعہ کو بھی شامل کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پہلے تین خلفاء امور خلافت میں مصروف رہے جس کی وجہ سے ان کی تفسیری روایات زیادہ نہیں نیز دیگر مفسر صحابہ بھی موجود تھے۔ اہم مفسر صحابہ میں سیدنا عبداللہ بن عباسؓ، سیدنا علیؓ، سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ، سیدنا ابی بن کعبؓ، اور تابعین میں مجاہدؒ، عکرمہؒ، قتادۃؒ، سعید بن جبیرؒ، وغیرہ ہیں۔ ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

خلیفہ راشد سیدنا علی کرم اللہ وجہہ رسول اکرم ﷺ کے چچازاد ہیں۔ بعثت سے دس سال پہلے پیدا ہوئے۔ آپ ﷺ نے قرابت داری کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے عیالدار چچا سے سیدنا علیؓ کو ان کے بچپن میں ہی اپنی پرورش میں لے لیا تھا۔ پھر ان سے اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کر دی۔ سب سے پہلے بچے تھے جو آپ ﷺ کے گھر والوں میں آپ ﷺ پر ایمان لائے تھے۔ سیدنا علیؓ کی کنیت ابوتراب اور ابوالحسن تھی۔ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شرکت کی اور اکثر غزوات میں جھنڈا انہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ آپ ﷺ نے انہیں گھر کی دیکھ بھال کے لئے غزوہ تبوک میں جانے سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے روکا: أَمَا تَرْضَى أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مُوسَى إِلا أَنَّهُ لاَ نَبِيَّ بَعْدِي (صحیح بخاری:۲۲۱۸)۔

کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہوتے کہ تم میرے لئے ایسے بن جاؤ جیسے ہارون علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے لئے تھے بس فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

دو گروپ ان کی دیندار شخصیت، قرابت داری رسول کی وجہ سے فتنے کا شکار ہو گئے ہیں۔ ناصبی اور روافض۔ ناصبیوں۔۔ عبداللہ بن اِباض کی طرف منسوب۔۔ نے ان کی مخالفت پر قسم کھا رکھی ہے اور ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ان کے مناقب کو بیان ہی نہ کریں۔ انہوں نے اپنے مخالف اہل قبلہ کو کافر کہا اور مرتکب کبیرہ کو موحد نہ کہ مومن۔ کیونکہ اعمال ایمان میں داخل ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی بھی تکفیر کرتے ہیں۔ دوسری طرف روافض ان سے اپنی مزعومہ محبت میں غلو کا شکار ہیں جنہوں نے ان کے بارے میں ایسی باتیں گھڑلی ہیں جن کی سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کو ضرورت ہی نہیں۔ اگر غور کیا جائے تو یہ باتیں ان کے مناقب نہیں بلکہ مثالب ہیں۔ اہل سنت کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں غلو سے پاک بڑا معتدل نکتہ نظر ہے۔

شجاعت، پاکیزگی نفس اور علمی ذکاء میں لاثانی تھے۔ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے، امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بعض بڑے مشکل فیصلوں سے کنارہ کشی اختیار کرتے۔ جیسے نحوی کسی لاینحل گرامر کے مسئلے میں کہا کرتے ہیں: قَضِيَّةٌ وَلاَ أَبَاحَسَنٍ لَهَا۔ یہ تو ایسا مسئلہ ہے جس کے لئے کوئی ابوالحسن نہیں۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے ہی مروی ہے۔ فرماتے ہیں: لوگو! کتاب اللہ کے بارے میں مجھ سے پوچھ لو، بخدا کوئی آیت ایسی نہیں جسے میں نہ جانتا ہوں کہ وہ رات کو اتری یا دن کو۔ سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں: جب ہمیں علی رضی اللہ عنہ کی Stamped بات مل جاتی تو ہم پھر اس سے نکلتے نہیں تھے۔ یہ بھی ان کا ایک قول بیان کیا جاتا ہے کہ میں نے جو کچھ بھی تفسیر قرآن کا علم حاصل کیا ہے وہ بھی سیدنا علیؓ سے ہی سیکھا ہے۔ اس شوری کے ممبر تھے جنہیں امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کی تعیین کے لئے تجویز کیا تھا۔ انہیں خلیفہ بننے کی آفر سیدنا عبد الرحمن بن عوفؓ نے کی مگر چند شروط کی وجہ سے وہ اسے قبول نہ کرسکے۔ پھر سیدنا عثمانؓ کی بیعت ہوئی جن کی سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر صحابہ کرامؓ نے بھی بیعت کی۔ پھر شہادت عثمانؓ کے بعد ان کی بیعت ہوئی۔ کوفہ میں ۱۷ رمضان سن ۴۰ ہجری کو شہید کردئے گئے۔ تین مشہور اسانید کے ذریعے سیدنا علی کی تفسیری روایات قابل اعتماد ہیں۔

۱۔ ہشام، محمد بن سیرین سے، وہ عَبِیْدہ السلمانی سے اور وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے۔ یہ وہ روایات ہیں جنہیں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بیان فرمایا ہے۔

۲۔ ابن ابی الحسین، ابوالطفیل سے، وہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے۔ اس سند کی روایات بھی صحیح ہیں جنہیں امام سفیان بن عیینہ نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

۳۔ ازہری، علی بن زین العابدین سے، وہ اپنے والد حسین سے، یہ سند بہت ہی صحیح تھی مگر زین العابدین سے بہت سے دیگر ضعفاء اور کذاب لوگوں نے روایت کرکے اس کی اصل شکل کو مسخ کردیا ہے۔

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

آپ عبد اللہ بن مسعود بن غافل، ہذیل قبیلے سے ہیں آپؓ کی والدہ ام عبد کے نام سے مشہور صحابیہ ہیں کبھی کبھی ان کی طرف بھی منسوب کئے جاتے ہیں۔ سابقین اسلام میں چھٹے فرد تھے۔ دو ہجرتیں کیں، بدر میں حاضر تھے اور بعد کی غزوات میں بھی۔

انہوں نے رسول اکرم ﷺ سے خود ستر سے زائد قرآنی سورتوں کو سیکھا۔ آپ ﷺ نے انہیں شروع اسلام میں فرمادیا تھا: **إنك غلام معلّم**۔ تم تو سیکھے سکھائے لڑکے ہو۔ (مسند احمد: ۱/ ۳۷۹، ۴۶۲) آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: جو یہ چاہتا ہے کہ قرآن کو اس تازگی کے ساتھ سیکھے جس طرح قرآن اترا ہے تو وہ ابن ام عبد کی قراءت سے سیکھ لے۔ (ابن ماجہ: ۱۳۸)

صحیح بخاری (۵۰۰۰) میں ہے ابن ؓمسعود نے فرمایا: اصحابؓ رسول کو یہ علم ہے کہ میں کتاب اللہ کے بارے میں سب سے زیادہ جانتا ہوں بخدا! جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، کتاب اللہ کی کوئی ایسی نازل کردہ سورۃ نہیں جسے میں نہ جانتا ہوں کہ کہاں اتری، اور نہ ہی کوئی ایسی آیت ہے جسے میں نہ جانتا ہوں کہ کس کے بارے میں اتری۔ اگر میں کسی کے بارے میں یہ جان لوں کہ وہ کتاب اللہ کا علم مجھ سے زیادہ رکھتا ہے تو میں اونٹ پر سوار ہو کر بھی اس کے پاس جانا پڑے تو جاؤں گا۔

ابن ؓمسعود ان لوگوں میں سے تھے جو رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ آپ ﷺ کے نعل مبارک، وضوء کے پانی کا برتن اور تکیہ وغیرہ اٹھانے والے خدمت گاروں میں سے تھے۔ ابو موسیٰ ؓاشعری فرماتے ہیں: میں اور میرا بھائی ہم دونوں یمن سے آئے۔ تھوڑی دیر ہم مسجد میں ٹھہرے۔ ہم نے دیکھا جس طرح ابن ؓمسعود اور ان کی والدہ بیت رسول ﷺ میں آجارہے تھے ہمیں تو یوں محسوس ہوا کہ ابن ؓمسعود اہل بیت میں سے ہیں۔ (صحیح بخاری: ۲۴۶۰)

سیدنا عمرؓ بن خطاب نے انہیں کوفہ بھیجا تا کہ اہل کوفہ کو دینی امور کی تعلیم دیں اور یہ لکھا:

وَقَدْ آثَرْتُكُمْ بِعَبْدِ اللهِ عَلَى نَفْسِي۔ عبد اللہ کو اپنے سے زیادہ تمہیں ترجیح دی ہے۔۔ ساتھ ہی سیدنا عمارؓ کو ان کا گورنر بنا کر روانہ کیا اور فرمایا: یہ دونوں اصحاب محمد ﷺ میں سے چنے ہوئے لوگ ہیں ان کا کہنا ماننا اور اقتداء کرنا۔ پھر سیدنا عثمانؓ نے ابن مسعودؓ کو کوفہ کا گورنر بنایا، پھر انہیں سبکدوش کر کے فرمایا کہ آپ واپس مدینہ آجائیں۔ باقی عمر انہوں نے وہیں گذاری۔ سن ۳۲ ہجری کو ستر سال سے زائد کی عمر میں فوت ہوئے اور بقیع میں ان کی تدفین ہوئی۔

بہت سی تفسیری روایات منقول ہیں جن کی تعداد سیدنا علیؓ کی مرویات سے زیادہ ہے۔ ان کی وہی روایت زیادہ قابل اعتماد ہیں جو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری میں بیان فرمائی ہیں۔ مشہور تابعی مسروق بن الاجدعؒ فرماتے ہیں: سیدنا عبد اللہ بن مسعودؓ ہمارے سامنے ایک سورت پڑھتے اور دن کا بیشتر حصہ اس کی تفسیر میں اور اس کے بارے میں احادیث بیان کرنے میں صرف فرمادیتے تھے"۔

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی طرح یہ بھی رسول اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی ہیں۔ ہجرت سے تین سال قبل پیدا ہوئے۔ رسول اکرم ﷺ کی صحبت کو بچپن سے ہی انہوں نے تھاما۔ ان کی پھوپھی سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا امہات المومنین میں سے تھیں۔ رسول اکرم ﷺ نے ایک بار انہیں اپنے سینے سے لگایا اور دعا فرمائی: اللھم عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ۔ اے اللہ! اسے حکمت سکھادے۔ ایک روایت میں حکمت کی جگہ الکتاب کے لفظ آئے ہیں۔ (صحیح بخاری: ۳۷۵۶) آپ ﷺ نے انہیں ایک بار یہ دعا بھی دی جب وہ آپ ﷺ کے لئے وضوء کا پانی رکھ رہے تھے اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ (صحیح بخاری: ۱۴۳)

اس دعا کی برکت سے تفسیر وحدیث کو سکھانے اور پھیلانے کی وجہ سے امت کے حبر (عالم) کہلائے۔ اللہ تعالی نے انہیں علم کا شوق دے دیا، جس کی طلب میں انہوں نے ہمت وکوشش کی اور اس راہ میں آنے والی تکلیف پر صبر کیا۔ اس طرح انہیں ایک ایسا علمی مقام ومرتبہ حاصل ہو گیا کہ سیدنا امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ اپنی مجالس میں بٹھاتے اور ان کی رائے لیا کرتے۔ مہاجر صحابہؓ عرض کرتے آپ ہمارے بیٹوں کو کیوں نہیں اجازت دیتے؟ انہیں فرماتے: ذَاكُمْ فَتَى الْكُهُولِ، لَهُ لِسَانٌ سَؤُولٌ، وَقَلْبٌ عَقُولٌ۔ یہ پختہ نوجوان ہے اس کی زبان علم میں بہتی ہے اور دل بڑا سمجھدار ہے۔ پھر انہیں ایک روز بلوایا ابنؓ عباس کو بھی بٹھایا تاکہ انہیں بتائیں کہ میں نے ابنؓ عباس میں کیا دیکھا ہے؟ سیدنا عمرؓ نے اہل مجلس سے پوچھا: اس سورت کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ {إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ} (النصر: ۱) حتی کہ تمام سورت ختم کی۔ کسی نے کہا: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جب اللہ تعالی ہمیں فتح نصیب فرمائے تو ہم اللہ تعالی کی حمد کریں اور استغفار کریں۔ اور کچھ خاموش رہے۔ سیدنا عمرؓ نے ابن عباسؓ سے فرمایا: کیا ان کا کہنا درست ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ پھر تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا: یہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر ہے جو اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو بتادی کہ جب فتح مکہ ہو جائے تو یہ علامت ہے آپ ﷺ کے آخری وقت کے قریب ہونے کی۔ لہذا حمد وتسبیح میں آپ مشغول ہو جایئے اور استغفار کیجئے۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا: میں بھی وہی جانتا ہوں جو تم جانتے ہو۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ انہیں فرمایا کرتے:

إِنَّكَ لأَصْبَحُ فِتْيَانِنَا وَجْهاً، وَأَحْسَنُهُمْ خُلُقاً، وَأَفْقَهُهُمْ فِي كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالَى۔ تم ہمارے جوانوں میں زیادہ بارونق چہرے والے ہو، اخلاق میں سب سے بہترین ہو اور کتاب اللہ کے بارے میں سب نوجوانوں سے بڑھ کر فقیہ ہو۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لَنِعْمَ تَرْجُمَانُ الْقُرآنِ اِبْنُ عَبَّاسٍ، لَو أَدْرَكَ أَسْنَانَنَا مَا عَاشَرَهُ مِنَّا أَحَدٌ۔: قرآن کے کتنے بہترین ترجمان ہیں اگر وہ ہماری عمر پالیں تو ہم میں کوئی بھی ان کے ہم مثل نہ ہو۔

اس قول کے بعد وہ چھتیس سال زندہ رہے۔ بعد میں انہوں نے کتنا علم حاصل کیا اور بڑھایا ہو گا؟ ابووائل کہتے ہیں: سیدنا عثمان ذوالنورین نے انہیں سن ۳۵ھ میں موسم حج کا نگران مقرر فرمایا۔ وہاں انہوں نے سورہ نور یا بقرۃ کو پڑھا پھر اس کی ایسی تفسیر فرمائی کہ مجھے خیال آیا ایسی تفسیر میں نے کبھی بھی ان سے نہیں سنی اگر اسے اہل فارس، رومی یا ترک سن لیں تو وہ بھی اسلام لے آئیں۔

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے انہیں بصرہ کا گورنر مقرر کیا۔ جب ان کی شہادت ہوئی تو یہ سب کچھ چھوڑ کر حجاز واپس آ گئے اور مکہ میں رہنے لگے۔ پھر وہاں سے طائف تشریف لائے جہاں سن ۶۸ھ میں اکہتر سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباسؓ کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے:

جب رسول اکرم ﷺ فوت ہو گئے تو میں نے ایک انصاری دوست سے کہا: آؤ! بزرگ صحابہ سے ہم کچھ علم حاصل کر لیں۔ اس نے مجھے کہا: **يَا عَجَباً لَّكَ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ! أَتَرَى النَّاسَ يَفْتَقِرُونَ إِلَيْكَ وَفِي النَّاسِ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ ﷺ مَنْ فِيهِم** ! بڑی عجیب بات ہے ابن عباس! آپ کیا سمجھتے ہیں صحابہ کی اتنی بڑی تعداد کے ہوتے ہوئے لوگ آپ کے ضرورت مند ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا اور خود اصحاب رسول کے پاس آنے جانے لگا۔ اگر مجھے کسی صحابی کے بارے میں معلوم ہوتا کہ ان کے پاس حدیث رسول ہے تو میں ان کے دروازے پر آتا اور وہ قیلولہ کر رہے ہوتے تو اپنی چادر لپیٹ کر دروازے پر بیٹھ جاتا۔ اس دوران ہوا اپنی مٹی اٹھا اٹھا کر مجھ پر بکھیرتی۔ وہ جب باہر نکلتے اور مجھے اس حال میں دیکھتے تو کہتے: اوہ! ارسول اللہ کے چچازاد آپ؟ خیریت! کیسے آپ آئے؟ کیوں نہ آپ نے مجھے بلوا لیا ہوتا؟ میں کہتا: نہیں۔ ضرورت مند میں ہوں اس لئے مجھے آنا چاہئے۔ پھر میں ان سے حدیث کے بارے میں پوچھتا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

فَعَاشَ هَذَا الرَّجُلُ الأنصَارِى حَتّٰى رَآنِي وَقَدِ اجْتَمَعَ حَوْلِي النَّاسُ يَسْأَلُونِّي، فَيَقُول: هَذَا الفَتَى كَانَ أَعْقَلُ مِنِّي۔

یہ انصاری صحابی زندہ رہے۔ حتی کہ انہوں نے مجھے اس حالت میں دیکھا کہ لوگ میرے ارد گرد بیٹھے علم پوچھ رہے ہیں تو یہ کہا کرتا: یہ اللہ کا بندہ مجھ سے زیادہ عقل مند تھا۔

سیدنا ابن عباسؓ کو تفسیر قرآن میں امام المفسرین ہونے کا امتیازی مقام حاصل ہے۔ اس لئے کہ سب سے زیادہ تفسیر اقوال انہی سے مروی ہیں۔ ان میں ایک بڑا حصہ ضعیف ہے جن کا جانچنا نہایت ضروری ہے۔

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ

سیدنا ابی بن کعبؓ انصاری خزرجی صحابی ہیں۔ ستر انصار کے ساتھ بیعت عقبہ ثانیہ میں حاضر ہوئے تھے۔ کاتب وحی بھی تھے آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو انہوں نے آپ ﷺ سے پڑھنا، سننا اور اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ علم، ورع اور زہد میں اپنی مثال آپ تھے۔ ابن سعد کہتے ہیں: رسول اکرم ﷺ نے ایک بار ابی کو بلوایا اور فرمایا:

أَنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالىٰ أَمَرَنِي أَنْ أَقْرَأَ عَلَيْكَ، قَالَ: آللّٰهُ سَمَّانِي لَكَ؟ قَالَ: اَللّٰهُ سَمَّاكَ لِي، فَجَعَلَ أُبَيٌّ يَبْكِي۔

اللہ تعالی نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھ پر قرآن پڑھوں۔ انہوں نے عرض کی: کیا اللہ تعالی نے میرا نام لیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جی ہاں! اللہ تعالی نے مجھے تمہارا نام لے کر کہا ہے۔ ابی اس بات کو سن کر رونے لگے۔

مسروق کہتے ہیں: سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مجلس مشاورت میں چھ لوگ ہوا کرتے۔ ان میں علی، عبد اللہ، ابی، ابو موسیٰ اور زید رضی اللہ عنہم خود ان سمیت شامل تھے۔ سیدنا فاروق اعظم نے ان کا نام سید المسلمین رکھا ہوا تھا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں قرآن مجید جمع کرنے کا حکم دیا تھا۔

وحی لکھنے کے بعد یہ ضرور رسول اللہ ﷺ سے ان آیات کے بارے میں سوالات کرتے اس طرح آپ ﷺ کی تفسیر کے بڑے اہم مفسر تھے۔ آپؓ پہلے مفسر ہیں جن کی تفسیر کتابی صورت میں مرتب ہوئی۔ (الاتقان) مدینہ منورہ میں سن ۳۶ھ کو انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

مکی تابعی مفسر زیادہ تر سیدنا ابن عباسؓ کے شاگرد ہیں اس لئے وہ انہی کی تفسیر کو بیان کرتے ہیں۔ ان میں عکرمہ، مجاہد، عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ شامل ہیں۔ مگر تابعین میں ابو العالیہ رفیع بن مہران الریاحی، محمد بن کعب القرظی، علقمہ بن قیس، مسروق بن اجدع اور عامر شعبی رحمہم اللہ خاصے مشہور مفسرین ہیں۔

مجاہد بن جبر رحمہ اللہ

یہ مشہور تابعی سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ کے شاگرد ہیں۔ قتادہؒ ان کے بارے میں کہتے ہیں: "تفسیر کے جو علماء باقی ہیں ان میں مجاہد سب سے بڑے عالم ہیں"۔ مجاہد کہتے ہیں:

عَرَضْتُ الْمُصْحَفَ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ ثَلاَثَ عَرَضَاتٍ مِنْ فَاتِحَتِهِ إِلىٰ خَاتِمَتِهِ، أُوْقِفُهُ كُلَّ آيَةٍ مِنْهُ وَأَسْأَلُهُ عَنْهَا۔۔ مَا فِي الْقُرآنِ آيَةٌ إِلاَّ وَقَدْ سَمِعْتُ فِيْهَا شَيْئاً۔

میں نے شروع تا آخر قرآن مجید کو ابنؓ عباس سے تین بار پڑھا ہر آیت پر میں رکتا اور اس کے بارے میں ان سے سوال کرتا۔۔ قرآن کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں میں نے کچھ نہ کچھ سنا نہ ہو۔

ابن ؒملیکہ کہتے ہیں:

رَأَيْتُ مُجَاهِداً سَأَلَ ابْنَ عَبَّاسٍ عَنْ تَفْسِيْرِ الْقُرآنِ وَمَعَهُ أَلْوَاحُهُ، قَالَ: فَيَقُوْلُ لَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ: أُكْتُبْ۔ حَتّٰى سَأَلَهُ عَنِ التَّفْسِيْرِ كُلِّهٖ۔

میں نے مجاہد کو دیکھا وہ ابن عباس سے تفسیری سوال کررہے تھے ان کے پاس تختیاں تھیں۔ ابن ؓعباس انہیں کہتے جاتے: لکھو۔ یہاں تک کہ انہوں نے سبھی تفسیر کے بارے میں پوچھا۔ وَلِهَذَا كَانَ سُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ يَقُوْلُ: إِذَا جَاءَكَ التَّفْسِيْرُ عَنْ مُجَاهِدٍ فَحَسْبُكَ بِهِ وَأَمَّا التَّأْوِيْلُ فَشَأْنٌ آخَرُ۔ (الفتاوی الکبری ۷/ ۱۵۲)

اسی لئے سفیان ثوری کہا کرتے: جب تمہارے پاس مجاہد سے تفسیر آجائے تو اسے کافی سمجھو۔ رہی تاویل تو اس کا معاملہ پھر کچھ اور ہے۔

امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ نے ان کی تفسیر پر خاصا اعتماد کرکے اسے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ امت، مجاہد کی امامت اور ان سے دلیل لینے پر متفق ہے۔ مکہ میں نماز کے دوران حالت سجدہ میں ان کا انتقال سن ۱۰۰ھ میں تراسی سال کی عمر میں ہوا۔

قتادۃ رحمہ اللہ:

ان کا پورا نام قتادہ بن دعامہ سدوسی بصری ہے۔ سن اکسٹھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی نابینا تھے۔ علم کے حصول کے لئے سخت محنت کی، حافظہ بڑا قوی تھا۔ کہا کرتے: میں نے کبھی بات کرنے والے سے یہ نہیں کہا: ذرا دوبارہ سناؤ۔ میرے کانوں نے کوئی بھی بات سنی ہو تو میں اسے کبھی بھولا نہیں۔ امام احمدؒ بن حنبل نے ان کا تذکرہ بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور انہی کے علم، فقہ، معرفت اختلاف حدیث اور تفسیر کو بخوبی پھیلایا ہے اور انہیں حافظ وفقیہ کہا ہے۔ نیز لکھا ہے: شاذ ہی آپ ان سے بڑھا ہوا کسی کو پائیں گے۔ بصرہ کے بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ واسط میں ان کا انتقال سن ۱۱۷ھ میں چھپن سال کی عمر میں ہوا۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ

مشہور تابعی ہیں۔ سن ۴۵ھ میں پیدا ہوئے۔ حبشی تھے۔ فقہ و تفسیر کو انہوں نے صحابہ کرامؓ سے حاصل کیا۔ خصیف کہتے ہیں: تابعین میں طلاق کے مسائل کو سب سے زیادہ سعید بن المسیبؒ جانتے تھے، حج کے عطاء بن رباح، حلال و حرام کو طاؤس، تفسیر کو مجاہد بن جبر اور ان سب کے علم کے جامع سعید بن جبیرؒ تھے۔ سن ۹۵ھ کو حجاج نے انہیں شہید کر دیا۔

انہوں نے ابن عباسؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، عبد اللہ بن زبیرؓ، انسؓ اور ابو مسعود البدریؓ جیسے صحابہ سے استفادہ کیا ہے۔ سفیان ثوریؒ کہا کرتے: تفسیر کو چار علماء سے سیکھا کرو۔ سعید بن جبیرؒ، مجاہدؒ، عکرمہؒ اور ضحاکؒ سے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک بار اہل کوفہ سے فرمایا: تم مجھ سے سوال کیا کرتے ہو جب کہ تم میں سعید بن جبیرؒ جیسے علماء موجود ہیں۔ انہوں نے خلیفہ عبد الملک بن مروان کی فرمائش پر ایک تفسیر بھی لکھی تھی۔

(تہذیب التہذیب ۷/۱۹۸)

عکرمہ رحمہ اللہ

یہ بھی مشہور تابعی اور ابن عباسؓ کے مولی (آزاد کردہ غلام) تھے۔ سیدنا ابنؓ عباس نے انہیں نہایت محنت و شفقت سے تعلیم دی تھی۔ آپؒ نے ابن عباسؓ کے علاوہ دیگر صحابہؓ سے بھی استفادہ کیا ہے جن میں سیدنا علیؓ، سیدنا ابو ہریرہؓ، ابو سعید خدریؓ، امیر معاویہ رضی اللہ عنہم اور بعض دوسرے صحابہؓ شامل ہیں۔

تفسیر ابن جریر

اس کا پورا نام "جَامِعُ الْبَيَانِ فِي عُلُومِ الْقُرْآنِ" ہے۔ اور مصنف ابن جریر طبریؒ (۲۲۴۔۳۱۰ھ) ہیں۔ طبرستان کے شہر آمل میں پیدا ہوئے اور بغداد میں ان کا انتقال ہوا۔ عالم قراءات، امام تفسیر، ماہر حدیث، اور مورخین کے استاذ تھے۔ فقہ میں بھی ایک مستقل مذہب، اقوال اور اپنے منتخبات رکھتے تھے۔ ان کے بھی اتباع اور مقلد پائے جاتے ہیں۔ (طبقات المفسرین از سیوطی: ۹۶) امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں: مَا أَعْلَمُ عَلَى أَدِيمِ الأَرْضِ أَعْلَمُ مِنْ مُحَمَّدِ بْنِ جَرِيرٍ۔ محمد بن جریر سے بڑھ کر میں اس زمیں پر کوئی عالم نہیں جانتا۔ (طبقات المفسرین از داؤدی ۲/۱۱۱)۔ ان کی بے شمار تصانیف ہیں جن میں کتاب القراءات، تاریخ الرجال فی الصحابۃ والتابعین، لَطِيفُ الْقَوْلِ جس میں وہ اپنی پسندیدہ منتخبات کا ذکر کرتے ہیں جو ان کا مذہب ہیں۔ اسی طرح تہذیب الآثار اور انتہائی اہم کتاب تاریخُ الأُمَمِ وَالْمُلُوكِ وَأَخْبَارِهِمْ ہے۔

غالباً ان کی یہ تفسیر اولین کتاب ہے جو ماثور طریقے پر لکھی گئی۔ مفسرین آج بھی ان کی تفسیر کے خوشہ چیں ہیں۔ اس تفسیر کے چند محاسن یہ ہیں:

۱۔اپنی تفسیر میں وہ زیادہ تر اعتماد احادیث رسول، اقوال صحابہ اور تابعین پر کرتے ہیں۔

۲۔جو روایت بیان کرتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے وہ اسے سنداً بیان کریں۔

۳۔اقوال علماء کی طرف راہنمائی کرتے ہیں اور ترجیح بھی دیتے ہیں۔

۴۔وجوہ اعراب یعنی گرامر صرف ونحو کو بھی خوب بیان کرتے ہیں۔

۵۔آیات سے شرعی احکام کا استنباط بھی بہت باریکی سے کرتے ہیں۔

چند ضعیف روایات کے باوجود بھی یہ ایک جامع کتاب ہے۔یہ کتاب کچھ عرصہ قبل حائل کے ایک شیخ حمود بن عبید الرشید کے مکتبہ سے دستیاب ہوئی اور شیخ محمود شاکر رحمہ اللہ کی تحقیق اور تعلیق سے سورہ ابراہیم کی آیت ۲۷ تک ہوئی جو بعد میں ڈاکٹر عبد اللہ عبد المحسن ترکی کی تحقیق سے ۲۶ جلدوں میں طبع ہو سکی۔علماء نے اس کتاب کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔خطیب بغدادیؒ اور امام ذہبیؒ فرماتے ہیں:لَهُ كِتَابُ التَّفْسِيرِ لَمْ يُصَنِّفْ أَحَدٌ مِثْلَهُ۔ان کی بے مثال تفسیر ہے اس جیسی کوئی نہ لکھ سکا۔امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

جو تفاسیر آج عوام وخواص کے پاس ہیں ان میں صحیح ترین تفسیر ابن جریر الطبری کی ہے کیونکہ وہ اپنی تفسیر میں علماء سلف کے اقوال ثابت شدہ اسانید سے ذکر کرتے ہیں اس کتاب میں کوئی بدعت نہیں اور نہ ہی یہ متہم لوگوں سے روایت کرتے ہیں۔(مجموع الفتاوی ۱۳/ ۳۸۵)

تفسیر کبیر

اس کا اصل نام "مفاتیح الغیب" ہے۔۱۶ بڑی جلدوں میں یہ تفسیر ۳۲ اجزاء کی کتاب ہے۔اس کے مصنف امام رازی(م ۶۰۶ھ)ہیں۔رازیؒ معقول و منقول دونوں کے ماہر تھے۔حاذق طبیب بھی تھے۔تفسیر بالرائے میں انتہائی جامع اور بے مثال تفسیر ہے۔امام رازیؒ اپنی تفسیر صرف سورۃ الانبیاء تک لکھ سکے۔ان کے شاگرد رشید خُوَیّ نے اسے مکمل کرنا چاہا تو وہ بھی نہ کر سکے۔ایک رائے یہ بھی ہے کہ نجم الدین قمولی نے آخر میں اسے مکمل کیا۔مگر لطف کی بات یہ ہے کہ ان سب کے اسلوب میں ذرہ برابر فرق نہیں لگتا۔اس تفسیر میں امام رازیؒ نے قرآن مجید کے انداز بیان، اس کی شان وشوکت اور ہر آیت سے متعلق فقہی احکام کو تفصیلی دلائل کے ساتھ نقل کیا ہے۔آیتوں کے درمیان موجود ربط و نظم کو بھی انتہائی دلنشیں انداز سے پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ان خصوصیات کی بناء پر تفسیر کبیر ایک انتہائی جامع تفسیر ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب علم کلام کی قیل و قال کا خزینہ ہے اس کے شیدائی حضرات ہی اس کتاب کی قدر و قیمت جانتے ہیں مگر کیا یہ بحثیں قرآن حکیم کو سمجھنے کے لئے مفید ہیں؟۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ابو حیانؒ البحر المحیط میں لکھتے ہیں کہ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں بہت سی چیزیں درج کر دیں جن کی تفسیر میں قطعاً ضرورت نہ تھی۔ اس لئے بعض علماء نے اس پر نقد کرتے ہوئے یہاں تک کہا ہے۔ "فِيْهِ كُلُّ شَيْءٍ إِلاَّ التَّفْسِيْرُ"۔ اس تفسیر میں سب کچھ ہے مگر تفسیر نہیں۔

علم کلام میں ان کے انہماک نے بعد از زمانہ اس ندامت کا اظہار بھی کروایا: لَيْتَنِي لَمْ أَشْتَغِلْ بِعِلْمِ الْكَلَامِ۔ کاش میں علم کلام میں اپنا شغل نہ ہی رکھتا۔ (طبقات المفسرین از داؤدی۔ ۱/ ۲۱۵)

تفسیر قرطبیؒ

اس کا پورا نام "الجامعُ لِأَحْكَامِ القُرآنِ" ہے۔ یہ علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد ابی بکر بن فرح القرطبیؒ کی تصنیف ہے جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا بنیادی موضوع آیات احکام سے فقہی احکام و مسائل کا استنباط کرنا ہے۔ مصنف نے آیات کی تشریح، مشکل الفاظ کی تحقیق، بلاغت و فصاحت، فقہی استدلال اور متعلقہ روایات کو جمع کیا ہے۔ اپنے شیخ محترم امام ابن العربیؒ القرطبی کی تفسیر کے تمام اہم علمی وفقہی نکات کو انہوں نے اپنی اس کتاب میں سمو دیا ہے۔ روز مرہ زندگی کے لئے قرآن کریم سے جو ہدایات ملتی ہیں انہیں بھی اچھی طرح واضح فرمایا ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ نہایت مفصل اور علوم القرآن کے اہم مباحث پر مشتمل ہے۔ اردو یا عربی کی بیشتر تفاسیر اسی تفسیر کی مرہون منت ہیں۔

تفسیر ابن کثیرؒ

اس کے مصنف حافظ عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن الخطیب ابو حفص عمر بن کثیرؒ ہیں۔ یہ تفسیر چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ابن کثیرؒ مفسر بھی ہیں اور جلیل القدر محدث بھی۔ انہوں نے کوشش کی کہ آیت کو ذکر کر کے بہت ہی سہل اور مختصر عبارت میں تفسیر کریں۔ اسی مقام پر اس سے متعلق دیگر آیات کو بھی جمع کر دیں۔ ان کا آپس میں مقارنہ کریں۔ اس طرح تفسیر کرتے وقت وہ ایک ہی معنی کی آیات کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ پھر ان مرفوع احادیث کو اس تفسیر میں بیان کرتے ہیں جن کا تعلق اس آیت سے ہو سکتا ہے۔ ان کے بعد اقوال صحابہ و تابعین اور علماء سلف کو پیش کرتے ہیں۔ اپنی اس تفسیر میں وہ اسرائیلی منکر روایات کو کہیں اجمال سے اور کہیں تفصیل سے بیان کر کے قاری کو متنبہ کر دیتے ہیں۔ کوشش یہ بھی کی ہے کہ تفسیر میں ضعیف اور موضوع روایات کو چھانٹ کر الگ کر دیں۔ جہاں مؤلف نے ضرورت محسوس کی وہاں جرح و تعدیل جیسے اصول حدیث بھی منطبق کئے ہیں۔ اسرائیلیات کے بارے میں بھی ان کا طرز عمل نہایت محتاط، صاف ستھرا اور قرآن و سنت کے مطابق ہے۔ اس تفسیر میں حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر بالروایہ کا طریقہ اپنا کر اپنی جلالت حدیث کو خوب نمایاں کیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اس تفسیر میں درج ہر روایت درست ہے بلکہ

اس میں صحیح بھی ہے حسن اور ضعیف بھی۔ اس کی احادیث کی تخریج ہو گئی ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت کو مزید نکھر گئی ہے۔ بہر کیف تفسیر ابن کثیر، تفسیر ابن جریر کے بعد دیگر تفاسیر کی نسبت زیادہ محتاط اور مستند تفسیر ہے۔

تفسیر روح المعانی

اس کا پورا نام "رُوحُ الْمَعَانِي تَفْسِيْرُ الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ الْمَثَانِي" ہے۔ اور یہ علامہ محمد آلوسی حنفیؒ کی تصنیف ہے۔ تیس جلدوں پر مشتمل یہ ضخیم تفسیر بالکل آخری دور کی تصنیف ہے۔ سابقہ تفاسیر کے اہم مباحث کو اپنی اس تفسیر میں جمع کرنے کی انہوں نے کوشش کی ہے۔ روایت حدیث میں بھی علامہ آلوسیؒ دوسرے مفسرین کے مقابلے میں محتاط رہے ہیں۔

تفسیر الکشاف

اس کے مولف جار اللہ محمود بن عمر زمخشری (۴۶۷۔۵۳۸ھ) ہیں۔ بہت سے مشائخ سے علم حاصل کیا اور ائمہ لغت و تفسیر میں ان کا شمار ہوا۔ تفسیر میں قرآنی اعجاز کی وجوہ کو، قرآن کے نظمی جمال اور بلاغت کو بغیر کسی زائد از ضرورت بات میں انتہائی عمدگی سے کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسرائیلیات کا ذکر بھی شاذونادر کرتے ہیں۔ حدیث رسول سے بہت کم استشہاد لیتے ہیں بلکہ کبھی کبھار موضوع احادیث کو بالخصوص فضائل سور میں بیان کرتے ہیں۔

اپنی تفسیر میں انہوں نے جابجا معتزلی عقائد کو بڑی شدومد سے بطور استشہاد پیش کیا ہے۔ آیات کی تاویل بھی انہی کے موافق کی ہے۔ اس اعتزال کو انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اپنی تفسیر میں اس طرح پرویا ہے کہ کوئی حاذق ہی اسے سمجھ پاتا ہے۔ امام بلقینی رحمہ اللہ کو کہنا پڑا: اِسْتَخْرَجْتُ مِنَ الْکَشّافِ اِعْتِزَالاً بِالْمَنَاقِيْشِ۔ میں نے کشاف میں اعتزال کو بے شمار بحثوں کے بعد طشت از بام کیا ہے۔ اہل السنۃ پر اپنا غیض وغضب خوب ڈھاتے ہیں اور حقارت آمیز لفظوں میں ان پر پھبتیاں کستے ہیں۔ (التفسیر والمفسرون از ذہبی ۱/۴۶۵)۔ اسی بناء بہت سے علماء نے وقت مطالعہ ان کی تفسیر سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ میزان الاعتدال ۵/۲۰۳) میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

محمودُبنُ عُمَرَ الزَّمَخْشَرِيُّ الْمُفَسِّرُ النَّحْوِيُّ صَالِحٌ لٰكِنَّهُ دَعَا إِلَى الاِعْتِزَالِ أَجَارَنَا اللهُ، فَكُنْ حَذِرًا مِنْ كَشَّافِهِ۔ محمود بن عمر زمخشری جو مفسر، نحوی اور صالح ہیں مگر اس جار اللہ نے اپنی تفسیر میں اعتزال کی دعوت دی اللہ تعالی ہمیں اس سے بچائے لہذا اس کی تفسیر کشاف تفسیر سے ہوشیار رہنا۔

اہم مفسرین کے نام مع تاریخ وفات

جب اہم مفسرین کا ذکر آتا ہے توسب سے پہلے قرن اول یعنی صحابہ و تابعین کا ذکر ضروری ہوتا ہے۔

لہٰذا سب سے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اہم مفسرین کے نام آتے ہیں اوران میں سے بھی پہلے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ ہیں جو مفسر اول کے نام سے جانے جاتے ہیں اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے نام سے جو تفسیر فی زمانہ منظر عام پر آئی ہے تنویر المقیاس فی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ حتی کہ اسکا اردو ترجمہ بھی شائع ہو گیا؛لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف اس کی نسبت درست نہیں مانی گئی ہے؛کیونکہ یہ کتاب "محمد بن مروان السدّی عن محمد بن السائب الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ" کی سند سے مروی ہے اوراس سلسلہ سند کو محدثین نے سلسلۃ الکذب قرار دیا ہے۔

(دیکھئے الاتقان:۱۸۸/۲)

بہر حال قرن اول کے مفسرین میں پہلا نام حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے تاریخ وفات سنہ ۶۸ھ۔

دوسرا نام حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ وفات سنہ ۴۰ھ۔

پہلے تین خلفاء کی نسبت حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے تفسیری روایات زیادہ مروی ہیں؛چنانچہ علامہ ابو الطفیل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اپنے خطبے میں یوں فرمایا کہ لوگو!مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں سوالات کیا کرو؛کیونکہ قسم خدا کی قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں مجھے معلونہ ہو کہ یہ آیت رات کو نازل ہوئی یادن میں میدان میں اتری یا پہاڑ پر۔

(الاتقان:۱۸۷/۲)

تیسرا نام حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ متوفی سنہ ۳۲ھ۔

ان کی بھی کئی روایات تفسیر میں منقول ہیں؛بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں زیادہ منقول ہیں۔

چوتھا نام حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ متوفی سنہ ۳۹ھ۔

حضرت ابیؓ بن کعب اُن صحابہ میں سے ہیں جو تفسیر اور علم قرأت میں مشہور ہیں،چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا،اَقْرَأُكُمْ اُبَیُّ ابْنُ کَعْبٍ،تم میں سب سے بڑے قاری ابی بن کعب ہیں۔

(تذکرۃ الحفاظ للذھبی:۳۸/۲)

حضرت ابیؓ بن کعب کی علمی وقعت کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ حضرت معمر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:

"عَامَّةُ عِلْمِ ابنِ عَبّاسٍ مِنْ ثَلٰثَةٍ، عُمَرَ وَعَلِي وَاُبَيّ بنُ كَعبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ "۔

(تذکرۃ الحفاظ للذھبی:۲/۳۸)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بیشتر علوم تین حضرات سے ماخوذ ہیں، حضرت عمر و علی وابی بن کعب رضی اللہ عنہم۔

ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ اور بھی کچھ نام تفسیر کے سلسلہ میں منقول ہیں مثلاً زید بن ثابتؓ، معاذ بن جبلؓ، عبد اللہ بن عمروؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، جابرؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، انسؓ اور حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہم۔

تابعین

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے چونکہ مختلف علاقوں اور مقامات میں پھیل کر قرآن کریم کی خدمت کا سلسلہ شروع کیا، جس کی وجہ سے تابعین کی ایک بڑی جماعت اس کام کے لیے تیار ہوئی، جس نے علم تفسیر کو محفوظ رکھنے میں نمایاں خدمات انجام دیں، ان میں سے کچھ برائے تعارف پیش کئے جاتے ہیں:

1۔(حضرت مجاہدؒ یہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں پورا نام ہے ابو الحجاج مجاہد بن جبر المخزومی، ولادت سنہ ۲۱ھ اور وفات سنہ ۱۰۳ھ۔)

2۔(حضرت سعید بن جبیرؒ، وفات ۹۴ھ)

3۔(حضرت عکرمہؒ)

4۔ (حضرت طاؤسؒ، وفات ۱۰۵ھ)

5۔(حضرت عطاء بن ابی رباح، وفات ۱۱۴ھ)

6۔(حضرت سعید بن المسیبؒ، وفات ۹۱ھ یا ۱۰۵ھ)

7۔(محمد بن سیرینؒ، وفات ۱۱۰ھ)

8۔(حضرت زید بن اسلمؒ، وغیرہ۔)

(منقول از علوم القرآن:۴۶۱)

تفاسیر کی اہم کتابیں

مفسرین نے اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے کئی نقطۂ نظر سے تفسیریں لکھی ہیں؛ مثلاً ادبی، عقلی اور کلامی وغیرہ، بعض نے تفسیر بالماثور بھی لکھی، بعض نے تفسیر اشاری یعنی صوفیانہ انداز پر تفسیر لکھی، غرض مختلف نقاط نظر سے قرآن کی خدمت کی گئی ہے۔

تفسیر بالماثور میں اہم تفاسیر

تفسیر طبری، تفسیر بحر العلوم از سمرقندی، الکشف والبیان عن تفسیر القرآن از ثعالبی، معالم التنزیل از بغوی، المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب لابن عطیہ، تفسیر ابن کثیر، الدر المنثور فی تفسیر الماثور از سیوطی، الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن از ثعالبی-خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تفسیر بالرائے کے نقطۂ نظر سے لکھی جانے والی کتابوں میں

مفاتیح الغیب از رازی، انوار التنزیل واسرار التاویل از بیضاوی، مدارک التنزیل وحقائق التاویل فی معانی التنزیل از خازن، غرائب القرآن ورغائب الفرقان از نیساپوری، تفسیر جلالین، السراج المنیر از خطیب شربینی، روح المعانی از آلوسی۔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

صوفیانہ نقطۂ نظر سے لکھی جانے والی تفاسیر میں

تفسیر ابن عربی، تفسیر فیضی، تفسیر القرآن العظیم از تستری، حقائق التفسیر از سلمی، عرائس البیان فی حقائق القرآن وغیرہ ہیں۔

فقہی نقطہ نظر سے لکھی جانے والی کتابوں میں

احکام القرآن از کیاہراسی، احکام القرآن ازابن العربی، الجامع لاحکام القرآن از قرطبی، کنز العرفان فی فقہ القرآن، احکام القرآن للجصاص، احکام القرآن للتھانوی اور اردو میں ایک مختصر سی کتاب مولانا عبد المالک صاحب کاندھلوی کی فقہ القرآن کے نام سے آئی ہے۔

اسرائیلیات کی حیثیت

قرآن مجید کے نزول سے قبل دیگر آسمانی کتابیں مثلاً تورات وانجیل وغیرہ نازل ہوچکی تھی اور نزولِ قرآن کے زمانہ میں اہل کتاب کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو قرآن میں بیان کردہ انبیاء کرام کے واقعات کو اپنی کتابوں کے حوالہ سے بھی پیش کرتے تھے اور بعض اوقات من گھڑت حکایات بھی نقل کردیتے؛لیکن اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نہایت قیمتی اصول بیان فرمائے جو آگے پیش کیئے جائیں گے تو آیئے قرآن کریم میں اسرائیلیات کی حیثیت اوران کا مقام ومرتبہ کیاہے،اس کو فرامین رسول کی روشنی میں اور علمائے امت کی تحریروں کے آئینہ میں ملاحظہ کرتے ہیں:

اسرائیلی روایات کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"الاسرائیلیات:الاخبار المنقولة عن بنی اسرائیل من الیهود وهو الاکثر اومن النصاری"۔

(قسم التفسیر واصولہ:۱/۴۷)

اسرائیلیات وہ باتیں جو بنی اسرائیل یعنی یہودیوں سے بکثرت منقول ہیں یانصاریٰ سے۔

مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے رقم فرمایا کہ:

"اسرائیلیات یااسرائیلی روایات ان روایات کو کہتے ہیں جو یہودیوں یاعیسائیوں سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں سے بعض براہِ راست بائبل یاتالمود سے لی گئی ہیں بعض مشناء اوران کی شروح سے اور بعض وہ زبانی روایات ہیں جو اہل کتاب میں سینہ بسینہ نقل ہوتی چلی آئی ہیں اور عرب کے یہود ونصاری میں معروف ومشہور تھیں"۔

(علوم القرآن:۳۴۵)

اسرائیلیات کی ابتداء

جب قرآن مجید نازل ہونے لگااوراس میں حضرات انبیاء کرام کے واقعات اوران کی قوموں کے احوال بیان کیے جانے لگے تواہل کتاب یہود ونصاری اپنی عبرانی زبان میں موجود کتابوں سے جو تحریف شدہ تھے اس سے واقعات عربی میں حضرات صحابہ کرامؓ سے بیان کرتے تھے جب اس واقعہ کی اطلاع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ان اہل کتاب کے بیان کردہ واقعات کی نہ ہی تصدیق کرواور نہ تکذیب ؛بلکہ کہو کہ جو کچھ اللہ تعالی نے نازل کیاہے ہمارااس پر ایمان ہے؛چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ:

"كَانَ أَهْلُ الْكِتَابِ يَقْرَءُونَ التَّوْرَاةَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ وَيُفَسِّرُونَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ لِأَهْلِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ لَا تُصَدِّقُوا أَهْلَ الْكِتَابِ وَلَا تُكَذِّبُوهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا"۔

(بخاری، بَاب: قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا، حدیث نمبر: ۴۱۲۵)

اہل کتاب تورات عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور اہل اسلام کے لیے اس کی تفسیر عربی زبان میں کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو اور کہو کہ ہم اللہ پر اور جو اس نے نازل کیا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں۔

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ (المتوفی: ۸۵۳ھ) حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد فرمانا کہ نہ تم ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب یہ اس وجہ سے ہے کہ جن باتوں کی وہ خبر دے رہے ہیں وہ سچ اور جھوٹ دونوں کا احتمال رکھتی ہیں، اگر فی الواقع وہ سچ ہوں اور تم ان کی تکذیب کردو یا اگر وہ جھوٹ ہوں اور تم اس کی تصدیق کردو تو دونوں اعتبار سے حرج اور تنگی میں پڑجانے کا اندیشہ ہے اس لیے ان کی بیان کردہ باتوں کو سن کر نہ تصدیق کی جائے نہ تکذیب؛ تاکہ فتنہ میں نہ پڑو۔

(فتح الباری، حدیث نمبر: ۴۱۲۵، شاملہ)

دو متعارض حدیثوں کا جواب

اسرائیلیات کے عنوان میں دو حدیثیں ہیں ایک جو ابھی اوپر مذکور ہوئی دوسری حدیث ہے کہ:

"حَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ"۔

(ابوداؤد، بَاب الْحَدِيثِ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ، حدیث نمبر: ۳۱۷۷)

اس حدیث سے یہ معلوم ہورہاہے کہ بنی اسرائیل کے بیان کردہ واقعات وغیرہ کے ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ پہلی روایت سے معلوم ہورہاہے کہ بنی اسرائیل کے بیان کردہ واقعات پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے چہ جائیکہ ان کو بیان کیا جائے بظاہر دو حدیثوں میں باہم تعارض دکھائی دے رہاہے، اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ محمد حسین الذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جو بنی اسرائیل سے بیان کرنے کی اجازت نظر آتی ہے وہ وہ واقعات اور عبرت ونصیحت پر مشتمل حکایات ہیں جن کے بارے میں معلوم بھی ہو کہ وہ سچ ہیں تو ان کو بیان کیا جاسکتا ہے اور پہلی حدیث میں توقف ہے کہ ان کے بیان کرنے میں احتیاط کی جائے تاکہ سچ اور جھوٹ میں اختلاط نہ ہوجائے اور اس خلط ملط کے نتیجہ میں حرج میں نہ پڑجائے، خلاصہ یہ ہے کہ دوسری حدیث عبرت ونصیحت پر مشتمل حکایات کی اباحت پر دلالت کرتی ہے اور پہلی حدیث ان مضامین کے بارے میں توقف پر دلالت کرتی ہے جن میں عبرت ونصیحت سے ہٹ کر دیگر مضامین ہوں؛ اس طرح کوئی بھی حدیث متعارض نہیں۔

اسرائیلیات کا حکم

اس سلسلہ میں تقریباً علمائے امت نے ایک ہی جواب دیا، الفاظ و تعبیرات اگرچہ مختلف ہیں؛ لیکن حکم ایک ہی ہے، آگے ہم مختلف علماء کرام کی تحریریں پیش کریں گے

1۔ پہلی قسم وہ اسرائیلیات ہیں جن کی تصدیق دوسرے خارجی دلائل سے ہوچکی ہے مثلاً: فرعون کا غرق ہونا وغیرہ، ایسی روایات اسی لیے قابلِ اعتبار ہیں کہ قرآن کریم یا صحیح احادیث نے ان کی تصدیق کردی ہے۔

2۔ دوسری قسم وہ اسرائیلیات ہیں جن کا جھوٹ ہونا خارجی دلائل سے ثابت ہوچکا ہے، مثلاً: یہ کہانی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام آخر عمر میں (معاذ اللہ) بت پرستی میں مبتلا ہوگئے تھے یہ روایت اس لیے قطعاً باطل ہے کہ قرآن کریم نے صراحتاً اس کی تردید فرمائی ہے۔

3۔ تیسری قسم ان اسرائیلیات کی ہے جن کے بارے میں خارجی دلائل ہے نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سچی ہیں اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹ ہیں، مثلاً تورات کے احکام وغیرہ ایسی اسرائیلیات کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لا تصدقوھا ولا تکذبوھا"۔

اس قسم کی روایات کو بیان کرنا تو جائز ہے؛ لیکن ان پر نہ کسی دینی مسئلہ کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے نہ ان کی تصدیق یا تکذیب کی جاسکتی ہے اور اس قسم کی روایات کو بیان کرنے کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں۔

(علوم القرآن:۳٦۴)

یہی بات علامہ محمد حسینی ذہبیؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ وغیرہ نے بھی کہی ہے۔

(التفسیر والمفسرون للذھبی، باب ثانیا:الااسرائیلیات:۴/۱۴)

مسند الہند حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (المتوفی:۱۱۷٦) نے نہایت اختصار کے ساتھ مگر جامع بات لکھی ہے کہ تفسیر میں اسرائیلی روایتوں کو بیان کرنا دراصل یہ بھی ایک سازش ہے جبکہ یہ قاعدہ مسلم ہے کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ ان کی تکذیب کرو؛ لہٰذا اس قاعدہ کی بنیاد پر دو باتیں نہایت ضروری ہیں:

1۔جب حدیث میں قرآن کریم کے اشارہ کی تفصیل موجود ہو تو اسرائیلی روایات کو تفسیر میں نقل نہیں کرنا چاہئے۔

2۔قرآن کریم میں جس واقعہ کی طرف اشارہ آیا ہو اس کی تفصیل ضرورت کے بقدر ہی بیان کرنی چاہئے تاکہ قرآن کریم کی گواہی سے اس کی تصدیق ہو کیونکہ یہ بھی قاعدہ ہے کہ ضروری بات بقدر ضرورت مانی جاتی ہے۔

(الفوزالکبیر مع شرح الخیر الکثیر:۴۵۳)

اسرائیلی روایات کی مثالیں

"وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ"۔ (یوسف:۱۸)

اور یوسف کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے۔

(۱)اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد کو اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ حضرت یوسفؑ کو ایک بھیڑئے نے ہی کھالیا ہے،ایک بھیڑیئے کو باندھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس لے آئے اور کہا کہ:ابا جان!یہی وہ بھیڑیا ہے جو ہماری بکریوں کے ریوڑ میں آتا رہتا ہے اور ان کو چیرتا پھاڑتا ہے،ہمارا خیال ہے کہ اسی نے ہمارے بھائی یوسف کا خون کیا ہے،حضرت یعقوبؑ نے بھیڑئے سے کہا قریب آؤ قریب آؤ،وہ قریب آگیا،اس سے کہا تم نے میرے بیٹے کو مار کر تکلیف پہنچائی اور مسلسل غم میں مبتلا کردیا ہے ،پھر حضرت یعقوبؑ نے اللہ سے دعا کی کہ،یااللہ!تو اس کو گویائی دے،اللہ نے اس کو بولنا سکھادیا،بھیڑئے نے کہا،اس ذات کی قسم جس نے آپؑ کو نبی بنایا ہے،نہ میں نے اس کا گوشت کھایا نہ میں نے اس کی کھال ادھیڑی ہے،نہ میں نے اس کا ایک بال اکھیڑا ہے،قسم خدا کی آپؑ کے لڑکے سے میرا کوئی سروکار نہیں،میں ایک پردیسی بھیڑیا ہوں میں مصر کے اطراف سے اپنے ایک بھائی کی تلاش میں آیا ہوا ہوں،میں اس کی جستجو میں تھا کہ آپؑ کے لڑکوں نے میرا شکار کرلیا،ہم لوگوں پر انبیاءؑ اور رسولان عظامؑ کا گوشت حرام کردیا گیا ہے..الخ۔

(تفسیر ثعلبی:۲۱/۴)

"فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى"۔ (طٰہٰ:۲۰)

انہوں نے اسے پھینک دیا،وہ اچانک ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گئی۔

(۲)اس آیت کے سلسلہ میں وہب بن منبہؒ کی ایک روایت ہے،انہوں نے کہا کہ حضرت موسیٰؑ نے جب عصا کو زمین پر ڈالا تو دیکھا کہ وہ ایک عظیم الجثہ اژدھا بن گیا،لوگ حیرت واستعجاب اور خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے،اژدھا اِدھر اُدھر رینگ رہا ہے،جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو،اژدھار ینگتا ہوا پہاڑ کی چٹانوں کے پاس پہنچ گیا تو بھوکے اونٹ کی طرح بیتابی کے ساتھ پوری چٹان نگل گیا،جب وہ اپنا منہ بڑے سے بڑے تناور درخت کی جڑوں پر لگادیتا تھا تو اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیتا تھا،اس کی دونوں آنکھیں دھکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں؛اس کے بال نیزوں کی طرح تھے..الخ۔ (تفسیر ابن کثیر:۵/۲۷۹)

"أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ"۔ (البقرۃ:۲۵۸)

کیا تم نے اس شخص (کے حال) پر غور کیا جس کو اللہ نے سلطنت کیا دے دی تھی کہ وہ اپنے پروردگار (کے وجود ہی) کے بارے میں ابراہیمؑ سے بحث کرنے لگا؟۔

(۳)اس آیت کی تفسیر میں ایک روایت میں نمرود کے بارے میں اس طرح لکھا ہوا ہے:ایک مچھر نمرود کی ناک میں گھس گیا اور اس کی ناک میں چار سو سال تک بھنبھناتا رہا،اس مچھر کی اذیت کی وجہ سے نمرود انتہائی بے چین رہتا تھا اور مستقل عذاب میں مبتلا تھا اور جب تکلیف کی شدت اور بے چینی بڑھ جاتی تھی تو لوہے کی سلاخ سے یا ہتھوڑے سے اس کے سر کو ٹھونکا جاتا تھا جس سے مچھر کی اذیت کچھ ہلکی پڑتی تھی،اسی عذاب میں نمرود چار سو سال زندہ رہا پھر اسی اذیت کی وجہ سے مر گیا۔

(تفسیر ابن کثیر:۱/۳۱۳)

یہ تینوں روایتیں اسرائیلی ہیں،جیساکے علماء امت نے اس کی تصریح کی ہے۔

(تفسیروں میں اسرائیلی روایات:۴۴۴)

قرآن کریم جو اللہ تبارک وتعالی کا عظیم ترین اور مقدس ترین کلام ہے اور رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا حیرت انگیز ابدی ودائمی معجزہ ہے،جو ساری انسانیت کے لیے نسخہ ہدایت اور دستور حیات بناکر نازل کیا گیا،جس سے مردہ دلوں کی مسیحائی ہوئی اور گم گشتہ راہ لوگوں کو منزلِ مقصود کا پتہ ملا،جس کی علمی ،ادبی حلاوتوں،روحانی راحتوں اور معانی ومفاہیم کے بے پناہ وسعتوں نے ہر زمانہ کے انسانوں کو متاثر کیا اور قلب و نظر کی دنیا میں انقلاب کا ذریعہ ہے،سب سے بڑا اعجاز اس کلام مبارک کا یہ بھی ہے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالی نے لی ہے جو اس دنیا میں ازل سے کسی اور کتاب یا صحیفہ آسمانی کو نصیب نہیں ہوا اور علوم ومعارف کے اس گنجینۂ گراں مایہ کی حفاظت اور خدمت کے لیے انسانوں ہی میں سے مختلف علوم کے مختلف افراد کا انتخاب فرمایا؛چنانچہ الفاظ قرآنی کے لیے حفاظِ کرام کو سعادت حفظِ قرآن بخشی اور مرادِ ربانی منشائے نبوی کی صحیح تعیین وتشریح کے لیے حضرات مفسرین کو منتخب کیا؛چنانچہ مفسرین کرام نے اپنی خداداد ذہانت اور تمام تر صلاحیت کو اس کلام الٰہی کی غواصی میں لگادیا؛لیکن آج کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ تمام

تر موتیوں اور علم وحکمت کے جواہر پاروں کو اکٹھا کیا جاسکا، یہ کلام ایک بحر بیکراں ہے جس کی مختلف زبانوں میں علمائے امت نے اپنی صبح وشام کی محنتوں کا محور بنایا، آج انہی علماء کرام اور مفسرین عظام کی کوششوں اور کاشوں کا ثمرہ ہے کہ مختلف زبانوں میں قرآن کی تفسیر موجود ہے، ذیل میں ہم صرف تفسیر قرآن کی مختلف کتابوں کے نام مع اسمائے مصنفین و سن وفات پیش کرتے ہیں، جو شروع سے لے کر آج تک امت میں مقبول و متداول ہیں اور لاتعداد انسان ان کتابوں سے استفادہ کر رہے ہیں پہلے عربی تفاسیر کے نام بعد ازاں اردو کتب تفاسیر رقم کی جارہی ہیں۔

اہل کتاب کی روایات نقل کرنے والے حضرات

عہد صحابہ اور اس کے بعد کے ادوار میں بھی تفسیر قرآن کے ماخذ کے طور پر یہود و نصاریٰ رہے ہیں؛ کیونکہ قرآن کریم بعض مسائل میں عموماً اور قصص انبیاء اور اقوام سابقہ کے کوائف واحوال میں خصوصاً تورات کے ساتھ ہم آہنگ ہے، اسی طرح قرآن کریم کے بعض بیانات انجیل سے بھی ملتے ہیں؛ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا واقعہ اور ان کے معجزات وغیرہ۔

البتہ قرآن کریم نے جو طرز و منہاج اختیار کیا ہے وہ تورات وانجیل کے اسلوب بیان سے بڑی حد تک مختلف ہے، قرآن کریم کسی واقعہ کی جزئیات وتفصیلات بیان نہیں کرتا، بلکہ واقعہ کے صرف اسی جز پر اکتفاء کرتا ہے جو عبرت و موعظت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہوتا ہے، یہ انسانی فطرت ہے کہ تفصیلی واقعہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام اور بعد کے ادوار میں تابعین اور تبع تابعین حضرات اہل کتاب کے ان اہل علم سے جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے قرآن میں ذکر کردہ واقعات کی تفصیل کے واسطے رجوع کیا کرتے تھے،

اسرائیلی روایات کا مدار وانحصار زیادہ تر حسب ذیل چار راویوں پر ہے

عبداللہ بن سلامؓ، کعب احبار، وھب بن منبہ، عبدالملک بن عبدالعزیز ابن جریج، جہاں تک عبداللہ بن سلامؓ کی بات ہے تو آپ کے علم وفضل میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور ثقاہت وعدالت میں آپ اہل علم صحابہ میں شمار ہوتے ہیں، آپؓ کے بارے میں قرآن کریم کی آیات نازل ہوئیں، امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ اور دیگر محدثین نے آپ کی روایات پر اعتماد کیا ہے۔

حضرت کعب احبار بھی ثقہ راویوں میں سے ہیں، انہوں نے زمانہ جاہلیت کا زمانہ پایا اور خلافت صدیقی یا فاروقی میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ خلافت فاروقی میں آپ کے اسلام لانے کی بات مشہور تر ہے۔

(فتح الباری،۱۵۸/ا حدیث نمبر:۹۵)

آپ کے ثقہ اور عادل ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ و حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہما اپنی جلالت قدر اور علمی عظمت کے باوجود آپ سے استفادہ کرتے تھے، امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں کتاب الایمان کے آخر میں کعبؓ سے متعدد روایات نقل کی ہیں، اسی طرح ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے بھی آپ سے روایت کی ہیں؛ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کعب احبارؓ ان سب محدثین کے نزدیک ثقہ راوی ہیں۔

اسی طرح وھب بن منبہ کی جمہور محدثین اور خصوصاً امام بخاریؒ نے توثیق و تعدیل کی ہے، ان کے زہد و تقوی کے بارے میں بڑے بلند کلمات ذکر کئے ہیں، فی نفسہ یہ بڑے مضبوط راوی ہیں؛ البتہ بہت سے لوگوں نے ان کی علمی شہرت و عظمت سے غلط فائدہ اٹھایا کہ بہت سی غلط باتوں کو ان کی طرف منسوب کرکے اپنے قد کو اونچا کیا اور لوگوں نے ان کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

ابن جریج اصلاً رومی تھے، مکہ کے محدثین میں سے تھے، عہد تابعین میں اسرائیلی روایات کے مرکز و محور تھے، تفسیر طبری میں نصاری سے متعلق آیات کی تفسیر کا مدار انہی پر ہے، ان کے بارے میں علماء کے خیالات مختلف ہیں، بعض نے توثیق کی ہے تو بعض نے تضعیف بھی کی ہے، بکثرت علماء آپ کو مدلس قرار دیتے ہیں اور آپ کی مرویات پر اعتماد نہیں کرتے، مگر بایں ہمہ امام احمد بن حنبلؒ ان کو علم کا خزانہ قرار دیتے ہیں؛ بہر حال ابن جریج سے منقول تفسیری روایات کو حزم و احتیاط کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔

اہل کتاب کی روایات پر مشتمل کتب تفاسیر

کوئی ایسی کتاب جس میں خاص اسرائیلی (اہل کتاب کی) روایات کے جمع کرنے پر توجہ دی گئی ہو ایسی تو کوئی تفسیر نہیں ہے؛ البتہ آیات کی تفسیر میں عموماً کتب تفاسیر میں اسرائیلی روایات بھی ذکر کی گئی ہیں، جس کا علم راوی کو دیکھ کر یا پھر ان کی بیان کردہ باتوں کو اصول شرعیہ کی روشنی میں پرکھ کر معلوم کیا جاسکتا ہے، مولانا اسیر ادروی صاحب کی ایک کتاب اردو میں " تفسیروں میں اسرائیلی روایات " کے نام سے آچکی ہے، جس کے مقدمہ میں اسرائیلی روایات سے متعلق عمدہ بحث اکٹھا کردی ہے اور پھر جو اسرائیلی روایات ان کو معلوم ہو سکیں ان پر الگ الگ کلام کیا ہے اور معتبر تفاسیر سے ان کا اسرائیلی روایات کے قبیل سے ہونا بھی ظاہر کیا ہے، تفصیل کے لیے اسی کتاب کی طرف رجوع کیا جائے۔

یہاں پر چند عربی اور اردو تفاسیر کے نام لکھے جارہے ہیں اور اردو میں صرف مستند تفاسیر کے نام لکھے گئے ہیں۔

علم تفسیر اور اصول تفسیر کا آغاز وارتقاء

تفسیر قرآن مجید کا آغاز نبی اکرم ﷺ کی ذات سے ہوا۔ آپ ﷺ سب سے پہلے مفسر ہیں۔ جس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں ہے:

"عن عامر يقول سمعت رسول اللهﷺ وهو على المنبر يقول "وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ[1]" ألا إن القوة الرمی إلا إن القوة الرمی ألا إن القوة الرمی[2]"

"عامرؓ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے منبر پر فرماتے ہوئے سنا کہ "وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ" قوت سے مراد رمی ہے، قوت سے مراد رمی ہے۔"

آیت کریمہ میں قوت کی وضاحت نبی اکرم ﷺ نے رمی یعنی دور سے پھینکنے سے فرمائی جس سے تیر، گولی اور میزائل وغیرہ مراد لیے جاسکتے ہیں۔ اس طرح کی سینکڑوں مثالوں سے حدیث اور تفسیر کا لٹریچر بھرا پڑا ہے۔

3۔ عہد رسالت کے بعد صحابہ کرامؓ سے متعدد تفسیری روایات منقول ہیں۔ صحابہ کرامؓ میں اکثر تفسیری اقوال خلفاء راشدین، عبد اللہ بن عباسؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، زید بن ثابتؓ، ابو موسی الاشعریؓ، ابی بن کعبؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ سے منقول ہیں۔ دیگر صحابہؓ ابو ھریرۃؓ، جابر بن عبد اللہؓ، انس بن مالکؓ اور عبد اللہ بن عمرؓ سے بھی تفسیری اقوال منقول ہیں لیکن وہ بہت قلیل ہیں۔

4۔ صحابہ کرامؓ کا تعامل تفسیر قرآن کے بارے میں بہت احتیاط والا تھا۔

صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین کا دور تفسیر کے حوالہ سے درخشاں ستارے کی مانند ہے۔ تابعین میں نامور مفسرین مجاہد بن عطاء ابی رباح، عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن بصری، ابو العالیہ ضحاک اور قتادہ ہیں۔ سب سے پہلے اس فن کی ابتداء جناب سعید بن جبیر نے کی۔ عبد الملک بن مروان نے ان سے تفسیر لکھنے کی درخواست کی جس پر انہوں نے ایک تفسیر لکھ کر عبد الملک بن مروان کو پیش کی۔ عطاء بن دینار کے نام سے مشہور تفسیر دراصل یہی تفسیر ہے۔

دورِ تابعین کے بعد تفسیر میں باقاعدہ تدوین کا دور شروع ہوتا ہے جو تیسری صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک کا وسیع زمانہ ہے۔ اس دور میں علم تفسیر ایک جداگانہ فن کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ اس زمانے کی مشہور تفاسیر میں تفسیر طبری، قرطبی، ابن کثیر وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ اس دور میں تمام تفسیری روایات سند کے ساتھ ذکر کی جاتیں تھیں۔

اس دور کے بعد، جس کو عصر تدوین کے بعد کا دور کہا جاسکتا ہے، تفاسیر کو نقل سے ہٹ کر عقلی دلائل اور دوسرے فنی علوم صرف و نحو اور عربیت وغیرہ کی بنیاد پر بھی لکھا جانے لگا، جس میں ابتدائی دور کی تفاسیر البحر المحیط اور مفاتیح الغیب وغیرہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اب تفسیر کے میادین بہت پھیل گئے اور فقہی، کلامی، ادبی، تاریخی، نحوی اور کلامی وغیرہ رجحانات کی تفاسیر لکھی جانے لگیں۔ یہی وہ دور ہے کہ علم تفسیر عرب سے عجم میں پہنچا اور بالخصوص برصغیر پاک وہند میں تفسیری کام کی ابتداء ہوئی۔ اگرچہ ابتدائی مساعی عربی زبان میں ہی تھیں مگر شاہ ولی اللہؒ کے زمانے یعنی بارہویں صدی ہجری سے فارسی اور اردو میں بھی تفسیری کام کا آغاز ہو گیا جس سے ایک بے پایاں ذخیرہ تفسیر وجود میں آیا۔

برصغیر میں تفسیری کام کا آغاز وارتقاء

برصغیر میں تفسیری کام کی ابتداء کشمیر کے ایک راجہ نے کی جس نے قرآن مجید کی تفسیر مقامی زبان میں تصنیف کرائی تھی۔ عراقی نے ۲۷۰ھ میں قرآن حکیم کا ترجمہ یا تفسیر سندھی زبان میں لکھا ہے۔ ہندوستان میں قرآن کریم کا یہ پہلا ترجمہ ہے۔ پھر علامہ مخلص بن عبداللہ دہلوی (متوفی ۷۶۲ھ) نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بنام "کشف الکشاف" لکھی۔ امیر کبیر تاتار خان دہلوی (متوفی ۷۹۹ھ) نے قرآن مجید کی ایک تفسیر "تاتارخانی" لکھی۔ پہلا فارسی ترجمہ آٹھویں صدی ہجری میں نظام الدین قمی شافی نیشاپوری نے کیا، جو دولت آباد آکر مقیم ہوگئے تھے۔

شیخ اشرف جہاں گیر سمنامی (متوفی ۸۰۸ھ) ۲۳ سال کی عمر میں ہندوستان آئے، انہوں نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بنام "نور بخشیہ" لکھی۔ حضرت گیسو دراز (متوفی ۸۲۵) نے تفسیر کشاف کا حاشیہ اور علیحدہ تفسیر لکھی۔ شیخ احمد بن علی المہائمی نے قرآن مجید کی جامع تفسیر بنام "تفسیر رحمانی" لکھی۔ شیخ مہائمی کی یہ تفسیر مصر میں شائع ہوئی اور اس وقت کے جلیل القدر علماء سے خراج تحسین حاصل کیا۔ قاضی شہاب الدین دولت آبادی (متوفی ۸۴۰ھ) نے قرآن مجید کی تفسیر فارسی زبان میں لکھی جو مشہور اور جامع ہے تفسیر کا نام "بحر مواج" ہے۔

خواجہ حسین ناگوری (متوفی ۹۰۱ھ) نے قرآن شریف کی ایک تفسیر تیس جلدوں میں بنام "نور النبی" لکھی۔ مولانا اللہ داد جونپوری (متوفی ۹۲۳ھ) نے قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھی جو تفسیر کے حواشی پر مشتمل ہے۔ شیخ محمد بن عاشق چڑیا کوٹی نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بنام "تفسیر محمدی" لکھی۔ شیخ حسن محمد المعروف بہ شیخ احمد گجراتی (متوفی ۹۸۲ھ) نے قرآن مجید کی تفسیر بنام "تفسیر محمدی" لکھی۔ مولانا وجیہ الدین بن نصر اللہ گجراتی نے تفسیر بیضاوی کا حاشیہ لکھا۔ شیخ طاہر سندھی برہانپوری نے قرآن مجید کی تفسیر بنام "مجمع البحرین" لکھی، شیخ کا وصال دسویں صدی کے آخر میں ہوا۔ شیخ عبد الحق دہلوی (متوفی ۱۰۵۲ھ) نے جس طرح حدیث کی خدمت کی، اسی طرح تفسیر قرآن مجید کی بھی خدمت بھی فرمائی۔ اورنگزیب عالمگیر کے استاذ ملا جیون جونپوری کی "تفسیر احمدی" بھی عربی زبان میں عالم اسلام میں مستند تفسیر مانی جاتی ہے۔

آخر کار حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی برصغیر میں ترجمۃ القرآن اور تفسیر کے امام بن کر آئے۔ آپ نے فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ "فتح الرحمن" لکھا، جس پر مختصر مگر جامع تفسیری فوائد تحریر فرمائے۔ اس وقت ہندوستان میں دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی لیکن اس زبان میں قرآن مجید کا کوئی ترجمہ رائج نہ تھا۔

شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۱۷۶ھ) کے شاگرد اور شیخ طریقت مرزا مظہر جانجاناں دہلوی (متوفی ۱۱۹۵ھ) کے خلیفہ طریقت قاضی ثناءاللہ پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ) نے تفسیر مظہری عربی زبان میں لکھی۔ نواب صدیق حسن خان (متوفی ۱۳۰۷ھ) نے قرآن کریم کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے اور تفسیر میں "فتح البیان" اور احکام القرآن میں "نیل المرام" عربی زبان میں لکھیں۔

- خزائن العرفان: علامہ سید نعیم الدین مفسر مرادآبادی علیہ الرحمہ
- نعیم البیان فی تفسیر القرآن: علامہ سید نعیم الدین مفسر مرادآبادی علیہ الرحمہ
- تفسیر اشرفی: علامہ سید محمد محدث کچھوچھوی علیہ الرحمہ + علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی حفظہ اللہ
- نور العرفان: مفتی احمد یار خان نعیمی محدث بدایونی علیہ الرحمہ
- تفسیر نعیمی: مفتی احمد یار خان نعیمی محدث بدایونی علیہ الرحمہ + مفتی اقتدار احمد خان نعیمی علیہ الرحمہ
- تبیان القرآن: علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ
- تفسیر تبیان الفرقان: علامہ غلام رسول سعیدی علیہ الرحمہ
- تفسیر اویسی: علامہ فیض احمد اویسی محدث بہاول پوری علیہ الرحمہ
- تفہیم القرآن: علامہ غلام رسول رضوی محدث امرت سری علیہ الرحمہ
- تفسیر رضوی: مولانا حشمت علی رضوی بریلوی علیہ الرحمہ
- تفسیر الحسنات: علامہ ابوالحسنات سید محمد قادری علیہ الرحمہ
- احکام القرآن: مفتی جلال الدین احمد قادری علیہ الرحمہ
- تفسیر فاضلی: حضرت فضل شاہ قطب عالم علیہ الرحمہ
- ضیاء القرآن: علامہ جسٹس پیر کرم شاہ ازہری علیہ الرحمہ
- جمال الایمان: علامہ سید محمد ذاکر شاہ علیہ الرحمہ
- تفسیر نور القرآن: علامہ ابوالنصر منظور احمد شاہ علیہ الرحمہ
- نجوم الفرقان: علامہ عبد الرزاق بھترالوی علیہ الرحمہ
- فیوض القرآن: ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی علیہ الرحمہ
- تفسیر مظہر القرآن: مفتی مظہر اللہ نقشبندی دہلوی علیہ الرحمہ

عربی کتب تفسیر مع اسمائے مفسرین

شمار	اسمائے مفسرین	اسمائے کتب تفسیر	سنِ وفات
۱	(منسوب) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ	تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس	۶۸ھ

۲	امام فخر الدین الرازی رحمۃ اللہ علیہ	مفاتیح الغیب (المعروف) تفسیر کبیر	۶۰۲ھ
۳	ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن ابو بکر بن فرح القرطبیؒ	الجامع الاحکام القرآن (المعروف) تفسیر قرطبی	۶۷۱ھ
۴	حافظ عماد الدین ابو الفدا اسماعیل بن خطیب ابو حفص عمر بن کثیر الشافعی رحمۃ اللہ علیہ	تفسیر ابن کثیر	۷۷۴ھ
۵	قاضی ابو السعود محمد بن محمد العمادی الحنفیؒ	ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم (معروف) تفسیر ابی السعود	۹۸۲ھ
۶	علامہ محمود آلوسی البغدادی رحمۃ اللہ علیہ	روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی	۱۲۷۰ھ
۷	ابو محمد حسین بن مسعود الفراء البغوی رحمۃ اللہ علیہ	معالم التنزیل	۵۱۶ھ
۸	علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ	الدر المنثور فی التفسیر بالماثور	۹۱۱ھ
۹	محمد بن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ	جامع البیان فی تفسیر القرآن	۳۱۰ھ
۱۰	ابو عبد اللہ بن احمد النسفی رحمۃ اللہ علیہ	مدارک التنزیل	۷۱۰ھ
۱۱	ابو حیان اندلسی رحمۃ اللہ علیہ	البحر المحیط	۷۴۰ھ
۱۲	قاضی ناصر الدین بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ	تفسیر بیضاوی	۶۹۱ھ
۱۳	ابو الحسن علی بن محمد رحمۃ اللہ علیہ	لباب التاویل فی معانی التنزیل (تفسیر خازن)	۷۴۱ھ
۱۴	ابو القاسم محمود بن عمرو بن احمد الزمخشریؒ	الکشاف	۵۳۸ھ
۱۵	ابو الفرج ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ	زاد المسیر	۵۹۷ھ
۱۶	ابو الفیض فیضی رحمۃ اللہ علیہ	سواطع الالہام	۱۰۰۴ھ
۱۷	قاضی محمد بن علی بن محمد بن عبد اللہ الشوکانیؒ	فتح القدیر	۱۲۵۰ھ

۱۸	ملاجیون رحمۃ اللہ علیہ	تفسیرات احمدی	۱۱۳۰ھ
۱۹	قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ	تفسیر مظہری	۱۲۴۰ھ
۲۰	علامہ جلال الدین محلی رحمۃ اللہ علیہ	جلالین	۸۹۱ھ
۲۱	علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ		۹۱۱ھ
۲۲	شیخ طنطاوی بن جوہری رحمۃ اللہ علیہ	تفسیر الجواھر	۱۳۵۸ھ
۲۳	سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ	فی ظلال القرآن	۱۳۸۵ھ
۲۴	الدکتور وھبۃ الزحیلی مدظلہ	التفسیر المنیر	باحیات

چند ضروری اصطلاحات

فصاحت و بلاغت: فصاحت کا لغوی معنی بیان و ظہور کے ہیں۔ یہ لفظ کلمہ، کلام اور متکلم کی صفت بنتا ہے۔

کلمۂ فصیح:۔۔۔ایسا کلمہ جو تنافر حروف، غرابت اور قیاس لغوی کی مخالفت سے خالی ہو۔ تنافر حروف ایسے وصف کو کہا جاتا ہے جس کی وجہ سے کلمے کا تلفظ ثقیل اور دشوار ہو۔ جیسے مستشزرات اور اُمّعخع غرابت کا معنی ہے کہ لفظ اوپرا اور مجہول المعنی ہو۔ جیسے تکاکاتم۔ مخالفت قیاس لغوی کا معنی ہے کہ لفظ صرفی و لغوی قاعدہ کے مخالف ہو جیسے الاجلل۔

کلام فصیح:۔۔۔وہ کلام جس کے تمام کلمات فصیح ہوں۔

متکلم فصیح:۔۔۔جس کے اندر ایسا ملکہ ہو کہ اس کے سبب سے وہ اپنے مقصود کو فصیح الفاظ میں بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔

بلاغت:۔۔۔علم بلاغت اس علم کا نام ہے جس کے قواعد ملحوظ رکھنے سے مقتضائے حال کے مطابق کلام کرنے میں خطا واقع نہ ہو۔

مجاز عقلی:۔۔۔فعل یا معنی فعل کی اسناد اس چیز کی طرف کرنا جس کے ساتھ حقیقت میں وہ متصف نہ ہو اور یہ اسناد کسی علاقہ کی وجہ سے ہو اور اس کا قرینہ موجود ہو۔ جیسے النھر جار۔ جب کہ جاری تو پانی ہوتا ہے نہ کہ نہر۔

قصر:۔۔۔ایک شئی دوسری شئی کے ساتھ ایک خاص طریقہ پر مخصوص کرنے کو قصر کہتے ہیں۔ جیسے لا الہ الا اللہ۔

استفہام وعید:۔۔۔ایسا استفہام جو دھمکی کے معنی میں ہو جیسے اتفعل کذا۔

استفہام تعجب :۔۔۔ وہ استفہام جو تعجب کے معنی میں ہو جیسے مالی لااری الھدھد۔

استفہام انکاری :۔۔۔کے معنی توبیخ اور جھڑکنے کے ہیں۔ جیسے اتاتون الذکران۔

استفہام تشویق :۔۔۔ بمعنی شوق دلانا جیسے ھل ادلکم علی تجارۃ۔

استفہام تہکم :۔۔۔ بمعنی مذاق اڑانا۔ اعقلک یسوع لک ان تفعل کذا۔ کیا تمہاری عقل تمہیں اجازت دیتی ہے کہ تم ایسا کام کرو۔

استفہام تحیر :۔۔۔جس میں حیرانی کا معنی ہو جیسے ایا منازل سلمیٰ۔

استفہام تہویل :۔۔۔ جس میں ہولناکی کا معنی ہو جیسے من فرعون۔

تہدید :۔۔۔جس میں دھمکی کا معنی ہو جیسے اعملوا ما شئتم۔

تعجیز :۔۔۔ جس میں دھمکی کا معنی ہو جیسے اعملوا ما شئتم۔

ایجاز :۔۔۔ یہ کہ الفاظ معنی مقصود سے کم ہو جیسے فاتوابسورۃ۔

ایجاز قصر :۔۔۔ یہ ہے کہ عبارت چھوٹی ہو اور معانی بہت ہوں اور اس میں عبارت حذف بھی نہ ہو، جیسے ولکم فی القصاص حیوۃ۔

ایجاز حذف :۔۔۔ یہ ہے کہ جس میں ایک یا ایک سے زائد کلمے یا جملے حذف ہوں اور اس حذف پر کوئی قرینہ موجود ہو۔ جیسے واسئل القریۃ ای واسئل اھل القریۃ۔

اطناف :۔۔۔ یہ کہ کسی فائدہ کے پیش نظر الفاظ معنی مقصود سے زائد ہوں، جیسے تنزل الملائکۃ والروح فیھا۔

جملہ معترضہ :۔۔۔ کلام کے درمیان ایسا جملہ جس کا ترکیب کلام سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے ویجعلون للہ البنات سبحانہ ولھم مایشتھون۔ میں سبحانہ جملہ معترضہ ہے۔

تکریر :۔۔۔ یعنی کلام کو مکرر لانا، جیسے کلاسوف تعلمون ثم کلاسوف تعلمون۔

ذکر العام بعد الخاص :۔۔۔ یعنی خاص شے کو بیان کرنے کے بعد عام شئی کو بیان کرنا۔ جیسے رب اغفرلی ولوالدی ولمن دخل بیتی مؤمنا وللمؤمنین والمؤمنات۔

ذکر الخاص بعد العام :۔۔۔ یعنی شے کے بعد خاص شے کو بیان کرنا جیسے تنزل الملائکۃ والروح۔

مجاز :۔۔۔ کلام میں کوئی ایسا قرینہ موجود ہو جس سے معلوم ہو کہ یہاں معنی موضوع لہ مراد نہیں ہے۔

کنایہ :۔۔۔ یہ ہے کہ معنی غیر موضوع لہ مراد ہو مگر اس پر کوئی قرینہ نہ ہو۔

تشبیہ :۔۔۔ ایک شے کو دوسرے شے کے ساتھ کسی ایسی صفت میں لاحق کرنا جو دونوں میں پائی جاتی ہو تشبیہ کہلاتی ہے۔ جیسے زید کلاسد۔

ارکان تشبیہ :۔۔۔ ارکان تشبیہ چار ہیں۔ مشبہ وہ چیز جسے تشبیہ دی جارہی ہو۔ مشبہ بہ وہ چیز جس کے ساتھ کسی دوسری چیز کو تشبیہ دی جاری ہو۔ اداۃ تشبیہ وہ حرف جس کے ذریعے تشبیہ دیں، جیسے کاف وغیرہ۔

وجہ تشبیہ :۔۔۔ وہ صف جس میں تشبیہ دی جائے۔ مثلاً بہادری۔

تمثیل :۔۔۔ وہ تشبیہ جس میں وجہ شبہ کئی چیزوں سے اخذ کی گئی ہو۔ مثلاً ثریا۔

مجاز مرسل :۔۔۔ایسا کلام جس میں حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی مراد ہو جب کہ حقیقی اور مجازی معنی میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور علاقہ پایا جائے۔ جیسے امطرت السماء نباتا۔ اس میں علاقہ سببیت کا ہے۔

استعارہ :۔۔۔ وہ مجاز ہے جس میں علاقہ تشبیہ کا ہو۔ استعارہ میں مشبہ کو مستعار لہ اور مشبہ بہ کو مستعار منہ اور وجہ شبہ و وجہ جامع کہا جاتا ہے۔

استعارہ تحقیقیہ :۔۔۔ وہ استعارہ ہے جس میں مستعار لہ حسی یا عقلی طور پر محقق ہو۔

استعارہ تخیلیہ :۔۔۔ وہ استعارہ ہے جس میں مستعار لہ کا تحقق حسی یا عقلی طور پر نہ ہوا ہو۔

استعارہ مصرحہ :۔۔۔ وہ استعارہ ہے جس میں لفظ مستعار منہ (مشبہ بہ) صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔ جیسے امطرت لولوا من نرجس۔

استعارہ مکنیہ :۔۔۔ وہ استعارہ ہے کہ متکلم ایک کو دوسری چیز کے ساتھ اپنے دل ہی میں تشبیہ دے دے اور ارکان تشبیہ میں سے سوائے مشبہ (مستعار لہ) کے کچھ اور ذکر نہ کرے، لیکن مشبہ (مستعار منہ) کے لوازم اور خصوصیات ذکر کرے۔ جیسے : اذالمنیۃالنشبت اظفارھاالفیت کل تمیمۃلاتنفع۔

کنایہ :۔۔۔ وہ لفظ ہے جس سے اس کا لازم معنی مراد لیا جائے اور اس کے ساتھ اس کے معنی ملزوم (اصل معنی) کا بھی مراد لینا درست ہو جیسے طویل النجاد۔

تعریض :۔۔۔ وہ کنایہ جس میں موصوف مذکور نہ ہو یا کلام سے ایک جانب اشارہ کرنا جب کہ مراد دوسری جانب ہو۔ جیسے کسی بڑے آدمی کے سامنے کہا جائے : خیر الناس من ینفع الناس۔

تلویح :۔۔۔ وہ کنایہ ہے جس میں واسطے بہت سارے ہوں جیسے کثیر الرماو مراد سخی آدمی ہے۔

محسنات بدیعیہ :۔۔۔ کلام کے اندر ایسی لفظی و معنوی خوبیاں جن سے لفظ و معنی میں حسن و جمال پیدا ہو۔

طباق :۔۔۔ ایسے دو لفظ جن کے معنی میں فی الجملہ تقابل اور ضد ہو۔

مقابلہ :۔۔۔ یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ موافق معنی الفاظ لائے جائیں، پھر علی الترتیب ہر لفظ کا مقابل لایا جائے۔ جیسے فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیراً۔

مراعاۃالنظیر :۔۔۔ یہ ہے کہ ایسے دو یا دو سے زیادہ امور کو ایک جگہ جامع کریں جو ایک دوسرے کے مناسب ہوں، لیکن یہ مناسبت تضاد کی نہ ہو۔ جیسے الشمس والقمر بحسبان۔

مشاکلت :۔۔۔ یہ ہے کہ ایک معنی کو اس لفظ سے ذکر کریں جو دوسرے معنی کے لئے موضوع ہو۔ اس مناسبت سے کہ دونوں ایک جگہ مذکور ہوئے ہیں، جیسے یمکرون ویمکر اللہ۔

توریہ :۔۔۔ ایک لفظ بولنا جس کا ایک قریبی معنی ہو اور یک بعید معنی ہو۔ قریبی معنی فوراً ذہن میں آجائے لیکن مراد بعید معنی ہو، جیسے ہجرت کے موقع پر حضرت ابو بکر صدیق (رض) نے حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بارے میں فرمایا : رجل یھدینی السھیل۔ ایک صاحب ہیں جو مجھے راستہ دکھا رہے ہیں۔

لف ونشر :۔۔۔ یہ کہ کلام میں پہلے کئی چیزیں ذکر کریں۔ یہ لف ہے پھر ان میں سے ہر ایک کی مناسبات اور متعلقات بلا تعیین بیان کریں یہ نشر ہے۔ جیسے و من رحمۃ جعل لکم اللیل والنھار لتسکنوا فیہ ولتمتعوا من فضلہ۔

تجرید :۔۔۔ یہ ہے کہ ایک شے ذی صفت سے ایک اور شے ذی صفت اسی طرح نکالی جائے بقصد مبالغہ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ پہلی شے اس صفت میں ایسی کامل ہے کہ اس سے ایک اور شے اسی طرح کی نکل سکتی ہے۔ جیسے لی من فلان صدیق حمیم۔

مبالغہ :۔۔۔ یہ ہے کہ کسی وصف (برائی یا بھلائی) کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ زیادتی یا کمی، سختی یا نرمی میں اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ جو محال یا بعید از عقل ہے۔

حسن تعلیل :۔۔۔ یہ ہے کہ کسی وصف کے لئے مناسب علت کا دعویٰ کیا جائے۔ کسی ایسے لطیف اعتبار سے جو حقیقی نہ ہو۔

تجنیس :۔۔۔ یہ ہے کہ نطق میں دو لفظ مشابہ ہوں اور ان کے معنی جدا جدا ہوں۔ جیسے

لم نفق غیرک انسانا بلازبہ فلابرحت لعین اندھر انسانا۔

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں انسان کا معنی بشر ہے جب کہ دوسرے مصرعہ میں انسان بمعنی آنکھ کی پتلی ہے۔

ردالعجز علی الصدر :۔۔۔ یہ ہے کہ جو لفظ کلام کے ابتداء میں ہو وہی لفظ یا اس کا مترادف یا اس کا ہم جنس کلام کے آخر میں لائیں۔ جیسے وتخشی الناس واللہ احق ان تخشاہ۔

قلب :۔۔۔ یہ ہے کہ حرفوں کے الٹ دینے سے پھر وہی عبارت بن جائے جو پہلے تھی۔ جیسے ربک فکبر۔

تضمین :۔۔۔ یہ ہے کہ شاعر اپنے شعر میں دوسرے شاعر کے شعر کا کچھ حصہ ذکر کرے۔

تلمیح :۔۔۔ یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام میں کسی آیت یا حدیث یا شعر یا قصہ یا کہاوت کی طرف اشارہ کرے۔ جیسے :

فواللہ ماادری آحلام نائم

المت بناام کان فی الرکب یوشع

برأت استہلال :۔۔۔ یہ ہے کہ ابتدائے کلام میں ایسے الفاظ لائیں جو مقصود کے مناسب ہوں اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہو۔ جیسے قل ھواللہ احد۔

سجع :۔۔۔ نثر کی صورت میں آخری حرف میں دو فاصلوں کا موافق ہونا سجع کہلاتا ہے۔

آخر میں یہ کتاب شامل کر رہا ہوں تاکہ تشنہ لبی نہ رہ جائے

علم القرآن

تالیف

مفسر قرآن حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی علیہ رحمۃ اللہ الغنی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ؕ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ؕ"

مقدمہ

ترجمہ قرآن سے پہلے اس قاعدے کو یاد رکھنا ضروری ہے۔
آیات قرآنیہ تین طرح کی ہیں بعض وہ جن کا مطلب عقل وفہم سے وراہے جس تک دماغوں کی رسائی نہیں انہیں "تشابہات" کہتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جن کے معنی ہی سمجھ میں نہیں آتے جیسے الم ، حم ، الر، وغیرہ انہیں "مقطعات" کہا جاتا ہے۔ بعض وہ آیات ہیں جن کے معنی تو سمجھ میں آتے ہیں مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا مطلب کیا ہے کیونکہ ظاہری معنی بنتے نہیں جیسے
فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ ؕ
تم جدھر منہ کرو ادھر اللہ کا وجہ (منہ) ہے۔ (پ ۱، البقرۃ:۱۱۵)
یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ
اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ (پ ۲۶، الفتح:۱۰)
ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ۟
پھر رب نے عرش پر استوا فرمایا۔ (پ ۸، الاعراف:۵۴)
"وجہ" کے معنی چہرہ۔ "ید" کے معنی ہاتھ۔ "استوا" کے معنی برابر ہونا ہے مگر یہ چیزیں رب کی شان کے لائق نہیں؛ لہٰذا تشابہات میں سے ہیں اس قسم کی آیتوں پر ایمان لانا ضروری ہے مطلب بیان کرنا درست نہیں اور دوسری قسم کی آیات کو "آیات صفات" کہتے ہیں۔
بعض آیات وہ ہیں جو اس درجہ کی مخفی نہیں۔ انہیں قرآنی اصطلاح میں "محکمات" کہتے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے:

ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ مِنۡہُ اٰیٰتٌ مُّحۡکَمٰتٌ ہُنَّ اُمُّ الۡکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِہٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَہَ مِنۡہُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَۃِ وَ ابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِہٖ وَ مَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ

رب وہ ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری اس کی کچھ آیات صفات معنی آرائی ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری وہ ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں گمراہی چاہنے اور اس کے معنی ڈھونڈنے کو اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے۔ (پ 3، آل عمرٰن:7)
ان محکمات میں بعض آیات وہ ہیں جن کے معنی بالکل صاف و صریح ہیں۔ جن کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی جیسے قُلۡ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ﴿۱﴾ الخ۔

فرمادو وہ اللہ ایک ہے۔ انہیں نصوص قطعیہ کہاجاتا ہے۔ اور بعض آیات وہ ہیں جن میں نہ تو متشابہات کی سی پوشیدگی ہے کہ ذہن کی رسائی وہاں تک نہ ہوسکے نہ نصوص قطعیہ کی طرح ظہور ہے کہ تامل کرنا ہی نہ پڑے۔ اس قسم کی آیتوں میں تفسیر کی ضرورت ہے بغیر تفسیر کے صرف ترجمہ کبھی ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔

اس تفسیر کی چار صورتیں ہیں۔ "تفسیر قرآن بالقرآن" کیونکہ خود قرآن بھی اپنی تفسیر کرتا ہے۔ پھر "تفسیر قرآن بالحدیث" کیونکہ قرآن کو جیسا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھا دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ پھر "تفسیر قرآن بالاجماع" یعنی علماء کا جس مطلب پر اتفاق ہوا وہی درست ہے۔ پھر "تفسیر قرآن باقوال مجتہدین" ان تمام تفسیروں میں پہلی قسم کی تفسیر بہت مقدم ہے کیونکہ جب خود کلام فرمانے والا رب تعالیٰ ہی اپنے کلام کی تفسیر فرمادے تو اور طرف جانا ہرگز درست نہیں۔ اگر پچاس آیتوں میں ایک مضمون کچھ اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہو اور ایک آیت میں اس کی تفصیل کر دی گئی ہو تو یہ آیت ان پچاس آیتوں کی تفسیر ہوگی اور ان پچاس کا وہی مطلب ہوگا جو اس آیت نے بیان کیا۔ مثال سمجھو رب تعالیٰ نے بہت جگہ اہل کتاب کو مخاطب فرمایا ہے یا ان کا ذکر کیا ہے۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ

فرمادو کہ اے کتاب والو آؤ ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں۔ (پ3، آل عمرٰن:64)

اہل کتاب کا ذکر بہت جگہ ہے مگر پتا یہ نہ لگتا تھا کہ کتاب سے کونسی کتاب مراد ہے اور اہل کتاب کون لوگ ہیں کیونکہ قرآن کو بھی کتاب کہا گیا ہے اور باقی تمام انسانی اور رحمانی کتابوں کو بھی کتاب کہتے ہیں۔ ہم نے قرآن سے اس کی تفسیر پوچھی تو خود قرآن نے فرمایا:

الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

وہ لوگ جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے (پ4، اٰل عمرٰن:186)

اس آیت نے ان تمام آیتوں کی تفسیر فرمادی اور بتادیا کہ اہل کتاب نہ ہندو، سکھ ہیں کہ ان کے پاس آسمانی کتاب ہی نہیں۔ نہ مسلمان مراد ہیں کیونکہ اس کتاب سے پہلی آسمانی کتابیں مراد ہیں صرف عیسائی، یہودی یعنی انجیل و توریت کے ماننے والے مراد ہیں اسی طرح قرآن شریف نے جگہ جگہ صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ

یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس کی پیروی کرو دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو۔ (پ8، الانعام:153)

مگر ان آیات میں نہ بتایا کہ سیدھا راستہ کونسا ہے ہم نے قرآن سے پوچھا تو اس نے اس کی تفسیر کی ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ

ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت دے۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ (پ1، الفاتحہ:5۔6)

اس آیت نے بتایا کہ قرآن میں جہاں کہیں سیدھا راستہ بولا گیا ہے اس سے وہ دین اور وہ مذہب مراد ہے جو اولیاء اللہ، علماء دین، صالحین کا مذہب ہو یعنی مذہب اہل سنت، نئے دین و مذہب ٹیڑھے راستہ ہیں اگرچہ اس مذہب کے بانی سارا قرآن ہی پڑھ کر ثابت کریں کہ یہ

مذہب سچا ہے جیسے قادیانی، دیوبندی، شیعہ وغیرہ، اسی طرح قرآن شریف نے جگہ جگہ غیر اللہ کو پکارنے سے منع فرمایا اور پکارنے والے پر کفر و شرک کا فتویٰ دے دیا۔

وَلَا تَدۡعُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ‌ۚ فَاِنۡ فَعَلۡتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۰۶﴾

اور خدا کے سوا کسی ایسے کو نہ پکارو جو نہ تمہیں نفع دے اور نہ نقصان پھر اگر تم نے ایسا کیا تو تم ظالموں میں سے ہو گے۔ (پ ۱۱، یونس:۱۰۶)

وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ يَّدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ

اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو غیر خدا کو پکارتے ہیں۔ (پ ۲۶، الاحقاف:۵)

وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ قَبۡلُ

اور غائب ہو گئے ان سے وہ جنہیں پہلے یہ پکارتے تھے۔ (پ ۲۵، حٰم السجدۃ:۴۸)

وَالَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ مَا يَمۡلِكُوۡنَ مِنۡ قِطۡمِيۡرٍ ؕ﴿۱۳﴾

تم خدا کے سوا جسے پکارتے ہو وہ چھلکے کے بھی مالک نہیں۔ (پ ۲۲، فاطر:۱۳)

اس قسم کی بیسیوں آیات ہیں جن میں غیر خدا کو پکارنے سے منع فرمایا گیا بلکہ پکارنے والوں کو مشرک کہا گیا اگر ان آیتوں کو مطلق رکھا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ حاضر، غائب، زندہ، مردہ، کسی کو نہ پکارو لیکن یہ معنی خود قرآن کی دوسری آیات کے بھی خلاف ہیں اور عقل کے بھی۔ خود قرآن کریم نے فرمایا: اُدۡعُوۡهُمۡ لِاٰبَآئِهِمۡ انہیں ان کے باپوں کی نسبت سے پکارا کرو۔ (پ ۲۱، الاحزاب:۵)

وَالرَّسُوۡلُ يَدۡعُوۡكُمۡ فِىۡۤ اُخۡرٰٮكُمۡ

اور رسول تم کو پچھلی جماعت میں پکارتے تھے۔ (پ ۴، آل عمران:۱۵۳)

ثُمَّ ادۡعُهُنَّ يَاۡتِيۡنَكَ سَعۡيًا ؕ

اے ابراہیم پھر ان ذبح کئے ہوئے مردہ جانوروں کو پکارو وہ تم تک دوڑتے آئیں گے۔ (پ ۳، البقرۃ:۲۶۰)

اس قسم کی بیسیوں آیتیں ہیں جن میں زندوں اور مردوں کے پکارنے کا ذکر ہے۔ نیز ہم دن رات ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔ نماز میں بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو پکار کر سلام عرض کرتے ہیں۔ "اَلسَّلَامُ عَلَيۡكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحۡمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُه" اے نبی تم پر سلام اور اللہ کی رحمت اور برکتیں ہوں۔

لہٰذا ضرورت پڑی کہ ہم قرآن شریف سے ہی پوچھیں کہ ممانعت کی آیتوں میں پکارنے سے کیا مراد ہے تو قرآن شریف نے اس کی تفسیر یوں فرمائی۔

وَمَنۡ يَّدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرۡهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ؕ

اور جو کوئی اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو پکارے جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہو گا۔ (پ ۱۸، المؤمنون:۱۱۷)

فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾

اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔(پ۲۹،الجن:۱۸)

ان آیتوں نے بتایا کہ جن آیتوں میں غیر خدا کو پکارنے سے روکا گیا ہے وہاں اسے خدا سمجھ کر پکارنا یا اللہ کے ساتھ ملا کر پکارنا مراد ہے یعنی پوجنا۔ لہٰذا ان آیتوں کی تفسیر سے تمام ممانعت کی آیتوں کا یہ مطلب ہو گا۔ اس تفسیر سے مطلب ایسا صاف ہو گیا کہ کسی قسم کا کوئی اعتراض پڑ سکتا ہی نہیں۔ نیز فرماتا ہے:

وَ مَنۡ اَضَلُّ مِمَّنۡ یَّدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَنۡ لَّا یَسۡتَجِیۡبُ لَہٗۤ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ وَ ہُمۡ عَنۡ دُعَآئِہِمۡ غٰفِلُوۡنَ ﴿۵﴾ وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوۡا لَہُمۡ اَعۡدَآءً وَّ کَانُوۡا بِعِبَادَتِہِمۡ کٰفِرِیۡنَ ﴿۶﴾

اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو خدا کے سوا انہیں پکارے جو اس کی قیامت تک نہ سنے اور انہیں اسی کی پکار (پوجا) کی خبر تک نہیں اور جب لوگوں کا حشر ہو گا تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت کے منکر ہو جائیں گے۔(پ26،الاحقاف:5۔6)

اس آیت میں صاف طور پر پکارنے کو عبادت فرمایا کہ قیامت میں یہ بت ان مشرکوں کی عبادت یعنی اس پکار کے منکر ہو جائیں گے معلوم ہوا کہ پکارنے سے وہی پکار نا مراد ہے جو عبادت ہے، یعنی "اِلٰہ" سمجھ کر پکارنا۔ اس لئے عام مفسرین ممانعت کی آیات میں "دعا" کے معنی "پوجا" کرتے ہیں۔ جن وہابیوں نے ممانعت کی آیتوں میں دعا کے معنی پکار کئے اور پھر بات بنانے کے لئے اپنے گھر سے قیدیں لگائیں کہ پکارنے سے مراد ہے دور سے پکارنا، مافوق الاسباب پکار سننے کے عقیدے سے پکارنا یا مردوں کو پکارنا بالکل غلط ہے۔ اولاً تو اس لئے کہ یہ قیدیں قرآن نے کہیں نہیں لگائیں۔ دوسرے اس لئے کہ یہ تفسیر خود قرآنی تفسیر کے خلاف ہے۔ تیسرے اس لئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام صحابہ عظام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے مردہ کو بھی پکارا ہے اور دور سے سینکڑوں میل سے پکارا ہے اور وہ پکار سنی گئی ہے جیسا کہ باب مسائل قرآنیہ میں بیان ہو گا۔ لہٰذا یہ تفسیر باطل ہے۔

تفسیر قرآن بالقرآن کی اور مثال سمجھو کہ رب تعالیٰ نے جگہ جگہ خدا کے سوا کو ولی ماننے سے منع فرمایا بلکہ فرمایا کہ جو کوئی غیر خدا کو ولی بنائے وہ گمراہ ہے، کافر ہے، مشرک ہے۔ فرماتا ہے:

وَمَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۰۷﴾

تمہارا خدا کے سوا نہ کوئی ولی ہے اور نہ مددگار۔(پ۲۰،العنکبوت:۲۲)

مَثَلُ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَوۡلِیَآءَ کَمَثَلِ الۡعَنۡکَبُوۡتِ ۚۖ اِتَّخَذَتۡ بَیۡتًا ؕ وَ اِنَّ اَوۡہَنَ الۡبُیُوۡتِ لَبَیۡتُ الۡعَنۡکَبُوۡتِ

ان کی مثال جنہوں نے اللہ کے سوا اور ولی بنائے مکڑی کی سی ہے جس نے جالا بنا اور بے شک سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی کا ہے ۔(پ20،العنکبوت:41)

پھر فرماتا ہے:

اَفَحَسِبَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنۡ یَّتَّخِذُوۡا عِبَادِیۡ مِنۡ دُوۡنِیۡۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا جَہَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ نُزُلًا

تو کیا سمجھ رکھا ہے ان کافروں نے جنہوں نے میرے بندوں کو میرے سوا ولی بنایا ہم نے کافروں کیلئے آگ تیار کی ہوئی ہے۔﴿102﴾
(پ16،الکہف:102)

اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں ولی کے معنی دوست بھی ہیں اور مدد گار بھی، مالک بھی وغیرہ۔ اگر ان آیات میں ولی کے معنی مدد گار کئے جائیں اور کہا جائے کہ جو خدا کے سوا کسی کو مدد گار سمجھے وہ مشرک اور کافر ہے تو نقل و عقل دونوں کے خلاف ہے نقل کے تو اس لئے کہ خود قرآن میں اللہ کے بندوں کے مدد گار ہونے کا ذکر ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

خداوندا ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی ولی اور مدد گار مقرر فرمادے۔(پ5،النسآء:75)

فرماتا ہے:

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ﴿۴﴾

پس اپنے نبی کا مدد گار اللہ اور جبریل اور نیک مسلمان اور اس کے بعد فرشتے مدد گار ہیں۔(پ28،التحریم:4)

فرماتا ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾

تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور وہ مومن بندے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور وہ رکوع کرتے ہیں۔
(پ6،المائدۃ:55)

فرماتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ

مومن مرد اور مومن عورتیں ان کے بعض بعض کے ولی ہیں۔(پ10،التوبۃ:71)

اس قسم کی بہت آیات ملیں گی۔

عقل کے خلاف اس لئے ہے کہ دنیاودین کا قیام ایک دوسرے کی مدد پر ہی ہے، اگر امداد باہمی بند ہو جائے تو نہ دنیا آباد رہے نہ دین۔ پھر ایسی ضروری چیز کو رب شرک کیسے فرما سکتا ہے۔ آؤ اب اس ممانعت کی تفسیر قرآن کریم سے پوچھیں، جب قرآن کریم کی تحقیق کی تو پتا لگا کہ کسی کو ولی ماننا چار طرح کا ہے جن میں سے تین قسم کا ولی ماننا تو کفر و شرک ہے اور چوتھی قسم کا ولی ماننا عین ایمان ہے۔

(۱) رب تعالیٰ کو کمزور جان کر کسی اور کو مدد گار ماننا یعنی رب ہماری مدد نہیں کر سکتا ہے لہٰذا فلاں مدد گار ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

اور نہیں ہے اللہ کا کوئی ولی کمزوری کی بنا پر اور اس کی بڑائی بولو۔(پ15، بنیٓ اسرآءیل:111)

(۲) خدا کے مقابل کسی کو مدد گار جاننا یعنی رب تعالیٰ عذاب دینا چاہے اور ولی بچالے۔ فرماتا ہے:

اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ

یہ کفار خدا کو عاجز نہیں کرسکتے زمین میں اور نہ کوئی خدا کے مقابل ان کا ولی مددگار ہے۔(پ12،ہود:20)

رب تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ مُّقِیْمٍ ﴿۴۵﴾

خبردار! کفار ہمیشہ کے عذاب میں ہیں۔(پ25،الشوریٰ:45)

رب تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِیَآءَ یَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ

اور ان کا کوئی ولی نہ ہوگا جو اللہ کے مقابل ان کی مدد کرے۔(پ25،الشوری:46)

رب تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَ لَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ﴿۱۷﴾

فرمادو! کہ کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچائے اگر وہ تمہارا برا چاہے یا تم پر مہر فرمانا چاہے اور وہ اللہ کے مقابل کوئی ولی نہ پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔(پ21،الاحزاب:17)

رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ مَنْ یَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِیْرًا ﴿ؕ۵۲﴾

اور جس پر خدا لعنت کردے اس کا مددگار کوئی نہیں۔(پ5،النسآء:52)

رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِیٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ

جسے اللہ گمراہ کردے اس کے بعد اس کا کوئی ولی نہیں۔(پ25،الشوری:44)

ان آیات میں خدا کے مقابل ولی، مددگار کا انکار کیا گیا ہے ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی ہی آیات ہیں جن میں ولی کے یہ معنی ہیں۔

(۳) کسی کو مددگار سمجھ کر پوجنا یعنی ولی بمعنی معبود۔

رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ

اور جنہوں نے رب کے سوا اور ولی بنائے کہتے ہیں ہم تو انہیں نہیں پوجتے مگر اس لئے کہ ہمیں وہ اللہ سے قریب کردیں ۔(پ23،الزمر:3)

وَ الَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ

اور وہ جو خدا کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے۔(پ19،الفرقان:68)

اس آیت میں ولی بمعنی معبود ہے اس لئے اس کے ساتھ عبادت کا ذکر ہے۔ یہ تین طرح کا ولی ماننا کفر و شرک ہے اور ایسا ولی ماننے والا مشرک و مرتد ہے چوتھی قسم کا ولی وہ کہ کسی کو اللہ کا بندہ سمجھ کر اللہ کے حکم سے اسے مدد گار مانا جائے اور اس کی مدد کو رب تعالیٰ کی مدد کا مظہر سمجھا جاوے یہ بالکل حق ہے جس کی آیات ابھی ابھی گزر چکیں۔

ان آیات نے تفسیر کر دی کہ ممانعت کی آیات میں پہلی تین قسم کے ولی مراد ہیں اور ثبوت اولیاء کی آیات میں چوتھی قسم کے ولی مراد ہیں۔ سبحان اللہ !اس قرآنی تفسیر سے کوئی اعتراض باقی نہ رہا لیکن وہابی جب اس تفسیر سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں تو اب ولی میں قید لگاتے ہیں کہ مافوق الاسباب کسی کو مدد گار ماننا شرک ہے یہ تفسیر نہایت غلط ہے اولا تو اس لئے کہ مافوق الاسباب کی قید ان کے گھر سے لگی ہے۔ قرآن میں نہیں ہے دوسرے اس لیے کہ یہ تفسیر قرآن کے خلاف ہے جو ہم نے عرض کی تیسرے یہ کہ اللہ کے بندے مافوق الاسباب مدد کرتے ہیں ۔جس کی آیات باب مسائل قرآنیہ میں عرض ہوں گی غرضیکہ یہ تفسیر باطل ہے اور قرآنی تفسیر بالکل صحیح ہے یہ تفسیر قرآن بالقرآن کی چند مثالیں عرض کیں۔

تفسیر قرآن بالحدیث کی بہت سی مثالیں ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ﴿۴۳﴾

نماز قائم کرو زکوۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔(پ 1،البقرۃ:43)

رب تعالیٰ فرماتا ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ

اے ایمان والو!تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے تم سے پہلے والوں پر فرض کئے گئے تھے۔(پ2،البقرۃ:183)

رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیۡتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا ؕ

لوگوں پر اللہ کے لیے بیت اللہ کا حج ہے جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو.(پ4،اٰل عمرٰن:97)

اس کے علاوہ تمام احکام کی آیتیں تفصیل اور تفسیر چاہتی ہیں مگر قرآن کریم نے ان کی نہ مکمل تفسیر فرمائی نہ تفصیل۔ نماز کے اوقات، رکعات کی تعداد، زکوۃ کے نصاب اور خود زکوۃ کی تعداد اور شرائط، روزے کے فرائض و ممنوعات، حج کے شرائط و ارکان تفصیلاً نہ بتائے، ان آیات میں ہم حدیث کے محتاج ہوئے اور تمام تفاصیل وہاں سے معلوم کیں غرضیکہ تفصیل طلب آیات میں بغیر تفسیر کے ترجمہ بے فائدہ بلکہ خطرناک ہے اور تفسیر محض اپنی رائے سے نہیں ہو سکتی ہم اپنی اس کتاب میں ترجمہ کرنے کے قواعد، بعض ضروری قرآنی مسائل اور قرآن کریم کی کچھ ضروری اصطلاحیں بیان کریں گے مگر ہر چیز کی تفسیر خود قرآن شریف سے پیش کریں گے اگر تائید میں کوئی حدیث بھی پیش کی جاوے تو اسے بھی قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے گا کیونکہ آج کل اس طرز استدلال کو مسلمان بہت پسند کرتے ہیں اور اس سے زیادہ مانوس ہیں ضرورت زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے اس پر قلم اٹھایا گیا ہے۔

پہلا باب

اصطلاحات قرآنیہ

قرآن شریف میں بعض الفاظ کسی خاص معنی میں استعمال فرمائے گئے ہیں کہ اگر اس کے علاوہ ان کے دوسرے معنی کیے جائیں تو قرآن کا مقصد بدل جاتا ہے یا فوت ہو جاتا ہے ان اصطلاحوں کو بہت یاد رکھنا چاہیئے تا کہ ترجمہ میں دھوکا نہ ہو۔

ایمان

ایمان امن سے بنا ہے جس کے لغوی معنی امن دینا ہے اصطلاح شریعت میں ایمان عقائد کا نام ہے جن کے اختیار کرنے سے انسان دائمی عذاب سے بچ جاوے جیسے توحید، رسالت، حشر و نشر، فرشتے، جنت، دوزخ اور تقدیر کو ماننا وغیرہ وغیرہ جس کا کچھ ذکر اس آیت میں ہے۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

سب مومن اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے رسولوں میں فرق نہیں کرتے (پ3، البقرۃ:285)

لیکن اصطلاح قرآن میں ایمان کی اصل جس پر تمام عقیدوں کا دارومدار ہے یہ ہے کہ بندہ حضور صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم کو دل سے اپنا حاکم مطلق مانے۔ اپنے کو ان کا غلام تسلیم کرے کہ مومن کے جان، مال، اولاد سب حضور کی ملک ہیں اور نبی صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم کا سب مخلوق سے زیادہ ادب واحترام کرے۔ اگر اس کو مان لیا تو توحید اور کتب، فرشتے وغیرہ تمام ایمانیات کو مان لیا اور اگر اس کو نہ مانا تو اگرچہ توحید، فرشتے، حشر نشر، جنت ودوزخ سب کو مانے مگر قرآن کے فتوے سے وہ مومن نہیں بلکہ کافر و مشرک ہے۔ ابلیس پکا موحد، نمازی، ساجد تھا۔ فرشتے، قیامت، جنت ودوزخ سب کو مانتا تھا مگر رب تعالٰی نے فرمایا: وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ شیطان کافروں میں سے ہے۔ (البقرۃ:۳۴) کیوں؟ صرف اس لئے کہ نبی کی عظمت کا قائل نہ تھا۔ غرض ایمان کا مدار قرآن کے نزدیک عظمت مصطفی صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم پر ہے۔ ان آیات میں یہی اصطلاح استعمال ہوئی۔

(۱) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

اے محبوب! تمہارے رب کی قسم! یہ سارے توحید والے اور دیگر لوگ اس وقت تک مومن نہ ہونگے جب تک کہ تم کو اپنا حاکم نہ مانیں اپنے سارے اختلاف و جھگڑوں میں پھر تمہارے فیصلے سے دلوں میں تنگی محسوس نہ کریں اور رضا و تسلیم اختیار کریں۔ (پ5، النساء:65)

پتا چلا کہ صرف توحید کا ماننا ایمان نہیں اور تمام چیزوں کا ماننا ایمان نہیں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو حاکم ماننا ایمان ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(2)وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۸﴾

لوگوں میں بعض وہ(منافق) بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت پر ایمان لائے مگر وہ مومن نہیں۔(پ1،البقرۃ:8)

دیکھو اکثر منافق یہودی تھے جو خدا کی ذات وصفات اور قیامت وغیرہ کو مانتے تھے مگر انہیں رب نے کافر فرمایا کیونکہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں مانتے تھے اس لیے انہوں نے اللہ کا اور قیامت کا نام تو لیا مگر حضور مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا نام نہ لیا رب نے انہیں مومن نہیں مانا۔ فرماتا ہے:

(3)يَشۡهَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ لَكٰذِبُوۡنَ ﴿۱﴾

جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اللہ بھی جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں اوراللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔(پ28،المنٰفقون:1)

پتا چلا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو فقط زبانی طور پر معمولی طریقہ سے مان لینے کا دعویٰ کر دینا مومن ہونے کیلئے کافی نہیں، انہیں دل سے ماننے کا نام ایمان ہے۔ سبحان اللہ! قول سچا مگر قائل جھوٹا کیونکہ یہاں دل کی گہرائیوں سے دیکھا جاتا ہے۔

ما دروں را بنگریم و حال را   ما بروں را ننگریم و قال را

(4)وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّلَا مُؤۡمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَمۡرًا اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ مِنۡ اَمۡرِهِمۡ ؕ

اور نہ کسی مسلمان مرد نہ مسلمان عورت کو حق ہے کہ جب اللہ اور رسول کچھ حکم فرمادیں تو انہیں اپنے معاملہ کا کچھ اختیار رہے ۔(پ22،الاحزاب:36)

اس آیت نے بتایا کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے سامنے مومن کو اپنی جان کے معاملات کا بھی اختیار نہیں، یہ آیت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ نکاح کرنے کو تیار نہ تھیں۔ (التفسیر الکبیر، الجزء الخامس والعشرون، سورۃ الاحزاب، تحت الآیۃ ۳۶، ج۹، ص۱۶۹، دار احیاء التراث العربی بیروت) مگر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے نکاح ہو گیا۔ ہر مومن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا غلام اور ہر مومنہ ان سرکار کی لونڈی ہے۔ یہ ہے

حقیقت ایمان۔

(5)اَلنَّبِيُّ اَوۡلٰى بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَاَزۡوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمۡ ؕ

نبی مومنوں کے ان کی جان سے بھی زیادہ مالک ہیں اور نبی کی بیویاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔(پ21،الاحزاب:6)

جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ہماری جان سے بھی زیادہ ہمارے مالک ہوئے تو ہماری اولاد مال کے بدرجہ اولی مالک ہیں۔

(٦) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۲﴾

اے ایمان والو! اپنی آوازیں ان نبی کی آواز پر اونچی نہ کرو نہ ان کی بار گاہ میں ایسے چیخ کر بولو جیسے بعض بعض کیلئے خطرہ ہے کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ (پ ۲٦، الحجرات: ۲)

پتا چلا کہ ان کی تھوڑی سی بے ادبی کرنے سے نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں اور اعمال کی بربادی کفر وار تداد سے ہوتی ہے معلوم ہوا کہ ان کی ادنیٰ گستاخی کفر ہے۔

(7) قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٦٥﴾ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ۚ

فرمادو کہ کیا تم اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنستے ہو بہانے نہ بناؤ تم کافر ہو چکے مسلمان ہو کر۔ (پ10، التوبۃ65-66)

جن منافقین کا اس آیت میں ذکر ہے انہوں نے ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے علم غیب کا مذاق اڑایا تھا کہ بھلا حضور کب روم پر غالب آسکتے ہیں اس گستاخی کو رب کی آیتوں کی گستاخی قرار دے کر ان کے کفر کا فتویٰ صادر فرمایا کس نے؟ کسی مولوی نے؟ نہیں! بلکہ خود اللہ جل شانہ نے۔

(8) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۗ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

اے ایمان والو! میرے پیغمبر سے راعنانہ کہا کرو انظرنا کہا کرو خوب سن لو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (پ1، البقرۃ:104)

اس سے پتا لگا کہ جو کوئی توہین کے لئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی بار گاہ میں ایسا لفظ بولے جس میں گستاخی کا شائبہ بھی نکلتا ہو وہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ (جیسے راعنا)

خلاصہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو قرآن میں ہر جگہ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر پکارا، موحد یا نمازی یا مولوی یا فاضل دیو بند کہہ کر نہ پکارا تا کہ پتا لگے کہ رب تعالیٰ کی تمام نعمتیں ایمان سے ملتی ہیں اور ایمان کی حقیقت وہ ہے جو ان آیتوں میں بیان ہوئی یعنی غلامی سرکار مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم۔ توحید نوٹ کا کاغذ ہے اور نبوت اس کی مہر جیسے نوٹ کی قیمت سرکاری مہر سے ہے اس کے بغیر وہ قیمتی نہیں اسی طرح ایمان کے نوٹ کی قیمت بازار قیامت میں جب ہی ہو گی جب اس پر حضور کے نام کی مہر لگی ہو۔ ان سے منہ موڑ کر توحید کی کوئی قیمت نہیں اسی لئے کلمہ میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نام ہے اور قبر میں توحید کا اقرار کرانے کے بعد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پہچان ہے۔ خیال رہے کہ حدیث و قرآن میں بھی مسلمانوں کو موحد نہ کہا گیا بلکہ مومن ہی سے خطاب فرمایا۔

اسلام

اسلام سلم سے بنا جن کے معنی ہیں صلح، جنگ کا مقابل۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس طرف جھک جاؤ۔ (پ10، الانفال:61)

لہٰذا اسلام کے معنی ہوئے صلح کرنا۔ مگر عرف میں اسلام کے معنی اطاعت و فرمانبرداری ہے، قرآن شریف میں یہ لفظ کبھی تو ایمان کے معنی میں آتا ہے اور کبھی اطاعت و فرمانبرداری کرنے کے لئے، ان آیات میں اسلام بمعنی ایمان ہے۔

(1) اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ

پسندیدہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے (پ3، اٰل عمرٰن:19)

(2) هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ

اس رب نے تمہارا نام مسلم رکھا (پ17، الحج:78)

(3) مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا

ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے نہ عیسائی لیکن وہ حنیف ایمان والے تھے۔ (پ3، اٰل عمرٰن:67)

(4) قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾

فرمادو کہ تم مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ جتاؤ بلکہ اللہ تم پر احسان فرماتا ہے کہ تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر تم سچے ہو ۔(پ26، الحجرات:17)

(5) تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

مجھے مومن اٹھا اور صالحوں سے ملا۔ (پ13، یوسف:101)

(6) وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾

اور ہم میں سے کچھ مسلمان ہیں اور کچھ ظالم جو اسلام لائے انہوں نے بھلائی تلاش کر لی۔ (پ29، الجن:14)

ان آیات اور ان جیسی دوسری آیات میں اسلام ایمان کے معنی میں ہے۔ لہٰذا جیسے ایمان کا دار و مدار امت کے لئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی سچی غلامی پر ہے ایسے ہی اسلام کا مدار بھی اس سرکار کی غلامی پر ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمت کا منکر نہ مومن ہے نہ مسلمان جیسے شیطان نہ مومن ہے نہ مسلم بلکہ کافر و مشرک ہے۔

بعض آیات میں اسلام بمعنی اطاعت آیا ہے جیسے

(1) لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

اس اللہ کے فرمانبردار ہیں تمام آسمانوں اور زمینوں کے لوگ۔ (پ3، اٰل عمرٰن:83)

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ہر ایک اس کا مطیع ہے یعنی تکوینی احکام میں۔ (پ۲۱، الروم:۲۶)

یہاں "قانتین" نے "اسلم" کی تفسیر کر دی کیونکہ ساری چیزیں رب تعالیٰ کی تکوینی امور میں مطیع تو ہیں مگر سب مومن نہیں بعض کافر بھی ہیں۔ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ

وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (پ28، التغابن:2)

(2) قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

اے منافقو! یہ نہ کہو کہ تم ایمان لے آئے بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کرلی اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا (پ26، الحجرات:14)

منافق مسلم بمعنی مطیع تو تھے مومن نہ تھے۔

(3) فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿۱۰۳﴾ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

توجب دونوں ابراہیم واسماعیل نے ہمارے حکم پر گردن رکھی اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹادیا (ذبح کیلئے) اور ہم نے ندا کی اے ابراہیم۔ (پ23، الصّٰفّٰت:104،103)

(4) اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

جب فرمایا ابراہیمؑ سے ان کے رب نے مطیع ہو جاؤ عرض کیا کہ میں اللہ رب العالمین کا فرمانبردار ہوا۔ (پ1، البقرۃ:131)

ان دونوں آخری آیات میں اسلام کے معنی ایمان نہیں بن سکتے کیونکہ انبیاءؑ پیدائشی مومن ہوتے ہیں ان کے ایمان لانے کے کیا معنی؟ ان آیات میں اسلام بمعنی اطاعت ہے۔ پہلی آیت میں تکوینی امور کی اطاعت مراد ہے جیسے بیماری، تندرستی، موت، زندگی وغیرہ۔ آخری دوسری دو آیات میں تشریعی احکام کی اطاعت مراد ہے لہٰذا منافق مومن نہ تھے مسلم تھے یعنی مجبوراً اسلامی قوانین کے مطیع ہو گئے تھے۔

تقویٰ

قرآن کریم میں یہ لفظ بہت استعمال ہوا ہے بلکہ ایمان کے ساتھ تقویٰ کا اکثر حکم آتا ہے۔ تقویٰ کے معنی ڈرنا بھی ہیں اور بچنا بھی اگر اس کا تعلق اللہ تعالیٰ یا قیامت کے دن سے ہو تو اس سے ڈرنا مراد ہوتا ہے کیونکہ رب سے اور قیامت سے کوئی نہیں بچ سکتا جیسے

(1) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو! (پ3، البقرۃ:278)

(2) وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا

اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے نہ بدلا دے گا۔ (پ1، البقرۃ:48)

اور اگر تقویٰ کے ساتھ آگ یا گناہ کا ذکر ہو تو وہاں تقویٰ سے بچنا مراد ہو گا جیسے

(3) فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

اور اس آگ سے بچو جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔ (پ1، البقرۃ:24)

اگر تقوی کے بعد کسی چیز کا ذکر نہ ہو نہ رب تعالیٰ کا نہ دوزخ کا تو وہاں دونوں معنی یعنی ڈرنا اور بچنا درست ہیں جیسے

(4) هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

ہدایت ہے ان پرہیز گاروں کے لئے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔(پ1،البقرۃ:2۔3)

(5)فَاصۡبِرۡ ۛؕ اِنَّ الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۹﴾

پس صبر کرو بیشک انجام پرہیز گاروں کے لئے ہے۔(پ12،ھود:49)

قرآن کی اصطلاح میں تقوی کی دو قسمیں ہیں تقویٰ بدن اور تقویٰ دل تقویٰ بدن کا مدار اطاعت خدا اور رسول پر ہے۔فرماتا ہے:

(1)فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۵﴾

تو جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی ان پر نہ خوف ہے نہ وہ غمگین ہوں گے۔(پ8،الاعراف:35)

(2)الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ ؕ﴿۶۳﴾

ولی اللہ وہ ہیں جو ایمان لائے اور پرہیز گاری کرتے تھے۔(پ11،یونس:63)

(3)اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّـكُمۡ فُرۡقَانًا

اگر اللہ کی اطاعت کروگے تو تمہارے لئے فرق بتادے گا۔(پ9،الانفال:29)

دلی تقوی کا دارومدار اس پر ہے کہ اللہ کے پیاروں بلکہ جس چیز کو ان سے نسبت ہو جاوے اس کی تعظیم وادب دل سے کرے۔ تبرکات کا بے ادب دلی پرہیز گار نہیں ہو سکتا۔فرماتا ہے:

(1)وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَى الۡقُلُوۡبِ ﴿۳۲﴾

جو کوئی اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو یہ دل کی پرہیز گاری سے ہے۔(پ17،الحج:32)

(2)وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ؕ

اور جو کوئی اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کرے تو اس کیلئے اس کے رب کے ہاں بہتری ہے۔(پ17،الحج:30)

یہ بھی قرآن کریم ہی سے پوچھو کہ شعائر اللہ یعنی اللہ کی نشانیاں کیا چیز ہیں۔فرماتا ہے:

(3)اِنَّ الصَّفَا وَالۡمَرۡوَةَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنۡ حَجَّ الۡبَيۡتَ اَوِ اعۡتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِ اَنۡ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ

صفا اور مروہ پہاڑ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو کوئی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ اس پر گناہ نہیں کہ ان پہاڑوں کا طواف کرے۔

(پ2،البقرۃ:158)

صفا اور مروہ وہ پہاڑ ہیں جن پر حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں سات بار چڑھیں اور اتریں۔اس اللہ والی کے قدم پڑ جانے کی برکت سے یہ دونوں پہاڑ شعائر اللہ بن گئے اور تاقیامت حاجیوں پر اس پاک بی بی کی نقل اتارنے میں ان پر چڑھنا اور اترنا سات بار لازم ہو گیا۔ بزرگوں کے قدم لگ جانے سے وہ چیز شعائر اللہ بن جاتی ہے۔فرماتا ہے:

(4)وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ

تم لوگ مقام ابراہیم کو جاء نماز بناؤ۔(پ1،البقرۃ:125)

مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ معظمہ کی تعمیر کی وہ بھی حضرت خلیل علیہ السلام کی برکت سے شعائر اللہ بن گیااوراس کی تعظیم ایسی لازم ہوگئی کہ طواف کے نفل اس کے سامنے کھڑے ہو کر پڑھنا سنت ہوگئے کہ سجدہ میں سر اس پتھر کے سامنے جھکے۔

جب بزرگوں کے قدم پڑ جانے سے صفامروہ اور مقام ابراہیم شعائر اللہ بن گئے اور قابل تعظیم ہوگئے تو قبور انبیاءواولیاء جس میں یہ حضرات دائمی قیام فرماہیں یقیناشعائر اللہ ہیں اور ان کی تعظیم لازم ہے۔

رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(5)فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۗ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۗ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

پس لوگ بولے کہ ان اصحاب کہف پر کوئی عمارت بناؤان کارب انہیں خوب جانتا ہے اور وہ بولے جو اس کام میں غالب رہے کہ ہم تو ضرور ان پر مسجد بنائیں گے۔ (پ15،الکھف:21)

اصحاب کہف کے غار پر جو ان کا آرام گاہ ہے گذشتہ مسلمانوں نے مسجد بنائی اور رب نے ان کے کام پر ناراضگی کا اظہار نہ کیاپتالگا کہ وہ جگہ شعائر اللہ بن گئی جس کی تعظیم ضروری ہوگئی۔

(6)وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ

اور قربانی کے جانور (ہدی) ہم نے تمہارے لئے اللہ کی نشانیوں میں سے بنائے تمہارے لئے ان میں خیر ہے۔ (پ17،الحج:36)

جو جانور قربانی کے لئے یاکعبہ معظمہ کیلئے نامزد ہو جائے وہ شعائر اللہ ہے اس کا احترام چاہیے جیسے قرآن کا جزدان اور کعبہ کا غلاف اور زمزم کا پانی اور مکہ شریف کی زمین۔ کیوں؟اس لئے کہ ان کو رب یارب کے پیاروں سے نسبت ہے ان سب کی تعظیم ضروری ہے۔ فرماتا ہے:

(7)لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿۱﴾ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿۲﴾

میں اس شہر مکہ معظمہ کی قسم فرماتاہوں حالانکہ اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرماہو۔ (پ30،البلد:1۔2)

(8)وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ﴿۱﴾ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ﴿۲﴾ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ﴿۳﴾

قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور طور سیناپہاڑ کی اور اس امانت والے شہر مکہ شریف کی۔(پ30،التین:1۔3)

(9)وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ

اور بیت المقدس کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے گھسو اور کہو معافی دے، ہم بخش دیں گے۔(پ1،البقرة:58)

طور سیناپہاڑ اور مکہ معظمہ اس لئے عظمت والے بن گئے کہ طور کو کلیم اللہ سے اور مکہ معظمہ کو حبیب اللہ علیہما السلام سے نسبت ہوگئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے پیاروں کی چیزیں شعائر اللہ ہیں جیسے قرآن شریف، خانہ کعبہ، صفامروہ پہاڑ، مکہ معظمہ، بیت المقدس، طور سینا، مقابر اولیاء اللہ وانبیاء کرام، آب زمزم وغیرہ اور شعائر اللہ کی تعظیم وتوقیر قرآنی فتوے سے دلی تقویٰ ہے جو کوئی نمازی روزہ دار تو ہو مگر اس کے دل میں تبرکات کی تعظیم نہ ہو وہ دلی پرہیز گار نہیں۔

ان آیات قرآنیہ سے معلوم ہوا کہ جہاں کہیں قرآن کریم میں تقویٰ کا ذکر ہے وہاں یہ تقویٰ دلی یعنی متبرک چیزوں کی تعظیم ضرور مراد ہے۔ یہ آیات کریمہ تقویٰ کی تمام آیات کی تفسیر ہیں۔ جہاں تقوی کا ذکر ہو وہاں یہ قید ضروری ہے۔
رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:
اِنَّ الَّذِیۡنَ یَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَہُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوۡبَہُمۡ لِلتَّقۡوٰی ؕ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۳﴾

بے شک جو لوگ اپنی آوازیں رسول اللہ کے نزدیک پست کرتے ہیں یہ وہ ہیں جن کا دل اللہ نے پرہیز گاری کے لئے پرکھ لیا ہے ان کیلئے بخشش اور بڑا ثواب ہے۔ (پ26،الحجرات:3)
معلوم ہوا کہ مجلس میں حضور مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا احترام تقویٰ ہے۔ کیونکہ یہ بھی شعائر اللہ ہے اور شعائر اللہ کی حرمت دلی تقویٰ ہے۔ ایمان جڑ ہے اور
تقوی اس کی شاخیں، پھل وہی کھا سکتا ہے جو ان دونوں کی حفاظت کرے۔ اسی طرح بخشش کے پھل اسی کو نصیب ہوں گے جو ایمان اور تقویٰ دونوں کا حامل ہو۔

کفر

کفر کے معنی چھپانا اور مٹانا ہے اسی لئے جرم کی شرعی سزا کو کفارہ کہتے ہیں کہ وہ گناہ کو مٹا دیتا ہے ایک دوا کا نام کافور ہے کہ وہ اپنی تیز خوشبو سے دوسری خوشبوؤں کو چھپا لیتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:
اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا کَبَآئِرَ مَا تُنۡہَوۡنَ عَنۡہُ نُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَ نُدۡخِلۡکُمۡ مُّدۡخَلًا کَرِیۡمًا ﴿۳۱﴾
اگر تم بڑے گناہوں سے بچو گے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ مٹا دیں گے اور تم کو اچھی جگہ میں داخل کریں گے (پ5،النسآء:31)
قرآن شریف میں یہ لفظ چند معنوں میں استعمال ہوا ہے ناشکری، انکار، اسلام سے نکل جانا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:
(1) لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ وَ لَئِنۡ کَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِیۡ لَشَدِیۡدٌ ﴿۷﴾
اگر تم شکر کرو گے تو تم کو اور زیادہ دیں گے اور اگر تم ناشکری کرو گے تو ہمارا عذاب سخت ہے (پ13،ابرٰہیم:7)
(2) وَاشۡکُرُوۡا لِیۡ وَلَا تَکۡفُرُوۡنِ ﴿۱۵۲﴾
میرا شکر کرو ناشکری نہ کرو (پ2،البقرۃ:152)
(3) وَ فَعَلۡتَ فَعۡلَتَکَ الَّتِیۡ فَعَلۡتَ وَ اَنۡتَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۹﴾
فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم نے اپنا وہ کام کیا جو کیا اور تم ناشکرے تھے (پ19،الشعرآء:19)
ان آیات میں کفر بمعنی ناشکری ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:
(1) فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی

پس جو کوئی شیطان کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے مضبوط گرہ پکڑلی۔(پ3،البقرۃ:256)

(2) يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا اس دن تمہارے بعض بعض کا انکار کریں گے اور بعض بعض پر لعنت کریں گے ۔(پ ۲۰، عنکبوت:۲۵)

(3) وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۶﴾

یہ معبودان باطلہ ان کی عبادت کے انکاری ہوجاویں گے۔ (پ26،الاحقاف:6)

ان تمام آیات میں کفر بمعنی انکار ہے نہ کہ اسلام سے پھر جانا۔رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1) قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱﴾ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲﴾

فرمادو کافرو میں تمہارے معبودوں کو نہیں پوجتا۔ (پ30الکٰفرون:1۔2)

(2) فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ

پس وہ کافر (نمرود) حیران رہ گیا۔ (پ3،البقرۃ:258)

(3) وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

اور کافر لوگ ظالم ہیں۔ (پ3،البقرۃ:254)

(4) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ

وہ لوگ کافر ہوگئے جنہوں نے کہا، اللہ عیسی ابن مریم ہیں۔ (پ6،المآئدۃ:17)

(5) لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ

بہانے نہ بناؤتم ایمان لانے کے بعد کافر ہوچکے (پ10،التوبۃ:66)

(6) فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ

ان میں سے بعض ایمان لے آئے بعض کافر رہے۔ (پ3،البقرۃ:253)

ان جیسی اور بہت سی آیات میں کفر ایمان کا مقابل ہے جس کے معنی ہیں بے ایمان ہو جانا، اسلام سے نکل جانا۔اس کفر میں ایمان کے مقابل تمام چیزیں معتبر ہوں گی یعنی جن چیزوں کا ماننا ایمان تھا ان میں سے کسی کا بھی انکار کرنا کفر ہے۔لہٰذا کفر کی صدہا قسمیں ہوں گی۔خدا کا انکار کفر، اس کی توحید کا انکار یعنی شرک یہ بھی کفر، اسی طرح فرشتے، دوزخ وجنت، حشر نشر، نماز، روزہ، قرآن کی آیتیں، غرضیکہ ضروریات دین میں سے کسی ایک کا انکار کفر ہے۔اسی لئے قرآن شریف میں مختلف قسم کے کافروں کی تردید فرمائی گئی ہے جیسا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ شرک کی بحث میں آوے گا۔

جیسے کہ صدہا چیزوں کے ماننے کا نام ایمان تھا لیکن ان سب کا مدار صرف ایک چیز پر تھا یعنی پیغمبر کو ماننا کہ جس نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو کما حقہ مان لیا۔ اس نے سب کچھ مان لیا۔ اسی طرح کفر کا مدار صرف ایک چیز پر ہے یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا انکار، ان کی عظمت کا انکار، ان کی شان اعلی کا انکار، اصل کفر تو یہ ہے باقی تمام اس کی شاخیں ہیں مثلاً جو رب کی ذات یا صفات کا انکار کرتا ہے وہ بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا منکر ہے کہ حضور نے فرمایا: اللہ ایک ہے۔ یہ کہتا ہے کہ دو ہیں۔ اسی طرح نماز، روزہ وغیرہ انکار ہے کہ وہ سرکار فرماتے ہیں کہ یہ چیزیں فرض ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں۔ کسی ایک کا انکار در حقیقت حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسی لئے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ادنی توہین، ان کی کسی شے کی توہین، قرآنی فتوے سے کفر ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1) وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا

اور وہ کفار کہتے ہیں کہ ہم پیغمبروں پر ایمان لائینگے اور بعض کا انکار کریں گے اور چاہتے ہیں کہ ایمان و کفر کے بیچ میں کوئی راہ نکالیں یہی لوگ یقیناً کافر ہیں (پ6، النسآء:150۔151)

(2) وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

کافروں ہی کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (پ1، البقرۃ:104)

(3) وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾

اور جو لوگ رسول اللہ کو ایذا دیتے ہیں ان ہی کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (پ10، التوبۃ:61)

یعنی صرف کافر کو دردناک عذاب ہے اور صرف اسے دردناک عذاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا دے۔ لہٰذا پتا لگا کہ صرف وہ ہی کافر ہے جو رسول کو ایذا دے اور جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمت واحترام، خدمت، اطاعت کرے وہ سچا مومن ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾

اور جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو جگہ دی اور ان کی مدد کی وہ سچے مسلمان ہیں ان کیلئے بخشش ہے اور عزت کی روزی۔ (پ10، الانفال:74)

رب تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾

کیا انہیں خبر نہیں کہ جو مخالفت کرے اللہ اور اس کے رسول کی تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے ہمیشہ اس میں رہے گا۔ یہ بڑی رسوائی ہے۔

بلکہ جس اچھے کام میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا لحاظ نہ ہو بلکہ ان کی مخالفت ہو وہ کفر بن جاتا ہے اور جس برے کام میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہو وہ ایمان بن جاتا ہے مسجد بنانا اچھا کام ہے لیکن منافقین نے جب مسجد ضرار حضور کی مخالفت کرنے کی نیت سے بنائی تو قرآن نے اسے کفر قرار دیا ہے۔ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّتَفْرِيْقًاۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ

اور وہ لوگ جنہوں نے مسجد بنائی نقصان پہنچانے اور کفر کیلئے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کو اور اس کے انتظار میں جو پہلے سے اللہ اور رسول کا مخالف ہے۔(پ11،التوبۃ:107)

نماز توڑنا گناہ ہے لیکن حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بلانے پر نماز توڑنا گناہ نہیں ہے بلکہ عبادت ہے۔رب تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ

اے ایمان والو اللہ رسول کا بلاوا قبول کرو جب وہ تمہیں بلائیں اس لئے کہ وہ تمہیں زندگی بخشتے ہیں۔(پ9،الانفال:24)

اسی لئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر اونچی آواز کرنے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ادنیٰ گستاخی کرنے کو قرآن نے کفر قرار دیا جس کی آیات ایمان کی بحث میں گزر چکیں۔شیطان کے پاس عبادات کافی تھیں مگر جب اس نے آدم علیہ السلام کے متعلق کہا کہ

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷۶﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۷۷﴾

میں ان سے اچھا ہوں کہ تو نے مجھے آگ سے اور انہیں مٹی سے پیدا کیا رب نے فرمایا یہاں سے نکل جا تو مردود ہو گیا۔(پ23،ص:76۔77)

تو فورا کافر ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام کے جادو گروں نے موسیٰ علیہ السلام کا ادب کیا کہ جادو کرنے سے پہلے عرض کیا

قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

عرض کیا کہ اے موسی یا پہلے آپ ڈالیں یا ہم ڈالنے والے ہوں۔(پ9،الاعراف:115)

اس اجازت لینے کے ادب کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ایک دن میں ایمان، کلیم اللہ کی صحابیت، تقویٰ، صبر، شہادت نصیب ہوئی۔رب نے فرمایا:

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

جادو گر سجدے میں گرا دیئے گئے۔(پ19،الشعرآء:46)

یعنی خود سجدے میں نہیں گرے بلکہ رب کی طرف سے ڈال دیئے گئے۔کافر کے دل میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ادب آجائے تو ان شاء اللہ مومن ہو جائے گا۔اگر مومن کو بے ادبی کی بیماری ہو جائے تو اس کے ایمان چھوٹ جانے کا خطرہ ہے۔

یوسف علیہ السلام کے بھائی قصور مند تھے مگر بے ادب نہ تھے آخر بخش دیئے گئے۔قابیل یعنی آدم علیہ السلام کا بیٹا جرم کے ساتھ نبی کا گستاخ بھی تھا لہٰذا خاتمہ خراب ہوا۔

شرک

شرک کے لغوی معنی ہیں حصہ یا ساجھا۔ لہٰذا شریک کے معنی ہیں حصہ دار یا ساجھی۔

رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1) اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ

کیا ان بتوں کا ان آسمانوں میں حصہ ہے۔ (پ22، فاطر:40)

(2) هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ

کیا تمہارے مملوک غلاموں میں سے کوئی شریک ہے اس میں جو ہم نے تمہیں دیا ہے کہ تم اس میں برابر ہو ان غلاموں سے تم ایسا ڈرو جیسا اپنے نفسوں سے ڈرتے ہو (پ21، الروم:28)

(3) رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ

ایک وہ غلام جس میں برابر کے چند شریک ہوں اور ایک وہ غلام جو ایک ہی آدمی کا ہو۔ کیا یہ دونوں برابر ہیں (پ23، زمر:29)

ان آیتوں میں شرک اور شریک لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی حصہ، ساجھا اور حصہ دار و ساجھی۔ لہٰذا شرک کے لغوی معنی ہیں کسی کو خدا کے برابر جاننا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ان دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔ شرک بمعنی کفر ان آیات میں آیا:

(1) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

اللہ تعالیٰ اس جرم کو نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اس کے سوا جس کو چاہے بخش دے گا۔ (پ5، النسآء:48)

(2) وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ

نکاح نہ کرو مشرکوں سے یہاں تک کہ ایمان لے آویں۔ (پ2، البقرۃ:221)

(3) وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ

مومن غلام مشرک سے اچھا ہے۔ (پ2، البقرۃ:221)

(4) مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ

مشرکوں کو یہ حق نہیں کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں اپنے پر کفر کی گواہی دیتے ہوئے۔(پ10،التوبۃ:17)

ان آیات میں شرک سے مراد ہر کفر ہے کیونکہ کوئی بھی کفر بخشش کے لائق نہیں اور کسی کافر مرد سے مومنہ عورت کا نکاح جائز نہیں اور ہر مومن ہر کافر سے بہتر ہے خواہ مشرک ہو جیسے ہندو یا کوئی اور جیسے یہودی، پارسی، مجوسی۔

دوسرے معنی کا شرک یعنی کسی کو خدا کے برابر جاننا کفر سے خاص ہے کفر اس سے عام یعنی ہر شرک کفر ہے مگر ہر کفر شرک نہیں۔ جیسے ہر کوا کالا ہے مگر ہر کالا کوا نہیں۔ ہر سونا پیلا ہے مگر ہر پیلا سونا نہیں۔ لہٰذا دہریہ کافر ہے مشرک نہیں اور ہندو مشرک بھی ہے کافر بھی۔ قرآن شریف میں شرک اکثر اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے

(1) جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیْمَاۤ اٰتٰىهُمَا

ان دونوں نے خدا کے برابر کر دیا اس نعمت میں جو رب تعالیٰ نے انہیں دی۔(پ9،الاعراف:190)

(2) حَنِیْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۷۹﴾

میں تمام برے دینوں سے بیزار ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔(پ7،الانعام:79)

(3) اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾

بے شک شرک بڑا ظلم ہے۔(پ21، لقمٰن:13)

(4) وَمَا یُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

ان میں سے بہت سے لوگ اللہ پر ایمان نہیں لائے مگر وہ مشرک ہوتے ہیں۔(پ13,یوسف:106)

ان جیسی صدہا آیتوں میں شرک اس معنی میں استعمال ہوا ہے بمعنی کسی کو خدا کے مساوی جاننا۔

شرک کی حقیقت

شرک کی حقیقت رب تعالیٰ سے مساوات پر ہے یعنی جب تک کسی کو رب کے برابر نہ جانا جائے تب تک شرک نہ ہو گا اسی لئے قیامت میں کفار اپنے بتوں سے کہیں گے۔

تَاللّٰهِ اِنۡ كُنَّا لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۹۷﴾

خدا کی قسم ہم کھلی گمراہی میں تھے کہ تم کو رب العالمین کے برابر ٹھہراتے تھے۔(پ19،الشعرآء:97)

اس برابر جاننے کی چند صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی کو خدا کا ہم جنس مانا جائے جیسے عیسائی عیسی علیہ السلام کو اور یہودی عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے تھے اور مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانتے تھے چونکہ اولاد باپ کی ملک نہیں ہوتی بلکہ باپ کی ہم جنس اور مساوی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ ماننے والا مشرک ہو گا۔رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1) وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ؕ بَلۡ عِبَادٌ مُّكۡرَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾

یہ لوگ بولے کہ اللہ نے بچے اختیار فرمائے پاکی ہے اس کے لئے بلکہ یہ اللہ کے عزت والے بندے ہیں۔(پ17،الانبیاء:26)

(2) وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ عُزَيۡرُ ابۡنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ اللّٰهِ

یہودی بولے کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائی بولے کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔(پ10،التوبۃ:30)

(3) وَجَعَلُوۡا لَهٗ مِنۡ عِبَادِهٖ جُزۡءًا ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَكَفُوۡرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿ؕ۱۵﴾

بنادیا ان لوگوں نے اللہ کے لئے اس کے بندوں میں سے ٹکڑا بے شک آدمی کھلا ناشکرا ہے۔(پ25،الزخرف:15)

(4) وَجَعَلُوا الۡمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيۡنَ هُمۡ عِبٰدُ الرَّحۡمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوۡا خَلۡقَهُمۡ ؕ

انہوں نے فرشتوں کو جو رحمن کے بندے ہیں عورتیں ٹھہرایا کیا ان کے بناتے وقت یہ حاضر تھے۔(پ25،الزخرف:19)

(5) اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخۡلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصۡفٰكُمۡ بِالۡبَنِيۡنَ ﴿۱۶﴾

کیا اس نے اپنی مخلوق میں سے بیٹیاں بنالیں اور تمہیں بیٹوں کے ساتھ خاص کیا۔(پ25،الزخرف:16)

(6) وَجَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الۡجِنَّ وَخَلَقَهُمۡ وَخَرَقُوۡا لَهٗ بَنِيۡنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ؕ

اور اللہ کا شریک ٹھہرایا جنوں کو حالانکہ اس نے ان کو بنایا اور اس کیلئے بیٹے اور بیٹیاں گھڑلیں جہالت سے۔(پ7،الانعام:100)

(7) لَيُسَمُّوۡنَ الۡمَلٰٓئِكَةَ تَسۡمِيَةَ الۡاُنۡثٰى ﴿۲۷﴾

یہ کفار فرشتوں کا نام عورتوں کا سار کھتے تھے۔(پ27،النجم:27)

ان جیسی بہت سی آیتوں میں اسی قسم کا شرک مراد ہے یعنی کسی کو رب کی اولاد ماننا دوسرے یہ کہ کسی کو رب تعالی کی طرح خالق مانا جائے جیسے کہ بعض کفار عرب کا عقیدہ تھا کہ خیر کا خالق اللہ ہے اور شر کا خالق دوسرا رب، اب بھی پارسی یہی مانتے ہیں

خالق خیر کو"یزداں"اور خالق شر کو"اہر من"کہتے ہیں۔یہ وہی پرانا مشرکانہ عقیدہ ہے یا بعض کفار کہتے تھے کہ ہم اپنے برے اعمال کے خود خالق ہیں کیونکہ ان کے نزدیک بری چیزوں کا پیدا کرنا برا ہے لہٰذا اس کا خالق کوئی اور چاہیے اس قسم کے مشرکوں کی تردید کے لئے یہ آیات آئیں۔خیال رہے کہ بعض عیسائی تین خالقوں کے قائل تھے جن میں سے ایک عیسی علیہ السلام ہیں ان تمام کی تردید میں حسب ذیل آیات ہیں۔

(1)وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾

اللہ نے تم کو اور تمہارے سارے اعمال کو پیدا کیا۔(پ23،الصافات:96)

(2)اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۫ وَّ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ ﴿۶۲﴾

اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہ ہر چیز کا مختار ہے۔(پ24،الزمر:62)

(3)خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ

اللہ نے موت اور زندگی کو پیدا فرمایا۔(پ29،الملک:2)

(3)اَنَّ اللّٰہَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا۔(پ13،ابرٰھیم:19)

(4)لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ مَرۡیَمَ

بے شک کافر ہوگئے وہ جنہوں نے کہا کہ اللہ وہی مسیح مریم کا بیٹا ہے۔(پ6،المآئدۃ:17)

(5)لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ

بے شک کافر ہوگئے وہ جو کہتے ہیں کہ اللہ تین خداؤں میں تیسرا ہے۔(پ6،المآئدۃ:73)

(6)لَوۡ کَانَ فِیۡہِمَاۤ اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا

اگر زمین وآسمان میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو یہ دونوں بگڑ جاتے۔ا(پ17،الانبیآء:22)

(7)هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ

یہ اللہ کی مخلوق ہے پس مجھے دکھاؤ کہ اس کے سوا اوروں نے کیا پیدا کیا۔(پ21،لقمٰن:11)

ان جیسی تمام آیتوں میں اسی قسم کے شرک کا ذکر ہے اور اسی کی تردید ہے۔اگر یہ مشرک غیر خدا کو خالق نہ مانتے ہوتے تو ان سے یہ مطالبہ کرنا کہ ان معبودوں کی مخلوق دکھاؤ درست نہ ہوتا۔

تیسرے یہ کہ خود زمانہ کو مؤثر مانا جائے اور خدا کی ہستی کا انکار کیا جائے جیسا کہ بعض مشرکین عرب کا عقیدہ تھا۔موجودہ دہریہ انہی کی یادگار ہیں۔رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1)وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍۚ

وہ بولے وہ تو نہیں مگر یہی ہماری دنیا کی زندگی مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں ہلاک نہیں کرتا مگر زمانہ اور انہیں اس کا علم نہیں
۔ (پ25،الجاثیۃ:24)

اس قسم کے دہریوں کی تردید کے لئے تمام وہ آیات ہیں جن میں حکم دیا گیا ہے کہ عالم کی عجائبات میں غور کرو کہ ایسی حکمت والی چیزیں بغیر خالق کے نہیں ہوسکتیں۔

(1)یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾

ڈھکتا ہے رات سے دن کو اس میں نشانیاں ہیں فکر والوں کے لئے۔(پ13،الرعد:3)

(2)اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾

بے شک آسمان وزمین کی پیدائش اور دن رات کے گھٹنے بڑھنے میں نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لئے۔(پ4،اٰل عمرٰن:190)

(3)وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ﴿۲۰﴾ وَفِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین والوں کے لئے اور خود تمہاری ذاتوں میں ہیں تو تم دیکھتے کیوں نہیں۔(پ26،الذٰریٰت:20،21)

(4) اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ﴿۱۷﴾ وَ اِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ ﴿۱۸﴾ وَ اِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ﴿۱۹﴾ وَ اِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ ﴿۲۰﴾

کیا یہ نہیں دیکھتے اونٹ کی طرف کہ کیسے پیدا کیا گیا اور آسمان کی طرف کہ کیسا اونچا کیا گیا اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے گاڑا گیا اور زمین کی طرف کہ کیسے بچھائی گئی۔(پ30،الغاشیۃ:17۔20)

اس قسم کی بیسیوں آیات میں ان دہریوں کی تردید ہے۔

چوتھے یہ عقیدہ کہ خالق ہر چیز کا تو رب ہی ہے مگر وہ ایک بار پیدا کر کے تھک گیا، اب کسی کام کا نہیں رہا، اب اس کی خدائی کی چلانے والے یہ ہمارے معبودین باطلہ ہیں۔ اس قسم کے مشرکین عجیب بکواس کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ چھ دن میں آسمان زمین پیدا ہوئے اور ساتواں دن اللہ نے آرام کار کھا تھکن دور کرنے کو

اب بھی وہ آرام ہی کر رہا ہے۔ چنانچہ فرقہ تعطیلیہ اسی قسم کے مشرکوں کی یادگار ہے۔ ان کی تردید ان آیات میں ہے:

(1) وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ٭ۖ وَّ مَا مَسَّنَا مِنۡ لُّغُوۡبٍ ﴿۳۸﴾

اور بے شک ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے چھ دن میں بنایا اور ہم کو تھکن نہ آئی (پ26،قٓ:38)

(2) اَفَعَیِیۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ؕ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴿۱۵﴾

تو کیا ہم پہلی بار بنا کر تھک گئے بلکہ وہ نئے بننے سے شبہ میں ہیں۔(پ26،قٓ:15)

(3) اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ لَمۡ یَعۡیَ بِخَلۡقِہِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِ َۧ الۡمَوۡتٰی ؕ

اور کیا ان لوگوں نے غور نہ کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور انہیں پیدا کر کے نہ تھکا وہ قادر اس پر بھی ہے کہ مردوں کو زندہ کرے ۔(پ26،الاحقاف:33)

(4) اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۸۲﴾

اس کی شان یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔(پ23،یٰسٓ:82)

اس قسم کے مشرکوں کی تردید کیلئے اس جیسی کئی آیات ہیں جن میں فرمایا گیا کہ ہم کو عالم کے بنانے میں کسی قسم کی کوئی تھکاوٹ نہیں پہنچتی۔ اس قسم کے مشرک قیامت کے منکر اس لئے بھی تھے کہ وہ سمجھتے تھے ایک دفعہ دنیا پیدا فرما کر حق تعالیٰ کافی تھک چکا ہے اب دوبارہ کیسے بنا سکتا ہے۔ معاذ اللہ! اس لئے فرمایا گیا کہ ہم تو صرف

"کُن" سے ہر چیز پیدا فرماتے ہیں تھکن کیسی؟ ہم دوبارہ پیدا کرنے پر بدرجہ اولیٰ قادر ہیں کہ اعادہ سے ایجاد مشکل ہے۔

شرک کی پانچویں قسم

یہ عقیدہ ہے کہ ہر ذرہ کا خالق و مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر وہ اتنے بڑے عالم کو اکیلا سنبھالنے پر قادر نہیں اس لئے اس نے مجبوراً اپنے بندوں میں سے بعض بندے عالم کے انتظام کے لئے چن لئے ہیں جیسے دنیاوی بادشاہ اور ان کے محکمے، اب یہ بندے جنہیں عالم کے انتظام میں دخیل بنایا گیا ہے وہ بندے ہونے کے باوجود رب تعالیٰ پر دھونس رکھتے ہیں کہ اگر ہماری شفاعت کریں تو رب کو مرعوب ہو کر ماننی پڑے اگر چاہیں تو ہماری بگڑی بنادیں، ہماری مشکل کشائی کردیں، جو وہ کہیں رب تعالیٰ کو ان کی ماننی پڑے ورنہ اس کا عالم بگڑ جاوے جیسے اسمبلی کے ممبر کہ اگر چہ وہ سب بادشاہ کی رعایا تو ہیں مگر ملکی انتظام میں ان کو ایسا دخل ہے کہ ملک ان سب کی تدبیر سے چل رہا ہے۔ یہ وہ شرک ہے جس میں عرب کے بہت سے مشرکین گرفتار تھے اور اپنے بت ودّ، یغوث، لات و منات و عزیٰ وغیرہ کو رب کا بندہ مان کر اور سارے عالم کا رب تعالیٰ کو خالق مان کر مشرک تھے۔ اس عقیدے سے کسی کو پکارنا شرک، اس کی شفاعت ماننا شرک، اسے حاجت روا مشکل کشا ماننا شرک، اس کے سامنے جھکنا شرک، اس کی تعظیم کرنا شرک، غرضیکہ یہ برابری کا عقیدہ رکھ کر اس کے ساتھ جو تعظیم و توقیر کا معاملہ کیا جاوے وہ شرک ہے۔ ان کے متعلق قرآن کریم فرماتا ہے:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

ان مشرکین میں سے بہت سے وہ ہیں کہ اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر شرک کرتے ہوئے۔ (پ13، یوسف:106)

کہ خدا کو خالق، رازق مانتے ہوئے پھر مشرک ہیں، انہی پانچویں قسم کے مشرکین کے بارے میں فرمایا گیا:

(1) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

اگر آپ ان مشرکوں سے پوچھیں کہ کس نے آسمان و زمین پیدا کئے اور کام میں لگائے سورج اور چاند تو وہ کہیں گے اللہ نے تو فرماؤ کہ کیوں بھولے جاتے ہیں۔ (پ21 العنکبوت:61)

(2) قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾

فرمادو کہ ہر چیز کی بادشاہی کس کے قبضے میں ہے جو پناہ دیتا ہے اور پناہ نہیں دیا جاتا بتاؤ اگر تم جانتے ہو تو کہیں گے اللہ ہی کی ہے کہو پھر کہاں تم پر جادو پڑا جاتا ہے۔(پ18 المؤمنون:88-89)

(3) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۹﴾

اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کئے تو کہیں گے کہ انہیں غالب جاننے والے اللہ نے پیدا کیا ہے۔(پ25،الزخرف:9)

(4) قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾

فرماؤ کس کی ہے زمین اور اس کی چیزیں اگر تم جانتے ہو تو کہیں گے اللہ کی فرماؤ کہ تم نصیحت حاصل کیوں نہیں کرتے۔(پ18،المؤمنون:84-85)

(5) قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾

فرماؤ کہ سات آسمان اور بڑے عرش کا رب کون ہے؟ تو کہیں گے اللہ کا ہے فرماؤ کہ تم ڈرتے کیوں نہیں۔(پ18،المؤمنون:86-87)

(6) قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾

فرماؤ تمہیں آسمان وزمین سے رزق کون دیتا ہے یا کان آنکھ کا کون مالک ہے اور کون زندے کو مردے سے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے اور کاموں کی تدبیر کون کرتا ہے تو کہیں گے اللہ! فرماؤ تو تم ڈرتے کیوں نہیں؟(پ11،یونس:31)

(7) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور کس نے سورج و چاند تابعدار کیا تو کہیں گے اللہ نے تو فرماؤ تم کدھر پھرے جاتے ہو۔(پ21،العنکبوت:61)

(8) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے آسمان سے پانی اتارا پس زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کیا تو کہیں گے اللہ نے۔(پ21،العنکبوت:63)

اس آیت میں ولی بمعنی معبود ہے اس لئے آگے فرمایا گیا: مَا نَعْبُدُهُمْ

(13) اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْۤ اَوْلِيَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

تو کیا یہ کافر یہ سمجھتے ہیں کہ میرے سوا میرے بندوں کو معبود بنالیں بے شک ہم نے کافروں کی مہمانی کیلئے دوزخ تیار کر رکھی ہے ۔(پ16،الکہف:102)

اس آیت میں بھی ولی بمعنی معبود ہے۔ اس لئے ان ولی بنانے والوں کو کافر کہا گیا۔ کیونکہ کسی کو دوست اور مددگار بنانے سے انسان کافر نہیں ہوتا جیسا کہ پچھلی آیتوں سے معلوم ہوا ہے۔ معبود بنانے سے کافر ہوتا ہے:

(14) مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا

ان کی مثال جنہوں نے خدا کے سوا کوئی معبود بنالیا مکڑی کی طرح ہے جس نے گھر بنایا۔(پ20،العنکبوت:41)

اس آیت میں بھی ولی بمعنی معبود ہے کہ یہاں کفار کی مذمت بیان ہو رہی ہے اور کافر ہی دوسروں کو معبود بناتے ہیں۔

ولی اللہ، ولی من دون اللہ

ولی بمعنی دوست یا مددگار دو طرح کے ہیں ایک اللہ کے ولی، دوسرے اللہ کے مقابل ولی۔ اللہ کے ولی وہ ہیں جو اللہ سے قرب رکھتے ہیں اور اس کے دوست ہوں اور اسی وجہ سے دنیا والے انہیں دوست رکھتے ہیں ولی من دون اللہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کے دشمنوں کو دوست بنایا جائے جیسے کافروں یا بتوں یا شیطان کو،

(12) وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ

جنہوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنالئے اور کہتے ہیں کہ نہیں پوجتے ہم ان کو مگر اس لئے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔(پ23،الزمر:3)

جنہوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنالئے اور کہتے ہیں کہ نہیں پوجتے ہم ان کو مگر اس لئے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔

اس آیت میں ولی بمعنی معبود ہے اس لئے آگے فرمایا گیا: مَا نَعْبُدُهُمْ

(13) اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْۤ اَوْلِيَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

تو کیا یہ کافر یہ سمجھتے ہیں کہ میرے سوا میرے بندوں کو معبود بنالیں بے شک ہم نے کافروں کی مہمانی کیلئے دوزخ تیار کر رکھی ہے ۔(پ16،الکہف:102)

اس آیت میں بھی ولی بمعنی معبود ہے۔اس لئے ان ولی بنانے والوں کو کافر کہا گیا۔کیونکہ کسی کو دوست اور مدد گار بنانے سے انسان کافر نہیں ہو تا جیسا کہ پچھلی آیتوں سے معلوم ہوا ہے۔معبود بنانے سے کافر ہو تا ہے:

(14) مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا

ان کی مثال جنہوں نے خدا کے سوا کوئی معبود بنالیا مکڑی کی طرح ہے جس نے گھر بنایا۔(پ20،العنکبوت:41)

اس آیت میں بھی ولی بمعنی معبود ہے کہ یہاں کفار کی مذمت بیان ہو رہی ہے اور کافر ہی دوسروں کو معبود بناتے ہیں۔

ولی اللہ،ولی من دون اللہ

ولی بمعنی دوست یا مدد گار دو طرح کے ہیں ایک اللہ کے ولی،دوسرے اللہ کے مقابل ولی۔اللہ کے ولی وہ ہیں جو اللہ سے قرب رکھتے ہیں اور اس کے دوست ہوں اور اسی وجہ سے دنیا والے انہیں دوست رکھتے ہیں ولی من دون اللہ کی دو صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ خدا کے دشمنوں کو دوست بنایا جائے جیسے کافروں یا بتوں یا شیطان کو،

دوسرے یہ کہ اللہ کے دوستوں یعنی نبی،ولی کو خدا کے مقابل مدد گار سمجھا جائے کہ خدا کا مقابلہ کر کے یہ ہمیں کام آئیں گے۔ولی اللہ کو ماننا عین ایمان ہے اور ولی من دون اللہ بنانا عین کفر و شرک ہے۔ولی اللہ کے لئے یہ آیت ہے:

(1) اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

خبر دار!اللہ کے دوست نہ ان پر خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہونگے وہ ہیں جو ایمان لائے اور پرہیز گاری کرتے ہیں۔(پ11،یونس:62،63)

اس آیت میں ولی اللہ کا ذکر ہے۔

(2) لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ

مسلمان کافروں کو دوست نہ بنائیں مسلمانوں کے سوا۔(پ3،اٰل عمرٰن:28)

(3) مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

اللہ کے مقابل نہ تمہارا کوئی دوست ہے اور نہ مدد گار (پ1، البقرۃ:107)

ان دو آیتوں میں ولی من دون اللہ کا ذکر ہے۔ پہلی آیت میں دشمنان خدا کو دوست بنانے کی ممانعت ہے۔ دوسری میں خدا کے مقابل دوست کی نفی ہے یعنی رب تعالیٰ کے مقابل دنیا میں کوئی مدد گار نہیں نہ ولی، نہ پیر، نہ نبی۔ یہ حضرات جس کی مدد کرتے ہیں اللہ کے حکم اور اللہ کے ارادے سے کرتے ہیں۔

ولی یا اولیاء کے ان معانی کا بہت لحاظ رکھنا چاہیے۔ بے موقع ترجمہ بدعقیدگی کا باعث ہوتا ہے مثلا۔ اگر نمبرا کی آیت **اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُه،** (المائدۃ:55) کا

ترجمہ یہ کر دیا جائے کہ تمہارے معبود اللہ، رسول اور مومنین ہیں شرک ہو گیا اور اگر

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ (البقرۃ:۱۰۷)

کے یہ معنی کر دیئے جائیں کہ خدا کے سوا کوئی مدد گار نہیں تو کفر ہو گیا کیونکہ قرآن نے بہت سے مدد گاروں کا ذکر فرمایا ہے اس آیت کا انکار ہو گیا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کافروں، ملعونوں کا کوئی مدد گار نہیں۔ معلوم ہوا کہ مومنوں کے مدد گار ہیں۔

(1) وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾

اور جس پر خدا لعنت کر دے اس کے لئے مدد گار کوئی نہیں پاؤ گے۔ (پ5، النسآء:52)

(2) وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْ بَعْدِهٖ **(پ25، الشوریٰ:44)**

اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کے پیچھے کوئی مدد گار نہیں۔

(3) وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾ **(پ15، الکھف:17)**

جسے اللہ گمراہ کر دے اس کیلئے ہادی مرشد آپ نہ پائیں گے۔

دعا

دُعَا دَعْوٌ یا دَعْوۃٌ سے بنا ہے جس کے معنی بلانا یا پکارنا ہے۔ قرآن شریف میں لفظ دعا پانچ معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ۱۔ پکارنا، ۲۔ بلانا، ۳۔ مانگنا یا دعا کرنا، ۴۔ پوجنا یعنی معبود سمجھ کر پکارنا، ۵۔ تمنا آرزو کرنا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1) اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ (پ21، الاحزاب:5)

انہیں ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو یہ اللہ کے نزدیک عدل ہے۔

(2) وَّ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ (پ4، اٰل عمرٰن:153)

اور پیغمبر تم کو تمہارے پیچھے پکارتے تھے۔

(3) لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ (پ18، النور:63)

رسول کے پکارنے کو بعض کے بعض کو پکارنے کی طرح نہ بناؤ۔

ان جیسی تمام آیات میں دعا بمعنی پکارنا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1) اُدْعُ اِلٰى سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (پ14، النحل:125)

اپنے رب کے راستہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحت سے بلاؤ۔

(۲) وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (پ۱، البقرۃ:۲۳)

اور بلاؤ اپنے مددگاروں کو اللہ کے سوا۔

(3) وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ (پ4، اٰل عمرٰن:104)

اور تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے۔

ان جیسی آیات میں دعا کے معنی بلانے کے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1) اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً (پ8، الاعراف:55)

اپنے رب سے عاجزی سے خفیہ طور پر دعا مانگو۔

(2) اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ (پ13، ابراھیم:39)

بے شک میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔

(3) رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ (پ13، ابراھیم:40)

اے ہمارے رب میری دعا سن لے۔

(4) فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (پ21، العنکبوت:65)

جب وہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو خدا سے دعا مانگتے ہیں دین کو اس کیلئے خالص کر کے۔

(5) وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ﴿۴﴾ (پ16، مریم:4)

اے میرے رب میں تجھ سے دعا مانگنے میں کبھی نامراد نہ رہا۔

(6) اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (پ2، البقرۃ:186)

میں دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جب مجھ سے دعا کرتا ہے۔

(7) وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِىْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ (پ13، الرعد:14)

اور نہیں ہے کافروں کی دعا مگر بربادی میں۔

(8) هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ (پ3، اٰل عمرٰن:38)

وہاں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی۔

ان جیسی تمام آیات میں دعا کے معنی دعا مانگنا ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِىْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾ (پ24، حٰمٓ السجدۃ:31)

اور تمہارے لئے جنت میں وہ ہو گا جو تمہارے دل چاہیں اور تمہارے لئے وہاں وہ ہو گا جس کی تم تمنا کرو۔

اس آیت میں دعا بمعنی آرزو کرنا، چاہنا، خواہش کرنا ہے۔

(1) اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (پ9، الاعراف:194)

جنہیں تم خدا کے سوا پوجتے ہو وہ تم جیسے بندے ہیں۔

(2) وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ (پ29،الجن:18)

بے شک مسجدیں اللہ کی ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پوجو۔

(3) وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (پ26،الاحقاف:5)

اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو خدا کے سوا ایسوں کو پوجتا ہے جو اس کی عبادت قبول نہ کرے قیامت تک۔

(4) قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَیْــٴًـا ؕ (پ24،المؤمن:74)

کافر کہیں گے کہ وہ غائب ہو گئے ہم سے بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو نہ پوجتے تھے۔

(5) وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْــٴًـا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿ؕ۲۰﴾ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَآءٍ

(پ14،النحل:20،21)

اور وہ جن کی یہ مشرکین پوجا کرتے ہیں اللہ کے سوا وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ پیدا کئے جاتے ہیں یہ مردے ہیں زندہ نہیں۔

(6) وَ اِذَا رَاَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِیْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ (پ14،النحل:86)

اور جب مشرکین اپنے معبودوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے اے رب ہمارے یہ ہمارے وہ معبود ہیں جنہیں ہم تیرے سوا پوجا کرتے تھے۔

ان جیسی تمام وہ آیات جن میں غیر خدا کی دعا کو شرک و کفر کہا گیا یا اس پر جھڑکا گیا ان سب میں دعا کے معنی عبادت (پوجا) ہے اور یدعون کے معنی ہیں وہ پوجتے ہیں اس کی تفسیر قرآن کی ان آیتوں نے کی ہے جہاں دعا کے ساتھ عبادت یا الٰہ کا لفظ آ گیا ہے، فرماتا ہے:

(1) هُوَ الْحَیُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۵﴾ قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (پ24،المؤمن:66)

وہ ہی زندہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسے پوجو۔ اس کے لئے دین کو خالص کر کے سب خوبیاں اللہ رب العالمین کیلئے ہیں تم فرماؤ میں منع کیا گیا ہوں کہ انہیں پوجوں جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔

اس آیت میں لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور اَنْ اَعْبُدَ نے صاف بتا دیا کہ یہاں دعا سے پوجنا مراد ہے نہ کہ پکارنا۔

(2) وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴿۶۰﴾

(پ24،المؤمن:60)

اور تمہارے رب نے فرمایا کہ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا بیشک وہ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر دوزخ میں جائیں گے

یہاں دعا سے مراد دعا مانگنا ہے اور دعا بھی عبادت ہے اس لئے ساتھ ہی عبادت کا ذکر ہوا فقط پکارنا مراد نہیں۔

(3) وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۵﴾ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِیْنَ ﴿۶﴾ (پ26،الاحقاف:5-6)

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو خدا کے سوا اس کی پوجا کرتا ہے جو قیامت تک اس کی نہ سنیں اور جب لوگوں کا حشر ہو گا تو یہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت سے منکر ہو جاویں گے۔

یہاں بھی دعا سے مراد پکارنا نہیں بلکہ پوجنا یعنی معبود سمجھ کر پکارنا مراد ہے کیونکہ ساتھ ہی ان کے اس فعل کو عبادت کہا گیا ہے۔ ان آیات نے ان تمام کی شرح کر دی جہاں غیر خدا کی دعا کو شرک فرمایا گیا اور بتا دیا کہ وہاں دعا سے مراد پوجنا یا دعا مانگنا ہے اور دعا بھی عبادت ہے اگر غیر خدا کو پکارنا شرک ہوتا تو جن آیتوں میں پکارنے کا حکم دیا گیا۔ ان سے ان آیات کا تعارض ہو جاتا۔ پکارنے کی آیات ہم نے ابھی پیش کر دیں اس لئے عام مفسرین ان ممانعت کی آیتوں میں دعا کے معنی عبادت کرتے ہیں ان کی یہ تفسیر قرآن کی ان آیتوں سے حاصل ہے۔

اعتراض: دعا کے معنی کسی لغت میں عبادت نہیں دعا کے معنی بلانا، ندا کرنا عام لغت میں مذکور ہیں لہٰذا ان تمام آیتوں میں اس کے معنی پکارنا ہی ہیں (جواہر القرآن)

جواب: اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ دعا کے لغوی معنی پکارنا ہیں اور اصطلاحی معنی عبادت ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا جہاں دعا کی اجازت ہے وہاں لغوی پکارنا مراد ہیں اور جہاں غیر خدا کی دعا سے ممانعت ہے وہاں عرفی معنی پوجنا مراد ہیں۔ جیسے لغت میں صلوۃ کے معنی دعا ہیں اور عرفی معنی نماز۔ قرآن میں اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ میں صلوٰۃ سے مراد نماز ہے اور صَلِّ عَلَیْهِمْ اور صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا میں صلوٰۃ سے مراد دعا ہے۔ تمہارا اعتراض ایسا ہے جیسے کوئی نماز کا انکار کر دے اور کہے قرآن میں جہاں بھی صلوٰۃ آیا ہے وہاں دعا مراد ہے کیونکہ یہی اس کے لغوی معنی ہیں ایسے ہی طواف کے لغوی معنی گھومنا ہیں اور اصطلاحی معنی ایک خاص عبادت ہیں قرآن میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے

دوسرے یہ کہ واقعی دعا کے معنی پکارنا ہیں مگر پکارنے کی بہت سی نوعیتیں ہیں جن میں سے کسی کو خدا سمجھ کر پکارنا عبادت ہے، ممانعت کی آیات میں یہی مراد ہے یعنی کسی کو خدا سمجھ کر نہ پکارے۔ اس کی تصریح قرآن کی اس آیت نے فرمادی:

وَمَنۡ یَّدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرۡهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنۡدَ رَب

اور جو خدا کے ساتھ دوسرے خدا کو پکارے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب رب کے پاس ہے۔ِّ ہٖ(پ18،المؤمنون:117)

اس آیت نے خوب صاف فرمادیا کہ پکارنے سے خدا سمجھ کر پکارنا مراد ہے۔

اعتراض: ان ممانعت کی آیتوں میں پکارنا ہی مراد ہے مگر کسی کو دور سے پکارنا مراد ہے یہ سمجھ کر کہ وہ سن رہا ہے یہ ہی شرک ہے۔(جواہر القرآن)

جواب: یہ بالکل غلط ہے۔ قرآن کی ان آیتوں میں دور نزدیک کا ذکر نہیں۔ یہ قید آپ نے اپنے گھر سے لگائی ہے نیز یہ قید خود قرآن کی اپنی تفسیر کے بھی خلاف ہے لہٰذا مردود ہے نیز اگر دور سے پکارنا شرک ہو تو سب مشرک ہو جائیں گے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ منورہ سے حضرت ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پکارا حالانکہ وہ نہاوند میں تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ بنا کر تمام دور کے لوگوں کو پکارا اور تمام روحوں نے جو قیامت تک پیدا ہونیوالی تھیں انہوں نے سن لیا جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ آج نمازی حضور علیہ السلام کو پکارتا ہے: اَلسَّلَامُ عَلَیۡکَ اَیُّهَا النَّبِیّ اے نبی! علیہ الصلوۃ والسلام آپ پر سلام ہو۔ اگر یہ شرک ہو جاوے تو ہر نمازی کی نماز تو پیچھے ختم ہوا کرے ایمان پہلے ختم ہو جاوے آج ریڈیو کے ذریعہ دور سے لوگوں کو پکارتے ہیں اور وہ سن لیتے ہیں اگر کہا جائے کہ ریڈیو کی بجلی کی طاقت ایک سبب ہے اور سبب کے ماتحت دور

سے سننا شرک نہیں تو ہم بھی کہیں گے کہ نبوت کے نور کی طاقت ایک سبب ہے اور سبب کے ماتحت سننا شرک نہیں غرضیکہ یہ اعتراض نہایت ہی لغو ہے۔

اعتراض: ممانعت کی آیتوں میں مردوں کو پکارنا مراد ہے یعنی مرے ہوئے کو پکارنا یہ سمجھ کر کہ وہ سن رہا ہے شرک ہے۔(جواہر القرآن)

جواب: یہ بھی غلط ہے چند وجہ سے ایک یہ کہ یہ قید تمہارے گھر کی ہے قرآن میں نہیں آئی۔ رب تعالیٰ نے مردہ، زندہ، غائب، حاضر، دور نزدیک کی قید لگا کر ممانعت نہ فرمائی۔ لہٰذا یہ قید باطل ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ تفسیر خود قرآن کی تفسیر کے خلاف ہے۔ اس نے فرمایا کہ دعا سے مراد عبادت ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر مردوں کو پکارنا شرک ہو تو ہر نمازی نماز میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کو پکارتا ہے: اَلسَّلَامُ عَلَیۡکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ اے نبی! علیہ الصلوۃ والسلام آپ پر سلام ہو، حالانکہ حضور وفات پا چکے ہیں ہم کو حکم ہے کہ قبرستان جا کر یوں سلام کریں: اَلسَّلَامُ عَلَیۡکُمۡ دَارَ قَوۡمٍ مِّنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ، اے مسلمانوں کے گھر والو! تم پر سلام ہو۔

ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کی ہوئی چڑیوں کو پکارا اور انہوں نے سن لیا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا:

ثُمَّ ادۡعُهُنَّ یَاۡتِیۡنَکَ سَعۡیًا

پھر ان مرے ہوئے پرندوں کو پکارو وہ دوڑتے ہوئے تم تک آجائیں گے۔(پ3،البقرۃ:260)

حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کو ان کی ہلاکت کے بعد پکارا، صالح علیہ السلام کا قصہ سورۂ اعراف میں اس طرح بیان ہوا:

فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ وَقَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسَالَةَ رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَـكُمۡ وَلٰـكِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِيۡنَ ﴿۷۹﴾

تو انہیں زلزلے نے پکڑ لیا تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے تو صالح نے ان سے منہ پھیرا اور کہا اے میری قوم بے شک میں نے تم تک اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمہارا بھلا چاہا مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔(پ8،الاعراف:78۔79)

شعیب علیہ السلام کا واقعہ اسی سورہ اعراف میں کچھ آگے یوں بیان فرمایا:

فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ وَقَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَـكُمۡ‌ ۚ فَكَيۡفَ اٰسٰى عَلٰى قَوۡمٍ كٰفِرِيۡنَ ﴿۹۳﴾

شعیب نے ہلاکت کفار کے بعد ان سے منہ پھیرا اور کہا اے میری قوم! میں نے تجھے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کی تو میں کافر قوم پر کیسے غم کروں؟(پ9،الاعراف:93)

ان دونوں آیتوں میں فَتَوَلّٰى کی ف سے معلوم ہوا کہ ان دونوں پیغمبروں علیہما الصلوۃ والسلام کا یہ خطاب قوم کی ہلاکت کے بعد تھا۔خود ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے بدر کے دن مرے ہوئے ابو جہل، ابو لہب، امیہ ابن خلف وغیرہ کفار سے پکار کر فرمایا اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عرض کرنے پر فرمایا کہ تم ان مردوں سے زیادہ نہیں سنتے۔

(صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی عذاب القبر، الحدیث ۱۳۷۰، ج۱، ص ۴۶۲، دار الکتب العلمیۃ)

کہیے! اگر قرآن کے فتوے سے مردوں کو پکارنا شرک ہے تو ان انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے اس پکارنے کا کیا جواب دوگے۔غرضیکہ یہ اعتراض محض باطل ہے۔

اعتراض: کسی کو دور سے حاجت روائی کے لئے پکارنا شرک ہے اور ممانعت کی آیتوں میں یہی مراد ہے لہٰذا اگر کسی نبی ولی کو دور سے یہ سمجھ کر پکارا گیا کہ وہ ہمارے حاجت روا ہیں تو شرک ہو گیا۔ (جواہر القرآن)

جواب: یہ اعتراض بھی غلط ہے۔اولاً تو اس لئے کہ قرآن کی ممانعت والی آیتوں میں یہ قید نہیں تم نے اپنے گھر سے لگائی ہے۔لہٰذا معتبر نہیں۔دوسرے اس لئے کہ یہ تفسیر خود قرآن کی اپنی تفسیر کے خلاف ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا۔تیسرے اس لئے کہ ہم نے بتا دیا کہ اللہ کے بندے دور

سے سنتے ہیں خواہ نور نبوت سے یا نور ولایت سے۔ دوسرے باب میں ہم عرض کریں گے کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ اللہ کے بندے حاجت روا، مشکل کشا بھی ہیں۔ جب یہ دونوں باتیں علیحدہ علیحدہ صحیح ہیں تو ان کا مجموعہ شرک کیونکر ہو سکتا ہے۔ قرآن فرمارہا ہے کہ اللہ کے بندے وفات کے بعد سن بھی لیتے ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں جو خاص خاص کو محسوس ہوتا ہے۔ رب فرماتا ہے:

وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ ۟ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾

اے حبیب ان رسولوں سے پوچھو جو ہم نے آپ سے پہلے بھیجے کیا ہم نے خدا کے سوا ایسے معبود بنائے ہیں جن کی عبادت کی جاوے ۔(پ25،الزخرف:45)

غور کرو کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں انبیاء سابقین علیہم الصلوۃ والسلام وفات پاچکے تھے۔ مگر رب تعالیٰ فرمارہا ہے کہ اے محبوب! ان وفات یافتہ رسولوں سے پوچھ لو کہ کیا کوئی خدا کے سوا اور معبود ہے اور پوچھا اس سے جاتا ہے جو سن بھی لے اور جواب بھی دے۔ پتا لگا کہ اللہ کے بندے بعد وفات سنتے اور بولتے ہیں معراج کی رات سارے وفات یافتہ رسولوں نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے پیچھے نماز پڑھی۔ حجۃ

الوداع کے موقعہ پر وفات یافتہ رسولوں نے حج میں شرکت کی اور حج ادا کیا۔ اس بارے میں بہت سی صحیح احادیث موجود ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ دعا قرآن کریم میں بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے ہر جگہ اس کے وہ معنی کرنا چاہئیں جو وہاں کے مناسب ہیں۔ جن وہابیوں نے ہر جگہ اس کے معنی پکارنا کئے ہیں وہ ایسے فحش غلط ہیں جس سے قرآنی مقصد فوت ہی نہیں بلکہ بدل جاتا ہے۔ اسی لئے وہابیوں کو اس پکارنے میں بہت سی قیدیں لگانی پڑتی ہیں کبھی کہتے ہیں غائب کو پکارنا، کبھی کہتے ہیں مردہ کو پکارنا، کبھی کہتے ہیں دور سے سنانے کیلئے پکارنا، کبھی کہتے ہیں مافوق الاسباب سنانے کے لئے دور سے پکارنا شرک ہے مگر پھر بھی نہیں مانتے پھر تعجب ہے کہ جب کسی کو پکارنا عبادت ہوا تو عبادت کسی کی بھی کی جائے شرک ہے، زندہ کی یا مردہ کی، قریب کی یا دور کی پھر یہ قیدیں بے کار ہیں۔ غرضکہ یہ معنی نہایت ہی غلط ہیں۔ ان جگہوں میں دعا سے مراد پوجنا ہے۔ اس معنی پر نہ کسی قید کی ضرورت ہے نہ کوئی دشواری پیش آسکتی ہے۔

نوٹ ضروری: اللہ کے پیارے وفات کے بعد زندوں کی مدد کرتے ہیں۔

قرآن شریف سے ثابت ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ

یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جو میں تمہیں کتاب وحکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کرے تو تم اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔(پ3،اٰل عمرٰن:81)

اس آیت سے پتالگا کہ میثاق کے دن رب تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام سے دو وعدے لئے۔ایک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا،دوسرے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرنا۔اور رب تعالیٰ جانتا تھا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ان میں سے کسی کی زندگی میں نہ تشریف لائینگے پھر بھی انہیں ایمان لانے اور مدد کرنے کا حکم دیا معلوم ہوا کہ روحانی ایمان اور روحانی مدد مراد ہے اور انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام نے دونوں وعدوں کو پورا کیا کہ معراج کی رات سب نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے پیچھے نماز پڑھی یہ ایمان کا ثبوت ہے۔بہت سے پیغمبروں نے حج الوداع میں شرکت کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شب معراج دین مصطفی کی اس طرح مدد کی کہ پچاس نمازوں کی پانچ کرادیں۔اب بھی وہ حضرات انبیاءعلیہم الصلوۃ والسلام مسلمانوں کی اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے دین کی روحانی مدد فرمارہے ہیں اگر یہ مدد نہ ہوا کرتی تو یہ عہد لغو ہوتا عیسی علیہ السلام آخر زمانہ میں اس عہد کو ظاہر طور پر بھی پورا فرمانے کے لئے تشریف لائیں گے۔

عبادت

قرآن شریف کی اصطلاحوں میں عبادت بھی بہت اہم اور نازک اصطلاح ہے۔کیونکہ یہ لفظ قرآن شریف میں بہت کثرت سے آیا ہے اور اس کے معنے میں نہایت باریکی ہے۔اطاعت،تعظیم،عبادت ان تینوں میں نہایت لطیف فرق ہے بعض لوگ اس نازک فرق کا اعتبار نہیں کرتے۔ہر تعظیم کو بلکہ ہر اطاعت کو عبادت کہہ کر سارے مسلمانوں بلکہ اپنے بزرگوں کو بھی مشرک وکافر کہہ دیتے ہیں۔اس لئے اس کا مفہوم،اس کا مقصود،بہت غور سے سنیئے۔

عبادت عبدٌ سے بنا ہے بمعنی بندہ،عبادت کے لغوی معنی ہیں بندہ بننا یا اپنی بندگی کا اظہار کرنا جس سے لازم آتا ہے معبود کی الوہیت کا اقرار کرنا مفسرین نے اس کی تعریف انتہائی تعظیم بھی کی ہے اور انتہائی عاجزی بھی۔دونوں تعریفیں درست ہیں کیونکہ عابد کی انتہائی عاجزی سے معبود کی انتہائی تعظیم لازم ہے اور معبود کی انتہائی تعظیم سے عابد کی انتہائی عاجزی مستلزم۔انتہائی تعظیم کی حد یہ ہے کہ معبود کی وہ تعظیم کی جاوے جس سے زیادہ تعظیم ناممکن ہو اور اپنی ایسی عاجزی کی جاوے جس سے نیچے کوئی درجہ متصور نہ ہو اس لئے عبادت کی شرط یہ ہے کہ بندگی کرنیوالا معبود کو الٰہ اور اپنے کو اس کا بندہ سمجھے یہ سمجھ کر جو تعظیم بھی اس کی کریگا عبادت ہوگی۔اگر اسے الٰہ نہیں سمجھتا۔بلکہ نبی،ولی،باپ،استاد،پیر،حاکم،بادشاہ سمجھ کر تعظیم کرے تو اس کا نام اطاعت ہوگا۔توقیر،تعظیم،تبجیل ہوگا،عبادت نہ ہوگا غرضیکہ اطاعت و تعظیم تو اللہ تعالیٰ اور بندوں سب کی ہوسکتی ہے لیکن عبادت اللہ تعالیٰ ہی کی ہوسکتی ہے بندے کی نہیں اگر بندے کی عبادت کی تو شرک ہوگیا اور اگر بندے کی تعظیم کی تو جیسا بندہ ویسا اس کی تعظیم کا حکم۔کوئی تعظیم کفر ہے،جیسے

گنگاجمنا، ہولی، دیوالی کی تعظیم۔ کوئی تعظیم ایمان ہے جیسے پیغمبر کی تعظیم، کوئی تعظیم ثواب ہے، کوئی گناہ۔ اسی لئے قرآن کریم میں عبادت کے ساتھ ہمیشہ اللہ تعالیٰ یارب یاالٰہ کاذکر ہے اور اطاعت و تعظیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا بھی ذکر ہے اور نبی کا بھی، ماں باپ کا بھی حاکم کا بھی فرماتا ہے:

(1) وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

آپ کے رب نے فیصلہ فرمادیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔ (پ15، بنی اسرآءیل:23)

(2) مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ

نہیں کہا تھا میں نے ان سے مگر وہ "ہی" جس کا تونے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے۔ (پ7، المائدۃ:117)

(3) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ

اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو

جس نے تمہیں پیدا کیا۔ (پ1، البقرۃ:21)

(4) نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ

ہم عبادت کرینگے آپ کے الٰہ کی اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق کے الٰہ کی۔ علیہم السلام (پ1، البقرۃ:133)

(5) قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱﴾ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲﴾

فرمادو اے کافرو جن کی تم پوجا کرتے ہو ان کی پوجا میں نہیں کرتا۔ (پ30، الکافرون:1۔2)

ان جیسی ساری عبادت کی آیتوں میں صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوگا لیکن اطاعت و تعظیم میں سب کا ذکر ہوگا۔

(1) اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ

اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے حکم والوں کی۔ (پ5، النسآء:59)

(2) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

جس نے رسول کی فرمانبرداری کی اس نے اللہ کی فرمانبرداری کی۔ (پ5، النسآء:80)

(3)وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ

نبی کی مدد کرو اور ان کی تعظیم و توقیر کرو۔(پ26،الفتح:9)

(4)فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ

پس جو ایمان لائے نبی پر اور تعظیم کی ان کی اور مدد کی۔(پ9،الاعراف:157)

(5)وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآىٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴿۳۲﴾

اور جو اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو یہ دلی پرہیز گاری ہے۔(پ17،الحج:32)

غرضیکہ تعظیم واطاعت بندے کی بھی ہوسکتی ہے لیکن عبادت صرف اللہ کی جب عبادت میں یہ شرط ہے کہ الٰہ جان کر کسی کی تعظیم کرنا تو یہ بھی سمجھ لو کہ الٰہ کون ہے اس کی پوری تحقیق ہم الٰہ کی بحث میں کرچکے کہ الٰہ وہ ہے جسے خالق مانا جائے یا خالق کے برابر۔برابری خواہ خدا کی اولاد مان کر ہو یا اس طرح مستقل مالک، حاکم، حی، قیوم مان کر یا اللہ تعالیٰ کو اس کا حاجت مند مان کر ہو۔ایک ہی کام اس عقیدے سے ہو تو عبادت ہے اور اس عقیدے کے بغیر ہو تو عبادت نہیں۔

دیکھو رب تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو:

(1)فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ﴿۲۹﴾

پس جب میں انہیں برابر کر دوں اور ان میں اپنی روح پھونک دوں تو تم ان کیلئے سجدہ میں گرجاؤ۔(پ14،الحجر:29)

(2)وَ رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا

اور یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر اٹھالیا اور وہ سب ان کے سامنے سجدے میں گر گئے۔(پ13،یوسف:100)

ان آیتوں سے پتا لگا کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انہیں سجدہ کیا اور بھی امتوں میں سجدہ کا رواج تھا کہ چھوٹے بڑوں کو سجدہ کرتے تھے پھر یہ بھی فرمایا:

(3)لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ

سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو۔اور اللہ کو سجدہ کرو۔(پ24،حٰم السجدۃ:37)

اس قسم کی بہت آیتوں میں سجدہ کرنے کو منع فرمایا گیا بلکہ اسے کفر قرار دیا۔ پچھلی آیتوں میں سجدہ تعظیمی مراد ہے اور ان آیتوں میں سجدہ تعبدی مراد ہے۔ بندوں کو تعبدی سجدہ نہ اس سے پہلے کسی دین میں جائز تھا نہ ہمارے اسلام میں جائز، ہمیشہ سے یہ شرک ہے سجدہ تعظیمی پہلے دینوں میں جائز تھا ہمارے اسلام میں حرام، لہٰذا کسی کو سجدہ تعظیمی کرنا اب حرام ہے شرک نہیں۔ لیکن سجدہ تعبدی کرنا شرک ہے۔ ایک ہی کام الوہیت کے عقیدے سے شرک ہے اور بغیر عقیدہ الوہیت شرک نہیں مسلمان سنگ اسود، مقام ابراہیم، آب زمزم کی تعظیم کرتے ہیں مشرک نہیں مگر ہندو بت یا گنگا جل کی تعظیم کرے تو مشرک ہے کیونکہ مومن کا عقیدہ ان چیزوں کی الوہیت کا نہیں اور کفار کا عقیدہ الوہیت کا ہے۔

عبادت کی قسمیں

عبادت بہت طرح کی ہے۔ جانی، مالی، بدنی، وقتی وغیرہ مگر اس کی قسمیں دو ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق براہ راست رب تعالیٰ سے ہو کسی بندے سے نہ ہو، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ، جہاد وغیرہ کہ بندہ ان کاموں سے صرف رب تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کرتا ہے بندے کی رضا کا اس میں دخل نہیں۔ دوسرے وہ جن کا تعلق بندے سے بھی ہے اور رب تعالیٰ سے بھی یعنی جن بندوں کی اطاعت کا رب تعالیٰ نے حکم دیا ہے

ان کی اطاعت خدا کو راضی کرنے کے لئے رب کی عبادت ہے۔ جیسے والدین کی فرمانبرداری، مرشد استاد کی خوشی، نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر درود شریف، اہل قرابت کے حقوق کی ادائیگی غرضیکہ کوئی جائز کام ہو۔ اگر اس میں رب تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کرلی جائے تو وہ رب تعالیٰ کی عبادت بن جاتے ہیں اور ان پر ثواب ملتا ہے حتیٰ کہ جو اپنے بیوی بچوں کو کما کر اس لئے کھلائے کہ یہ سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ہے، رب تعالیٰ اس سے راضی ہوتا ہے تو کمانا بھی عبادت ہے اور جو خدا کا رزق اس لئے کھائے کہ رب تعالیٰ کا حکم ہے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا، اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے، اداءِ فرض کا ذریعہ ہے تو کھانا بھی عبادت ہے۔ اسی لئے مجاہد فی سبیل اللہ غازی کا کھانا، پینا، سونا، جاگنا عبادت ہے بلکہ ان کے گھوڑوں کی رفتار بھی عبادت ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ﴿۱﴾

قسم ہے ان گھوڑوں کی جو دوڑتے ہیں سینے کی آواز نکالتے۔ (پ30، العدیٰت:1)

فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ﴿۲﴾

پھر سم مار کر پتھروں سے آگ نکالتے ہیں۔ (پ30، العدیٰت:2)

فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ﴿۳﴾

پھر صبح ہوتے ہی کفار کو تاخت و تاراج کرتے ہیں۔(پ30،العدیٰت:3)

لہٰذا ماں باپ کو راضی کرنا۔ ان کی اطاعت کرنا، رب تعالیٰ کی عبادت ہے، نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر جان ومال قربان کرنا اس سرکار کی اطاعت ہے اور رب تعالیٰ کی عبادت بلکہ اعلیٰ ترین عبادت ہے۔ موجودہ وہابی اس الوہیت کی قید سے بے خبر رہ کر نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم وتوقیر کو شرک کہہ دیتے ہیں ان کے ہاں محفل میلاد

شریف شرک، قبروں پر جانا شرک، عید کو سویاں پکانا شرک، نعلین کو بوسہ دینا شرک، گویا قدم قدم پر شرک ہے اور ساری مشرکین و کفار کی آیات مسلمانوں پر چسپاں کرتے ہیں۔

اعتراض: کسی کو حاجت روا مشکل کشا سمجھ کر اس کی تعظیم کرنا عبادت ہے اور اس کے سامنے جھکنا بندگی ہے۔(جواہر القرآن۔ تقویۃ الایمان)

جواب: یہ غلط ہے ہم حکام وقت کی تعظیم کرتے ہیں یہ سمجھ کر کہ بہت سی مشکلات میں ان کے پاس جانا پڑتا ہے کیا یہ عبادت ہے؟ ہرگز نہیں حکیم، استاد کی تعظیم کی جاتی ہے کہ ان سے کام نکلتے رہتے ہیں۔ یہ عبادت نہیں۔

اعتراض: کسی کو مافوق الاسباب متصرف مان کر اس کی تعظیم کرنا عبادت ہے اور یہ ہی شرک ہے۔

جواب: یہ بھی غلط ہے فرشتے مافوق الاسباب تصرف کرتے ہیں۔ یہ جان نکالتے ہیں ماں کے پیٹ میں بچے بناتے ہیں بارش برساتے ہیں عذاب الٰہی لاتے ہیں۔ یہ سمجھ کر فرشتوں کی تعظیم کرنا ان کی عبادت ہے؟ نہیں۔ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے انگلیوں سے پانی کے چشمے باذن اللہ جاری کردیئے ۔ چاند پھاڑ ڈالا۔ ڈوبا سورج واپس بلالیا، کنکروں، پتھروں سے کلمہ پڑھوایا۔ درختوں، جانوروں سے اپنی گواہی دلوائی، حضرت عیسی علیہ السلام نے باذن اللہ مردے زندہ کئے۔ اندھے، کوڑھی اچھے کئے یہ سارے کام مافوق الاسباب کئے۔ اس لئے ان کی تعظیم کرنا عبادت ہے۔ ہرگز نہیں کیونکہ انہیں خدا کے برابر کوئی نہیں مانتا۔ خدا کے برابر ماننا ہی عبادت کے لئے شرط اول ہے۔ یہ سب اللہ کے بندے اللہ کے اذن وارادے سے کرتے ہیں۔ اسی لئے حضرت صالح و حضرت ہود، حضرت شعیب، حضرت نوح اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی قوم کو پہلی تبلیغ یہ ہی فرمائی:

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔(پ8،الاعراف:59)

یعنی میری اطاعت کرنا، تعظیم کرنا، توقیر بجالانا، مجھے تمام قوم سے افضل سمجھنا لیکن مجھے خدا یا خدا کی اولاد، خدا کے برابر یا خدا کو میرا محتاج نہ سمجھنا اور ایسا عقیدہ رکھ کر میری تعظیم نہ کرنا کیونکہ اس عقیدے سے کسی کی تعظیم وتوقیر عبادت ہے اور عبادت خدا کے سوا کسی کی درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف کی سچی سمجھ عطا فرمائے۔ اس میں بہت بڑے لوگ ٹھوکریں کھا جاتے ہیں۔

من دون اللہ

قرآن شریف میں یہ لفظ بہت زیادہ استعمال ہوا ہے۔عبادت کے ساتھ بھی آیا ہے۔تصرف اور مدد کے ساتھ بھی،ولی اور نصیر کے ساتھ بھی۔شہید اور وکیل کے ساتھ بھی،شفیع کے ساتھ بھی۔ہدایت،ضلالت کے ساتھ بھی جیسے کہ قرآن کی تلاوت کرنے والوں پر مخفی نہیں اور ہم بھی ہر طرح کی آیات گزشتہ مضامین میں پیش کر چکے ہیں۔

اس لفظ دون کے معنی سواء اور علاوہ ہیں،مگر یہ معنی قرآن کی ہر آیت میں درست نہیں ہوتے۔اگر ہر جگہ اس کے معنی سواء کئے جائیں تو کہیں تو آیات میں سخت تعارض ہو گا اور کہیں قرآن میں صراحۃً جھوٹ لازم آئے گا جس کے دفع کے لئے سخت دشواری ہو گی قرآن کریم میں تامل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ تین معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(۱)سواء،علاوہ(۲)مقابل(۳)اللہ کو چھوڑ کر۔جہاں من دون اللہ عبادت کے ساتھ ہو یا ان الفاظ کے ہمراہ آوے جو عبادت یا معبود کے معنی میں استعمال ہوئے ہوں تو اس کے معنی سواء ہوں گے کیونکہ خدا کے سواء کسی کی عبادت نہیں ہو سکتی،جیسے اس آیت میں۔

(1) فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ

پس نہیں پوجتا میں انہیں جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا اور لیکن میں تو اس اللہ کو پوجوں گا جو تمہیں موت دیتا ہے۔(پ11،یونس:104)

(2) وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُهُمْ وَلَا یَضُرُّهُمْ

اور پوجتے ہیں وہ کافر اللہ کے سواء انہیں جو نہ انہیں نفع دیں نہ نقصان۔(پ19،الفرقان:55)

(3) اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

جمع کرو ظالموں کو اور ان کی بیویوں کو اور ان کو جن کی پوجا کرتے تھے یہ اللہ کے سواء۔(پ23،الصّٰفّٰت:22،23)

اس جیسی بہت سی آیات میں مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کے معنی اللہ کے سواء ہیں کیونکہ یہ عبادت کے ساتھ آئے ہیں اور عبادت غیر اللہ کسی کی بھی نہیں ہو سکتی۔

(4) قُلْ اَرَءَیْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا

فرماؤ کہ تم بتاؤ کہ تمہارے وہ شرکاء جن کی تم پوجا کرتے ہو خدا کے سواء مجھے دکھاؤ کہ انہوں نے کیا پیدا کیا۔(پ22،فاطر:40)

(5) وَادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

اور بلالو اپنے معبودوں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔(پ1،البقرۃ:23)

(6) اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ

توکافروں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ میرے بندوں کو میرے سوا معبود بنائیں۔(پ16،الکھف:102)

ان جیسی آیات میں چونکہ دون کا لفظ تدعون اور اولیاء کے ساتھ آیا ہے اور یہاں تدعون کے معنی عبادت ہیں اور اولیاء کے معنی معبود لہٰذا یہاں بھی دون بمعنی علاوہ اور سوا ہو گا۔ لیکن جہاں "دون" مدد یا نصرت یا دوستی کے ساتھ آوے گا تو وہاں اس کے معنی صرف سواء کے نہ ہوں گے۔ بلکہ اللہ کے مقابل یا اللہ کو چھوڑ کر ہوں گے یعنی اللہ کے سواء اللہ کے دشمن۔ اس تفسیر اور معنی میں کوئی دشواری نہ ہو گی جیسے

(1) اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ؕ﴿۲﴾

کہ میرے مقابل کسی کو وکیل نہ بناؤ۔(پ15،بنیاسرآئیل:2)

(2) اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ

کیا ان لوگوں نے اللہ کے مقابل کچھ سفارشی بنارکھے ہیں۔(پ24،الزمر:43)

(3) وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

اور اللہ کے مقابل نہ تمہارا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار۔(پ1،البقرۃ:107)

(4) وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

اور وہ اللہ کے مقابل اپنا نہ کوئی دوست پائینگے اور نہ مددگار۔(پ6،النسآء:173)

(5) لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ

مومن مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں۔(پ3،اٰل عمرٰن:28)

(6) وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾

اور جو شیطان کو دوست بنائے خدا کو چھوڑ کر وہ کھلے ہوئے گھاٹے میں پڑ گیا۔(پ5،النسآء:119)

(7) وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ

اور نہیں ہے ان کافروں کے لئے اللہ کے مقابل کوئی مدد گار۔(پ12،ہود:20)

ان جیسی تمام ان آیتوں میں جہاں مدد، نصرت، ولایت، دوستی وغیرہ کے ساتھ لفظ دون آیا ہے۔ ان میں اس کے معنی صرف سواء یا علاوہ کے نہیں بلکہ وہ سواء مراد ہے جو رب تعالیٰ کا دشمن یا مقابل ہے۔ لہٰذا اس دون کے معنے مقابل کرنا نہایت موزوں ہے جن مفسرین نے یا ترجمہ کرنیوالوں نے ان مقامات میں سواء ترجمہ کیا ہے ان کی مراد بھی سواء سے ایسے ہی سواء مراد ہیں۔ اس دون کی تفسیر یہ آیات ہیں:

(1) وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ

اور اگر رب تمہیں رسوا کرے تو کون ہے جو پھر تمہاری مدد کرے۔(پ4،اٰل عمرٰن:160)

(2) لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

تم فرماؤ کہ وہ کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچائے اگر ارادہ کرے رب تمہارے لئے برائی کا اور ارادہ کرے مہربانی کا اور وہ اللہ کے مقابل کوئی نہ دوست پائیں گے نہ مددگار۔(پ21،الاحزاب:17)

(3) اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ

کیا ان کے کچھ ایسے خدا ہیں جو انہیں ہم سے بچالیں۔(پ17،الانبیآء:43)

ان آیات نے تفسیر فرمادی کہ جہاں مدد یا دوستی کے ساتھ لفظ دون آئے گا وہاں مقابل اور رب کو چھوڑ کر معنی دے گا نہ کہ صرف سواء یا علاوہ کے۔

نیز اگر اس جگہ دون کے معنی سواء کئے جائیں تو آیات میں تعارض بھی ہو گا کیونکہ مثلاً یہاں تو فرمایا گیا رب کے سوا تمہارا کوئی ولی اور مددگار نہیں اور جو آیات ولی کی بحث میں پیش کی گئیں وہاں فرمایا گیا کہ تمہارا ولی اللہ اور رسول اور نیک مومنین ہیں یا تمہارے ولی فرشتے ہیں یا فرمایا گیا کہ اے مولیٰ اپنی طرف سے ہمارے مددگار فرما۔ اس تعارض کا اٹھانا بہت مشکل ہو گا۔

نیز اگر ان آیات میں دون کے معنی سواء کئے جائیں تو عقل کے بالکل خلاف ہو گا اور رب کا کلام معاذ اللہ جھوٹا ہو گا۔

مثلاً یہاں فرمایا گیا کہ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ انہوں نے خدا کے سوا سفارشی بنا لیئے۔ سفارشی تو خدا کے سوا ہی ہو گا۔ (پ ۲۴، الزمر: ۴۳)

خدا تو سفارشی ہو سکتا ہی نہیں یا فرمایا گیا:

اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا ؕ﴿۲﴾ (بنی اسرآئیل: 2) میرے سوا کسی کو وکیل نہ بناؤ حالانکہ دن رات وکیل بنایا جاتا ہے اب وکیل کے معنی کی توجیہیں کرو اور شفعاء کے متعلق بحث کرتے پھرو لیکن اگر یہاں دون کے معنی مقابل کر لئے جائیں تو کلام نہایت صاف ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابل نہ کوئی سفارشی ہے نہ وکیل، نہ کوئی حمایتی ہے نہ کوئی مددگار نہ کوئی دوست جو کوئی جو کچھ ہے وہ رب تعالیٰ کے ارادہ اور اسی کے حکم سے ہے لہٰذا جہاں بندوں سے ولایت، حمایت، مدد، دوستی کی نفی ہے وہاں رب تعالیٰ کے مقابل ہو کر ہے کہ رب تعالیٰ چاہے ہلاک کرنا اور یہ مدد کر کے بچالیں اور جہاں ان چیزوں کا بندوں کے لئے ثبوت ہے وہاں اذن الٰہی سے مدد نصرت وغیرہ ہے۔

اعتراض: ان آیات میں مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے اللہ کے سواء ہی مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سواء غائبانہ مافوق الاسباب مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ یہ ہی عقیدہ شرک ہے جن آیتوں میں اللہ کے بندوں کی مدد اور ولایت کا ثبوت ہے۔ وہاں حاضرین زندوں کی اسباب غائبانہ مدد مراد ہے۔ (جواہر القرآن)

جواب: یہ توجیہہ بالکل غلط ہے چند وجہوں سے ایک یہ کہ نفی مدد کی آیتوں میں کوئی قید نہیں ہے مطلق ہیں تم نے اپنے جیب سے اس میں تین قیدیں لگائیں غائبانہ، مافوق الاسباب، مردوں کی مدد، قرآن کی آیت خبر واحد سے بھی مقید نہیں ہو سکتی اور تم صرف اپنے گمان وہم سے مقید کر رہے ہو۔ اور اگر دون کو بمعنی مقابل لیا جاوے تو کوئی قید

لگانی نہیں پڑتی۔

دوسرے یہ کہ تمہاری یہ تفسیر خود قرآن کی اپنی تفسیر کے خلاف ہے قرآن کی مذکورہ بالا آیات نے بتایا کہ یہاں دون بمعنی مقابل ہے۔ لہٰذا تمہاری یہ تفسیر تحریف ہے۔ تفسیر نہیں۔ تیسرے یہ کہ ان قیدوں کے باوجود آیت درست نہیں ہوتی کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ منورہ سے بیٹھے ہوئے حضرت ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مافوق الاسباب مدد فرمادی کہ انہیں دشمن کی خفیہ تدبیر سے مطلع فرمادیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام کی مافوق الاسباب دور سے مدد فرمادی کہ اپنی قمیص کے ذریعہ باذن پروردگار ان کی آنکھیں روشن فرمادیں اور ظاہر ہے کہ قمیص آنکھ کی شفا کا سبب نہیں لہٰذا یہ مدد مافوق الاسباب ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی وفات کے بعد ہماری مافوق الاسباب یہ مدد کی کہ پچاس نمازوں کی پانچ کرادیں۔

اس قسم کی سینکڑوں مددیں ہیں جو اللہ کے پیاروں نے غائبانہ مافوق الاسباب فرمائیں۔ تمہاری اس تفسیر کی رو سے سب شرک ہو گئیں غرضیکہ تمہاری یہ تفسیر درست نہیں ہو سکتی۔ چوتھے یہ کہ تم اپنی قیدوں پر خود قائم نہ رہو گے۔ اچھا بتاؤ۔ اگر غائبانہ امداد تو منع ہے کیا حاضرانہ امداد جائز ہے تو بتاؤ کسی زندہ ولی سے اس کے پاس جاکر فرزند مانگنا یا رسول اللہ عزوجل و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ اطہر پر جاکر حضور سے جنت مانگنا و دوزخ سے پناہ مانگنا جائز ہے تم اسے بھی شرک کہتے ہو تو تمہاری یہ قیدیں خود تمہارے مذہب کے خلاف ہیں بہر حال یہ قیود باطل ہیں ان آیات میں دون بمعنی مقابل ہے۔

نذر و نیاز

قرآن کریم میں یہ لفظ بہت جگہ استعمال ہوا ہے نذر کے لغوی معنی ہیں ڈرانا یا ڈر سنانا۔ شرعی معنی ہیں غیر لازم عبادت کو اپنے پر لازم کر لینا، عرفی معنی ہیں نذرانہ و ہدیہ قرآن کریم میں یہ لفظ ان تینوں معانی میں استعمال ہوا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1) اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا

ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بھیجا خوشخبری دینے والا ڈر سنانے والا۔ (پ22، فاطر:24)

(2) وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ ﴿۲۴﴾

نہیں ہے کوئی جماعت مگر گذرے ان میں ڈرانے والے۔ (پ22، فاطر:24)

(۳) اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ رَبِّكُمْ وَ یُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا

کیا تمہارے پاس تم میں سے رسول نہ آئے جو تم پر تمہارے رب کی آیات تلاوت کرتے ہیں اور تمہیں اس دن کے ملنے سے ڈراتے۔ (پ۲۴، الزمر:۷۱)

(4) فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰی ﴿۱۴﴾

اور ڈرایا میں نے تم کو بھڑکتی ہوئی آگ سے۔ (پ30، الیل:14)

(5) اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ ﴿۳﴾

ہم نے قرآن شریف اتارا برکت والی رات میں ہم ہیں ڈرانے والے۔(پ25،الدخان:3)

ان جیسی بہت سی آیات میں نذر لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے بمعنی ڈرانا، دھمکانا۔اس معنی میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی آتا ہے اور انبیاء کرام کے لئے بھی اور علماء دین کے لئے بھی۔یہ لفظ شرعی معنی میں بھی استعمال ہوا ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے:

محمد(صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم)رسول ہی ہیں ان سے پہلے سارے رسول گزر چکے۔(پ4،ال عمرٰن:144)

(1)وَمَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ

جو کچھ تم خرچ کرو یا نذر مانو کوئی نذر،اللہ اسے جانتا ہے۔(پ3،البقرۃ:270)

(2)رَبِّ اِنِّىۡ نَذَرۡتُ لَكَ مَا فِىۡ بَطۡنِىۡ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلۡ مِنِّىۡ

اے میرے رب میں نے نذر مانی تیرے لئے اس بچے کی جو میرے پیٹ میں ہے آزاد۔پس قبول فرما مجھ سے۔(پ3،ال عمرٰن:35)

(3)وَلۡيُوۡفُوۡا نُذُوۡرَهُمۡ وَلۡيَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ ﴿۲۹﴾

چاہیے کہ یہ لوگ اپنی نذریں پوری کریں اور پرانے گھر کا طواف کریں۔(پ17،الحج:29)

(4)اِنِّىۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُكَلِّمَ الۡيَوۡمَ اِنۡسِيًّا ﴿۲۶﴾

میں نے اللہ کے لئے روزے کی نذر مانی ہے پس آج کسی سے کلام نہ کروں گی۔(پ16،مریم:26)

ان جیسی آیات میں نذر سے شرعی معنی مراد ہیں یعنی منت ماننا اور غیر ضروری عبادت کو لازم کرلینا یہ نذر عبادت ہے اس لئے خدا کے سوا کسی بندے کے لئے نہیں ہوسکتی اگر کوئی کسی بندے کی نذر مانتا ہے تو مشرک ہے کیونکہ غیر خدا کی عبادت شرک ہے

چونکہ عبادت میں شرط یہ ہے کہ معبود کو الٰہ یعنی خدا یا خدا کے برابر مانا جائے،اس لئے اس نذر میں بھی یہی قید ہوگی کہ کسی کو خدا یا خدا کے برابر مان کر نذر مانی جائے،اگر ناذر کا یہ عقیدہ نہیں ہے بلکہ جس کی نذر مانی اسے محض بندہ سمجھتا ہے تو وہ شرعی نذر نہیں اسی لئے فقہانے اس نذر میں تقرب کی قید لگائی۔تقرب کے معنی عبادت ہیں۔

یہ بھی خیال رہے کہ اگر کوئی کسی بندے کے نام پر شرعی نذر کرے یعنی اس کی

الوہیت کا قائل ہو کر اس کی منت مانے تو اگرچہ یہ شخص مشرک ہو گا اور اس کا یہ کام حرام ہو گا مگر وہ چیز حلال رہے گی اس چیز کو حرام جاننا سخت غلطی ہے اور قرآن کریم کے خلاف۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1) مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّلَا سَآىٕبَةٍ وَّلَا وَصِیْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ

نہیں بنایا اللہ نے بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام یہ مشرکین اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں۔ (پ7، المآئدۃ:103)

کفار عرب ان چار قسم کے جانور وصیلہ حام وغیرہ کو اپنے بتوں کے نام کی نذر کرتے تھے اور انہیں کھانا حرام جانتے تھے۔ رب تعالیٰ نے ان کی تردید فرمادی اور فرمایا کہ یہ حلال ہیں جیسے آج کل ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے سانڈھ حلال ہیں۔ اللہ کے نام پر ذبح کرو اور کھاؤ۔

(2) وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآىٕنَا

اور ٹھہرایا ان کافروں نے اللہ کا اس کھیتی اور جانوروں میں ایک حصہ پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا حصہ ہے اپنے خیال پر اور یہ ہمارے شریکوں کا ہے ۔(پ8، الانعام:136)

(3) وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ ۖۗ لَّا یَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ

اور کافر کہتے ہیں کہ یہ جانور اور کھیتی منع ہے اسے نہ کھائے مگر وہ جسے ہم چاہیں۔ (پ8، الانعام:138)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ کفار عرب اپنے جانوروں کھیتوں میں بتوں کی نذر

مان لیتے تھے اور کچھ حصہ بتوں کے نام پر نامزد کر دیتے تھے پھر انہیں کھانا یا تو بالکل حرام جانتے تھے جیسے بحیرہ، سائبہ جانور اور یا ان کے کھانے میں پابندی لگاتے تھے کہ مرد کھائیں عورتیں نہ کھائیں فلاں کھائے فلاں نہ کھائے۔ ان دونوں حرکتوں کی رب نے تردید ان آیات میں فرمادی:

(1) وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ

اور نہ کہو اپنی زبانوں کے جھوٹ بتانے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔ (پ14، النحل:116)

(2) قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا

فرماؤ کہ بھلا دیکھو تو جو اللہ نے تمہارا رزق اتارا تم نے اس میں کچھ حلال بنایا کچھ حرام۔ (پ11، یونس:59)

(3) قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ

فرماؤ کس نے حرام کی اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لئے نکالی اور ستھرا رزق۔(پ8،الاعراف:32)

(4) حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ

ان کافروں نے حرام سمجھ لیا اسے جو اللہ نے انہیں رزق دیا اللہ پر جھوٹ باندھتے ہوئے۔(پ8،الانعام:140)

(5) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

اے مسلمانو! کھاؤ وہ ستھری چیزیں جو ہم تمہیں رزق دیں اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔(پ2،البقرۃ:172)

(6) وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ

اور تمہارا کیا حال ہے کہ نہیں کھاتے اس میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا۔(پ8،الانعام:119)

(8) اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ

اللہ نے صرف مردار کو اور خون کو اور سور کے گوشت کو اور اس جانور کو جو غیر خدا کے نام پر ذبح کیا جائے تم پر حرام فرمایا۔(پ2،البقرۃ:173)

(9) قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ

بے شک نقصان میں رہے وہ جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی اور جہالت سے قتل کر ڈالا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو حرام کر لیا اللہ پر تہمت لگاتے ہوئے۔(پ8،الانعام:140)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار عرب کے اس عقیدے کی پر زور تردید فرمائی کہ جس جانور اور جس کھیتی وغیرہ کو بت کے نام پر لگا دیا جاوے وہ حرام ہو جاتا ہے۔ فرمایا: تم اللہ پر تہمت لگاتے ہو اللہ نے یہ چیزیں حرام نہ کیں تم کیوں حرام جانتے ہو، جس سے معلوم ہوا کہ بتوں کے نام کی نذر ماننا شرک تھا اور ان کا یہ فعل سخت جرم تھا مگر اس چیز کو حلال ٹھہرایا اس کے حرام جاننے پر عتاب کیا، اسے حلال رزق اور طیب روزی فرمایا۔ ان بتوں کے نام پر چھوٹے ہوئے جانوروں کے متعلق حکم فرمایا کہ اللہ کے نام پر ذبح کرو اور کھاؤ کافروں کی باتوں میں نہ آؤ۔ ایسے ہی آج بھی جس چیز کو غیر خدا کے نام پر شرعی طور پر نذر کر دیا جائے وہ بھی حلال طیب ہے اگرچہ یہ نذر شرک ہے۔

نذر کے تیسرے معنی عرفی ہیں یعنی کسی بزرگ کو کوئی چیز ہدیہ، نذرانہ، تحفہ پیش کرنا یا پیش کرنے کی نیت کرنا کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کے نام کی دیگ پکاؤں گا یعنی دیگ بھر کھانا خیرات کروں گا اللہ کے لئے اور ثواب اس کا سرکار بغداد کی روح شریف کو نذرانہ کروں گا یہ بالکل جائز ہے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ایسی نذریں بارگاہ رسالت میں مانی اور پیش کی ہیں اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قبول فرمائی ہیں نہ یہ کام حرام نہ چیز حرام۔ اسی کو عوام کی اصطلاح میں نیاز کہتے ہیں بمعنی نذرانہ۔ اس کا قرآن شریف میں بھی ثبوت ہے اور احادیث صحیحہ میں بھی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾

کچھ گاؤں والے وہ ہیں جو اللہ اور قیامت پر ایمان لاتے ہیں اور جو خرچ کریں اسے اللہ کی نزدیکیوں اور رسول سے دعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں یقیناً ان کیلئے باعث قرب ہے اللہ جلد انہیں اپنی رحمت میں داخل کریگا۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (پ 11، التوبۃ:99)

اس آیت میں بتایا کہ مؤمنین اپنے صدقہ میں دو نیتیں کرتے ہیں۔ ایک اللہ کی نزدیکی اور اس کی عبادت، دوسرے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی دعائیں لینا اور خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خوش ہونا۔ یہ ہی فاتحہ بزرگان دینے والے، ان کی نذر ماننے والے کا مقصد ہوتا ہے کہ خیرات اللہ کے لئے ہو اور ثواب اس بزرگ کے لئے تاکہ ان کی روح خوش ہو کر ہمیں دعا کرے۔

اسی لئے عوام کہتے ہیں، نذر اللہ، نیاز حسین، اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جب نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ایک غزوہ سے بخیریت واپس تشریف لائے تو ایک لڑکی نے عرض کیا:

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّىْ كُنْتُ نَذَرْتُ اِنْ رَدَّكَ اللّٰهُ صَالِحًا اَنْ اَضْرِبَ بَيْنَ يَدَيْكَ بِالدُّفِ وَاَتَغَنّٰى بِهٖ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ كُنْتِ نَذَرْتِ فَاضْرِبِىْ وَاِلَّا فَلَا ۔ (مشکوۃ باب مناقب عمر)

(مشکوۃ المصابیح، کتاب المناقب، باب مناقب عمر رضی اللہ عنہ، الحدیث ۶۰۴۸، المجلد الثانی، ص ۴۱۹، دار الکتب العلمیۃ بیروت)

حضور میں نے منت مانی تھی کہ اگر اللہ عزوجل آپ کو بخیریت واپس لائے تو میں آپ کے سامنے دف بجاؤں اور گاؤں، سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم نے فرمایا: اگر تم نے نذر مانی ہے تو بجاؤ ورنہ نہیں۔

اس حدیث میں لفظ نذر اسی نذرانہ کے معنی میں ہے نہ کہ شرعی نذر کیونکہ گانا بجانا عبادت نہیں صرف اپنے سرور وخوشی کا نذرانہ پیش کرنا مقصود تھا جو سرکار میں قبول فرمایا گیا۔ یہ عرفی نذر ہے جو ایک صحابیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مانتی ہیں اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اس کے پورے کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

اسی مشکوۃ کے حاشیہ میں بحوالہ ملا علی قاری ہے وان کان السرور بمقدمه الشریف نفسه قربة.(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، کتاب مناقب والفضائل، باب مناقب عمر رضی اللہ عنہ، تحت الحدیث ۶۰۴۸، ج ۱۰، ص ۴۰۳، دارالفکر بیروت)

"حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری پر خوشی منانا عبادت ہے۔"

غرضکہ اس قسم کی عرفی نذریں عوام وخواص میں عام طور پر مروج ہیں۔ استاد، ماں، باپ، شیخ سے عرض کرتے ہیں کہ یہ نقدی آپ کی نذر ہے اسے شرک کہنا انتہا درجہ کی بیوقوفی ہے۔

خاتم النبیین

لفظ خاتم ختم سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں مہر لگانا۔ اصطلاح میں اس کے معنی ہیں تمام کرنا، ختم کرنا، بند کرنا، کیونکہ مہر یا تو مضمون کے آخر پر لگتی ہے جس سے مضمون بند ہو جاتا ہے یا پارسل بند ہونے پر لگتی ہے جب نہ کوئی شے اس میں داخل ہو سکے نہ اس سے خارج، اسی لئے تمام ہونے کو ختم کہا جاتا ہے قرآن شریف میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(1) خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ

اللہ تعالیٰ نے ان کفار کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی۔(پ 1، البقرۃ:7)

(2) اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

آج ہم ان کے منہ پر مہر لگادیں گے اور ہم سے ان کے ہاتھ بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔(پ 23، یٰس :65)

(3) فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ

تو اگر اللہ چاہے تو آپ کے دل پر رحمت وحفاظت کی مہر لگادے۔(پ 25، الشوریٰ:24)

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ

نتھاری شراب پلائے جائیں گے جو مہر کی ہوئی ہے اس کی مہر مشک پر ہے۔(پ ۳۰، المطففین:۲۵)

ان جیسی تمام آیتوں میں ختم بمعنی مہر استعمال فرمایا گیاہے کہ جب کفار کے دل وکان پر مہر لگ گئی تو نہ باہر سے وہاں ایمان داخل ہو نہ وہاں سے کفر باہر نکلے یوں ہی جنت میں شَرَابًاطَہُوْرًا ایسے برتنوں سے پلائی جائے گی جن پر حفاظت کے لئے

اور یاد کرو ہمارے بندہ ایوب کو۔(پ23،ص:41)

مہر ہے تاکہ کوئی توڑ کر نہ باہر سے کوئی آمیزش کر سکے نہ اندر سے کچھ نکال سکے۔رب تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں میں پچھلے۔(پ22،الاحزاب:40)

اس جگہ خاتم عرفی معنی میں استعمال ہوا یعنی آخری اور پچھلا۔ لہٰذا اب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی کو نبوت ملنا ناممکن ہے۔اس معنی کی تائید حسب ذیل آیات سے ہوتی ہے اور ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔

(1) اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (پ6،المآئدۃ:3)

آج میں نے تمہارے لئے دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی۔

(2) ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ

پھر تشریف لائیں تمہارے پاس وہ رسول جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کریں تو تم سب نبی ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا۔(پ3،ال عمرٰن:81)

(3) وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ

(4) فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾

تو کیسی ہو گی جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور اے محبوب تمہیں ان سب پر گواہ و نگہبان لائیں گے۔(پ5،النساء:41)

ان آیتوں سے تین باتیں معلوم ہوئیں۔ایک یہ کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا دین مکمل ہے اور دین کے مکمل ہو چکنے کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں۔دوسرے یہ کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تمام نبیوں کی تصدیق کرتے ہیں کسی نبی کی بشارت یا خوشخبری نہیں دیتے اور پچھلے نبی کی تصدیق ہوتی ہے آئندہ کی بشارت اگر آپ کے بعد کوئی اور نبی ہوتا تو اس کے بشیر بھی ہوتے۔تیسرے یہ کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم سارے

پیغمبروں اور ان کی امتوں پر گواہ ہیں لیکن کوئی نبی حضور کا گواہ یا حضور کی امت کا گواہ نہیں جس سے معلوم ہوا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ چوتھے یہ کہ سارے نبی آپ سے پہلے گزر چکے کوئی باقی نہیں رہا۔

اعتراض: خاتم النبیین کے معنی ہیں نبیوں سے افضل جیسے کہا کرتے ہیں فلاں شخص خَاتَمُ الشُّعَرَآءِ یا خَاتَمُ الْمُحَدِّثِیْنَ ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ شاعروں یا محدثوں میں آخری شاعر یا آخری محدث ہے بلکہ محدثوں میں افضل ہے۔ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا: "اَنْتَ خَاتَمُ الْمُھَاجِرِیْنَ "(فضائل الصحابۃ لابن حنبل، باب فضائل ابی الفضل العباس بن عبد المطلب، الحدیث ۱۸۱۲، ج ۲، ص ۹۴۱، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت)'

'تم مہاجرین میں خاتم یعنی افضل ہو۔" نہ یہ معنی کہ آخری مہاجر ہو کیونکہ ہجرت تو قیامت تک جاری رہے گی لہٰذا آپ کے بعد نبی آسکتے ہیں، ہاں آپ سب سے افضل ہیں اور خاتم النبیین کے معنی یہی ہیں۔

جواب: خاتم ختم سے بنا ہے جس کے معنی افضل نہیں ورنہ

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (پ 1، البقرۃ:7) کے معنی یہ ہوتے کہ اللہ نے کافروں کے دل افضل کر دیئے۔ جب ختم میں افضلیت کے معنی نہیں تو خاتم میں جو اس سے مشتق ہے یہ معنی کہاں سے آگئے لوگوں کا کسی کو خاتم الشعراء کہنا مبالغہ ہوتا ہے گویا اب اس شان کا شاعر نہ آوے گا کہا کرتے ہیں فلاں پر شعر گوئی ختم ہو گئی۔ رب تعالیٰ کا کلام مبالغہ اور جھوٹ سے پاک ہے، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان مہاجرین میں جنہوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی آخری مہاجر ہی کیونکہ ان کی ہجرت فتح مکہ کے دن ہوئی جس کے بعد یہ ہجرت بند ہو گئی لہٰذا وہاں بھی خاتم آخر کے معنی میں ہے۔

سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم نے فرمایا لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْيَوْمِ آج کے بعد اب مکہ سے ہجرت نہ ہو گی، اگر وہاں خاتم کے معنی افضل ہوں تو لازم آئے گا کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے بھی افضل ہو جاویں کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم بھی مہاجر ہیں۔

اعتراض: اگر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کیوں آپ کے بعد آویں گے۔ آخری نبی کے بعد کوئی نبی نہ چاہیے؟

جواب: آخری نبی کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے زمانہ یا آپ کے بعد کوئی نبی باقی نہ رہے۔ آخری اولاد کے معنی یہ ہیں کہ پھر کوئی بچہ پیدا نہ ہو، نہ یہ کہ پچھلے سب مر جاویں نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تشریف لانا اب نبوت کی حیثیت سے نہ ہو گا بلکہ حضور کے امتی کی حیثیت سے یعنی وہ اپنے وقت کے نبی ہیں اور اس وقت کے امتی۔

جیسے کوئی جج دوسرے جج کی کچہری میں گواہی دینے کے لئے جاوے تو وہ اگرچہ اپنے علاقہ میں جج ہے مگر اس علاقہ میں گواہ عیسیٰ علیہ السلام محمد مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے علاقہ میں ان کے دین کی نصرت و مدد کرنے تشریف لاویں گے۔

نوٹ ضروری: جب ختم بمعنی مہر ہوتا ہے تو اس کے بعد علٰی ضرور ہوتا ہے خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ جیسے کہ ہماری پیش کردہ آیات سے ظاہر ہے اور جب ختم بمعنی آخر ہونا یا تمام کرنا ہو گا تو علٰی کی ضرورت نہیں خاتم النبیین میں علی نہ ظاہر ہے نہ پوشیدہ لہٰذا یہاں آخری نبی مراد ہیں۔

نوٹ ضروری: خاتم النبیین کے معنی "آخری نبی" خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائے اور اس پر امت کا اجماع رہا اب آخری زمانہ میں مولوی محمد قاسم دیوبندی اور مرزا غلام احمد قادیانی نے اس کے نئے معنے ایجاد کئے یعنی اصلی نبی، افضل نبی اور ان اجماعی معنی کا انکار کیا اسی لئے ان دونوں پر عرب و عجم کے علماء نے فتوی کفر دیا اور جیسے قرآن مجید کے الفاظ کا انکار کفر ہے ویسے ہی اس کے اجماعی معنی کا انکار بھی کفر ہے اگر کوئی کہے کہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (پ 1، البقرۃ: 43) پر میرا ایمان ہے یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے ہیں مگر صلوٰۃ کے معنی نماز نہیں بلکہ اس کے معنے دعا ہیں۔ ہاں نماز بھی اس معنی میں داخل ہے اور زکوٰۃ کے معنی صدقہ واجبہ نہیں بلکہ اس کے معنی پاکی ہے ہاں صدقہ وخیرات بھی اس میں داخل ہے تو وہ کافر ہے کیونکہ اگرچہ وہ قرآن کے لفظوں کا انکار نہیں کرتا مگر متواتر معنی کا انکار کرتا ہے اس صورت میں خواہ نماز کو فرض ہی مانے مگر جب قرآن میں الصلوٰۃ کے معنی نماز نہیں کرتا تو وہ کافر ہے۔

نیز نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ساری صفات کو ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے جیسے کہ حضور نبی ہیں، رسول ہیں، شفیع المذنبین ہیں اور رحمت للعالمین ہیں ایسے ہی آپ خاتم النبیین بمعنی آخری نبی ہیں جیسے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا ماننا ضروری ہے اور نبوت کے وہی معنی ہیں جو مسلمان مانتے ہیں ایسے ہی آپ کو خاتم النبیّین اسی معنی سے ماننا ضروری ہے جو مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ نیز جیسے لا الہ الا اللہ میں الٰہ نکرہ ہے نفی کے بعد تو معنی یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی طرح کا کوئی معبود نہیں، نہ اصلی نہ ظلی، نہ بروزی نہ مراتی نہ ذاتی۔ ایسے ہی "لا نبی بعدی" میں نبی نکرہ نفی کے بعد ہے جس کے معنی ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی طرح کا نبی اصلی، نقلی، بروزی وغیرہ آنا ایسا ہی ناممکن ہے جیسا دوسرا الٰہ ہونا، جو کوئی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت کا امکان بھی مانے، وہ بھی کافر ہے لہٰذا دیوبندی اور قادیانی اس ختم نبوت کے انکار کی وجہ سے دونوں مرتد ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِہٖ فَقَدِ اہۡتَدَوۡا اے صحابیو! اگر ایسا ایمان لائیں جیسا تمہارا ایمان ہے تو ہدایت پا جائینگے (پ ۱، البقرۃ: ۱۳۷) اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ مانا لہٰذا نبی ماننا گمراہی ہے۔

دوسرا باب

قواعد قرآنیہ

پہلے باب میں معلوم ہو چکا کہ قرآن شریف میں ایک لفظ چند معنی میں آتا ہے، ہر مقام پر لفظ کے وہی معنی کرنا چاہئیں جو اس جگہ مناسب ہوں۔ اب ہم وہ قاعدے بیان کرتے ہیں جن سے معلوم ہو جائے کہ لفظ کے معنے معلوم کرنے کے
قاعدے کیا ہیں؟ کیسے معلوم کریں کہ یہاں فلاں معنی ہیں۔ ان قواعد کو بغور مطالعہ کرو تا کہ ترجمہ قرآن میں غلطی واقع نہ ہو۔

قاعدہ نمبر ا

وحی کے معنی اور ان کی پہچان

الف: جب وحی کی نسبت نبی کی طرف ہو گی تو اسکے معنی ہوں گے رب تعالیٰ کا بذریعہ فرشتہ پیغمبر سے کلام فرمانا یعنی وحی الٰہی عرفی۔

ب: جب وحی کی نسبت غیر نبی کی طرف ہو تو اس سے مراد ہو گا دل میں ڈالنا، خیال پیدا کر دینا۔ الف کی مثال ان آیات میں ہے:

(1) اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ كَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

بے شک ہم نے وحی کی تمہاری طرف جیسے وحی کی تھی نوح اور ان کے بعد والے پیغمبروں کی طرف۔ (پ6، النسآء:163)

(2) وَ اُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ

اور وحی کی گئی نوح کی طرف کہ اب ایمان نہ لائیگا مگر وہ جو ایمان لا چکے۔ (پ12، ھود:36)

ان جیسی صدہا آیتوں میں وحی سے مراد ہے وحی ربانی جو پیغمبروں پر آتی ہے۔ "ب" کی مثال یہ آیات ہیں:

(1) وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں ڈالا کہ پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں اور چھتوں میں۔ (پ14، النحل:68)

(2) وَ اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰۤی اَوْلِیٰٓـِٕهِمْ

اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔ (پ8، الانعام:121)

(3) وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوْسٰۤی اَنْ اَرْضِعِیْهِ

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے دل میں ڈال دیا کہ انہیں دودھ پلاؤ۔ (پ20، القصص:7)

ان آیتوں میں چونکہ وحی کی نسبت شہد کی مکھی یا موسیٰ علیہ السلام کی ماں یا شیطان کی طرف ہے اور یہ سب نبی نہیں اس لئے یہاں وحی نبوت مراد نہ ہو گی بلکہ فقط دل میں ڈال دینا مراد ہو گا کبھی وحی اس کلام کو بھی کہا جاتا ہے جو نبی سے بلاواسطہ فرشتہ ہو۔ جیسے اس آیت میں ہے۔

فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ﴿۹﴾ فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی ﴿ؕ۱۰﴾

پس ہو گئے وہ محبوب دو کمانوں کے فاصلہ پر اب وحی فرمائی اپنے بندے کو جو وحی کی۔ (پ27، النجم:9-10)

معراج کی رات قرب خاص کے موقعہ پر جب فرشتہ کا واسطہ نہ رہا تھا جو رب تعالیٰ سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ہم کلامی ہوئی اسے وحی فرمایا گیا۔

قاعدہ نمبر ۲

عبد کے معنی اور ان کی پہچان

الف: جب "عبد" کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد مخلوق عابد یا بندہ ہوتا ہے۔

ب: جب "عبد" کی نسبت بندے کی طرف ہو تو اس کے معنی خادم نوکر ہوں گے۔

"الف" کی مثال ان آیات میں ہے:

(1) سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا

پاک ہے وہ جو اپنے بندہ خاص کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔(پ15، بنی اسرآءیل:1)

(2) وَاذۡکُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَیُّوۡبَ

(3) اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ

میرے خاص بندوں پر اے ابلیس تیرا غلبہ نہ ہوگا۔(پ15، بنی اسرآءیل:65)

ان تمام آیتوں میں چونکہ عبد کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف ہے اس لئے یہاں "عبد" کے معنی بندہ یُعابد ہوں گے۔

"ب" کی مثال ان آیات میں ہے:

(1) وَاَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَالصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَاِمَآئِکُمۡ

اور نکاح کر دو ان میں سے ان کا جو بے نکاح ہوں اور اپنے لائق غلاموں اور لونڈیوں کا۔(پ18، النور:32)

(2) قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ

فرمادو کہ اے میرے وہ غلامو جنہوں نے زیادتی کی اپنی جانوں پر مت ناامید ہو اللہ کی رحمت سے (پ24، الزمر:53)

ان آیتوں میں چونکہ "عبد" کی نسبت بندوں کی طرف ہے اس لئے اس کے معنی مخلوق نہ ہوں گے بلکہ خادم، غلام ہوں گے لہٰذا عبد النبی اور عبد الرسول کے معنی ہیں نبی کا خادم۔

قاعدہ نمبر ۳

رب کے معنی اور ان کی پہچان

الف: جب رب کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو اس سے مراد ہے حقیقی پالنے والا یعنی اللہ تعالیٰ۔

ب: جب کسی بندے کو رب کہا جاوے تو اس کے معنی ہوں گے مربی، محسن، پرورش کرنے والا۔

"الف" کی مثال یہ آیات ہیں:

(1) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱﴾

ساری حمدیں اللہ کے لئے ہیں جو جہان کا رب ہے۔ (پ 1، الفاتحۃ: 1)

(2) رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

وہ اللہ تمہارا اور تمہارے پچھلے باپ دادوں کا رب ہے۔ (پ 23، الصّٰفّٰت: 126)

(3) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿۲﴾

فرمادو میں پناہ لیتا ہوں انسانوں کے رب کی۔ (پ 30، الناس: 2،1)

ان آیات میں چونکہ اللہ تعالیٰ کو رب کہا گیا لہٰذا اس سے مراد حقیقی پالنے والا ہے۔

"ب" کی مثال ان آیتوں میں ہے:

(1) ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ

اپنے مربی (بادشاہ) کی طرف لوٹ جا پھر اس سے پوچھ کہ کیا حال ہے ان عورتوں کا جنہوں نے ہاتھ کاٹے تھے۔ (پ 12، یوسف: 50)

(2) قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ

فرمایا یوسف نے اللہ کی پناہ وہ بادشاہ میرا رب ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا۔ (پ 12، یوسف: 23)

ان آیتوں میں چونکہ بندوں کو رب کہا گیا ہے اس لئے اس کے معنے مربی اور پرورش کرنے والا ہیں۔

قاعدہ نمبر ۴

ضلال کے معنی اور انکی پہچان

الف: جب "ضلال" کی نسبت غیر نبی کی طرف ہو تو اس کے معنی گمراہ ہوں گے۔

ب: جب "ضلال" کی نسبت نبی کی طرف ہو تو اس کے معنی وارفتہ محبت یا راہ سے ناواقف ہوں گے۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ

جسے خدا گمراہ کرے اسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔ (پ 9، الاعراف: 186)

(2) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾

ان کا راستہ نہ چلا جن پر غضب ہوا نہ گمراہوں کا۔ (پ 1، الفاتحۃ: 7)

(3) وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾

جسے رب گمراہ کردے تم اس کیلئے ہادی رہبر نہ پاؤگے۔(پ15،الکھف:17)

ان جیسی تمام آیتوں میں چونکہ ضلال کا تعلق نبی سے نہیں غیر نبی سے ہے تو اس کے معنی ہیں گمراہی خواہ کفر ہو یا شرک یا کوئی اور گمراہی سب اس میں داخل ہوں گے۔

"ب"کی مثالیں:

(1)وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴿۷﴾

اے محبوب رب نے تمہیں اپنی محبت میں وارفتہ پایا تو اپنی راہ دے دی۔(پ30،الضحی:7)

(2)قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾

وہ فرزندان یعقوب بولے کہ خدا کی قسم تم تو اپنی پرانی خود رفتگی میں ہو۔(پ13،یوسف:95)

(3)قَالَ فَعَلْتُهَاۤ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿ؕ۲۰﴾

فرمایا موسیٰ نے کہ میں نے قبطی کو مارنے کا کام جب کیا تھا جب مجھے راہ کی خبر نہ تھی۔(پ19،الشعرآء:20)

یعنی نہ جانتا تھا کہ گھونسہ مارنے سے قبطی مر جائے گا۔ان جیسی تمام آیتوں میں "ضلال" کے معنی گمراہی نہیں ہوسکتے کیونکہ نبی ایک آن کے لئے گمراہ نہیں ہوتے۔رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1)مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ﴿ۚ۲﴾

تمہارے صاحب محمد مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نہ بہکے نہ بے راہ چلے۔(پ27،النجم:2)

(2)لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾

حضرت شعیب نے فرمایا کہ مجھ میں گمراہی نہیں لیکن میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں۔(پ8،الاعراف:61)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ نبی گمراہ نہیں ہوسکتے۔آیت ۲ میں "لکن" بتارہا ہے کہ نبوت اور گمراہی جمع نہیں ہوسکتی۔

قاعدہ نمبر ۵

مکر یا خداع کے معنی اور ان کی پہچان

الف:"مکر"یا"خداع"کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنے دھوکہ یا فریب نہ ہوں گے کیونکہ یہ عیب ہیں بلکہ اس کے معنی ہوں گے دھوکے کی سزادینا یا خفیہ تدبیر کرنا۔

ب:جب اس کی نسبت بندوں کی طرف ہو تو مکر کے معنی دھوکہ،مکاری،دغابازی اور خداع کے معنی فریب ہوں گے۔ان دونوں کی مثالیں یہ ہیں۔

(1) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ

وہ اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور رب انہیں سزا دے گا(پ5،النسآء:142) یارب ان پر خفیہ تدبیر فرمائے گا۔

(2) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ

منافقین دھوکہ دیا چاہتے ہیں اللہ کو اور مسلمانوں کو اور نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنی جانوں کو۔(پ1،البقرۃ:9)

(3) وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾

اور منافقوں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے خلاف خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ تمام تدبیریں کرنے والوں میں بہتر ہے۔(پ3،ال عمرٰن:54)

ان تمام آیتوں میں جہاں مکر یا خداع کا فاعل کفار ہیں۔ اس سے مراد دھوکا فریب ہے اور جہاں اس کا فاعل رب تعالیٰ ہے وہاں مراد یا تو مکر کی سزا ہے یا خفیہ تدبیر۔

قاعدہ نمبر ٦

تقویٰ کے معانی اور ان کی پہچان

الف: جب "تقویٰ" کی نسبت رب کی طرف ہو تو اس سے مراد ڈرنا ہو گا۔

ب: جب "تقویٰ" کی نسبت آگ یا کفر یا گناہ کی طرف ہو تو اس سے مراد بچنا ہو گا۔

رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ

اے لوگو! ڈرو اپنے اس رب سے جس نے تمہیں پیدا کیا۔(پ4،النسآء:1)

(2) فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

اور بچو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔(پ1،البقرۃ:24)

پہلے "اِتَّقُوْا" کے معنی ڈرنا ہے کیونکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور دوسرے "اِتَّقُوْا" کے معنی بچنا ہے کیونکہ اس کے بعد آگ کا ذکر ہے۔

قاعدہ نمبر ٧

من دون اللہ کے معانی اور ان کی پہچان

الف: جب "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" عبادت کے ساتھ آوے تو اس کے معنی ہوں گے اللہ کے سواء۔

ب: جب "مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ" مدد، نصرت، ولایت، دعا بمعنی پکارنا کے ساتھ آوے۔ تو اس کے معنی ہوں گے اللہ کے مقابل یعنی اللہ کے سواء وہ لوگ جو اللہ کے مقابل ہیں۔ "الف" کی مثال یہ ہے:

(1) اِنَّکُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَہَنَّمَ

تم اور وہ چیزیں جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو دوزخ کا ایندھن ہیں۔ (پ17، الانبیآء:98)

(2) وَمَنۡ یَّدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ

اور جو کوئی اللہ کے سوا دوسرے معبود کو پوجے۔ (پ18، المؤمنون:117)

(3) وَّ اَنَّ الۡمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾

بے شک مسجد یں اللہ کی ہیں تو تم خدا کے ساتھ کسی کو نہ پوجو۔ (پ29، الجن:18)

ان جیسی تمام آیتوں میں "مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ" کے معنی اللہ کے سوا ہیں کیونکہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں۔ "ب" کی مثال یہ آیات ہیں:

(1) وَمَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۰۷﴾

اور تمہارا اللہ کے مقابل نہ کوئی دوست ہے اور نہ مددگار۔ (پ1، البقرۃ:107)

(2) اَمۡ لَہُمۡ اٰلِہَۃٌ تَمۡنَعُہُمۡ مِّنۡ دُوۡنِنَا

کیا ان کے پاس ایسے معبود ہیں جو ہمارے مقابل انہیں بچالیں۔ (پ17، الانبیآء:43)

(3) اَلَّا تَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِیۡ وَکِیۡلًا ؕ﴿۲﴾

میرے مقابل کسی کو وکیل نہ بناؤ۔ (پ15، بنی اسرآءیل:2)

(4) اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ شُفَعَآءَ

بلکہ بنالئے انہوں نے اللہ کے مقابل حمایتی۔ (پ24، الزمر:43)

ان جیسی تمام آیتوں میں "مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ" سے مراد اللہ کے مقابل ہوگا یعنی اللہ کے مقابل تمہارا کوئی مددگار، ناصر، سفارشی، وکیل نہیں جو رب سے مقابلہ کرکے تمہیں اس کے عذاب سے بچالے۔ اگر ان آیات میں اس کے معنی اللہ کے سوا کئے گئے یعنی خدا کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں تو ان آیتوں سے تعارض ہوگا جن میں بندوں کو مددگار بتایا گیا ہے جیسا کہ پہلے باب میں گزر چکا۔ اس معنی کی تائید ان آیتوں سے ہو رہی ہے:

(1) قُلۡ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَعۡصِمُکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ اِنۡ اَرَادَ بِکُمۡ سُوۡٓءًا

وہ کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچالے اگر وہ تمہاری برائی چاہے۔ (پ21، الاحزاب:17)

(2) وَاِنۡ یَّخۡذُلۡکُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ

اور اگر تمہیں رب رسوا کرے تو کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے۔ (پ4، اٰل عمرٰن:160)

ان آیتوں نے بتایا کہ کوئی بندہ رب کے خلاف ہو کر اس کے مقابل رب سے کسی کو نہ بچاسکے نہ کسی کی مدد کرسکے ہاں اس کے ارادے، اس کے اذن سے بندے ولی بھی ہیں، شفیع بھی ہیں، مددگار بھی ہیں، وکیل بھی ہیں۔

قاعدہ نمبر ۸

ولی کے معانی اور ان کی پہچان

الف: جب "ولی" رب کے مقابل آوے تو اس سے مراد معبود یا مالک حقیقی ہے اور ایسا ولی اختیار کرنا شرک وکفر ہے۔

ب: جب "ولی" رب کے مقابل نہ ہو تو اس سے مراد دوست یا مددگار، وغیرہ ہیں۔ "الف" کی مثال یہ ہے:

(1) اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْۤا اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْۤ اَوْلِیَآءَ

کیا کافروں نے سمجھ رکھا ہے کہ میرے بندوں کو میرے سوا معبود بنائیں۔ (پ16، الکھف:102)

(2) مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا

ان کی مثال جنہوں نے خدا کے سوا کوئی معبود بنالیا مکڑی کی طرح ہے جس نے گھر بنایا۔ (پ20، العنکبوت:41)

(3) وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ

اور وہ جنہوں نے اللہ کے سوا کوئی معبود بنالئے۔ (پ23، الزمر:3)

ان جیسی آیتوں میں ولی بمعنی معبود ہے یا مالک حقیقی۔ "ب" کی مثال یہ ہے:

(1) اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَهُمْ رٰکِعُوْنَ ﴿۵۵﴾

تمہارا دوست یا مددگار اللہ اور اس کا رسول اور وہ مومن ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور رکوع کرتے ہیں۔ (پ6، المآئدۃ:55)

(2) وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۚۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا ﴿ؕ۷۵﴾

پس ہمارے لئے اپنی طرف سے ولی بنادے اور ہمارے لئے اپنی طرف سے مددگار مقرر فرمادے۔ (پ5، النسآء:75)

ان جیسی آیات میں "ولی" سے مراد معبود نہیں، بلکہ دوست یا مددگار وغیرہ مراد ہیں کیونکہ یہاں رب کے مقابل ولی نہیں فرمایا گیا ہے اس کی پوری تحقیق پہلے باب میں "ولی" کے بیان میں گزر چکی ہے۔

قاعدہ نمبر ۹

دعا کے معانی اوران کی پہچان

الف: جب "دعا" کے بعد دشمنِ خدا کا ذکر ہو یا دعا کا فاعل کافر ہو یا دعا پر رب تعالیٰ کی ناراضگی کا اظہار ہو یا دعا کرنے والوں کو رب تعالیٰ نے کافر، مشرک، گمراہ فرمایا ہو تو دعا سے مراد عبادت، پوجنا وغیرہ ہو گا نہ کہ محض پکارنا یا بلانا۔

ب: جب "دعا" کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو تو وہاں اس کے معنی پکارنا، پوجنا، دعا مانگنا ہو گا حسب موقع معنی کئے جائیں گے۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ

اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو خدا کے سوا ایسوں کو پوجے جو اس کی قیامت تک نہ سنیں۔ (پ26، الاحقاف:5)

(2) وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾

بے شک مسجدیں اللہ کی ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پوجو۔ (پ29، الجن:18)

(3) هُوَ الْحَیُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ

وہ ہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں بس اسے پوجو۔ (پ24، المؤمن:65)

ان جیسی تمام آیات میں "دعا" کے معنی پوجنا ہیں پکارنا یا بلانا نہیں۔ معنی یہ ہوں گے کہ خدا کے سوا کسی کو نہ پوجو۔ یہ مطلب نہیں کہ کسی کو نہ پکارو یا نہ بلاؤ۔

"ب" کی مثال یہ آیات ہیں:

(1) اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً

اپنے رب سے دعا مانگو عاجزی سے پوشیدہ۔ (پ8، الاعراف:55)

(2) اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ

دعا کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا مانگتے ہیں۔ (پ2، البقرۃ:186)

ان جیسی آیات میں دعا سے مراد دعا مانگنا بھی ہو سکتا ہے اور پوجنا بھی، پکارنا بھی، ایک ہی لفظ مختلف موقعوں پر مختلف معانی میں ہوتا ہے اگر بے موقع معنی کئے جاویں تو کبھی کفر لازم آجاتا ہے اس کی تحقیق پہلے باب میں دعا کے بیان میں گزر چکی۔

قاعدہ نمبر ۱۰

شرک کے معانی اور ان کی پہچان

الف: جب "شرک" کا مقابلہ ایمان سے ہو گا تو شرک سے مراد ہر کفر ہو گا۔

ب: جب "شرک" کا مقابلہ اعمال سے ہو گا تو شرک سے مراد مشرکوں کا ساکام ہو گا نہ کہ کفر۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ

مومن غلام مشرک یعنی کافر سے بہتر ہے۔ (پ2، البقرۃ: 221)

(2) وَلَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا

مشرک یعنی کسی کافر سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ (پ2، البقرۃ: 221)

(3) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ

بے شک اللہ مشرک کو نہ بخشے گا اس کے سوا جسے چاہے بخش دے گا۔ (پ5، النسآء: 48)

ان تمام آیتوں میں شرک سے مراد کفر ہے کیوں کہ مومنہ کا کسی کافر مرد سے نکاح جائز نہیں۔ کوئی کفر جس پر انسان مر جاوے بخشا نہ جاوے گا۔ مومن ہر کافر سے بہتر ہے۔ اگر یہاں شرک کے معنی صرف بت پرستی کیا جاوے تو غلط ہو گا۔

"ب" کی مثال یہ ہے:

(1) وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۳۱﴾

نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔ (پ21، الروم: 31)

اس آیت میں اور اس حدیث میں مَنۡ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدۡ کَفَرَ جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی وہ کافر ہو گیا۔ یہ ہی مراد ہے کہ نماز نہ پڑھنا مشرکوں، کافروں کا ساکام ہے کیوں کہ نماز نہ پڑھنا گناہ تو ہے کفر یا شرک نہیں۔

قاعدہ نمبر ۱۱

صلوٰۃ کے معانی اور انکی پہچان

الف: جب "صلوٰۃ" کے بعد "علیٰ" آوے تو اس کے معنی رحمت یا دعاءِ رحمت ہوں گے یا نماز جنازہ۔

ب: جب "صلوٰۃ" کے بعد "علیٰ" نہ آوے تو صلوٰۃ کے معنی نماز ہوں گے۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ

وہ اللہ ہے جو تم پر رحمت کرتا ہے اور اس کے فرشتے دعاءِ رحمت کرتے ہیں۔(پ22،الاحزاب:43)

(2) وَصَلِّ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمۡ

آپ ان کے لئے دعا کریں۔ آپ کی دعا ان کے دل کا چین ہے۔(پ11،التوبۃ:103)

(3) وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰی قَبۡرِہٖ

ان منافقوں میں سے کسی پر نہ آپ نماز جنازہ پڑھیں نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔(پ10،التوبۃ:84)

(4) اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر۔(پ22،الاحزاب:56)

ان جیسی تمام آیتوں میں صلوٰۃ سے مراد دعا یا رحمت یا نماز جنازہ ہی مراد ہوگا کیونکہ کہ ان میں صلوٰۃ کے بعد "علٰی" آرہا ہے۔

"ب" کی مثال یہ ہے:

(1) وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ

نماز قائم کرو اور زکوۃ دو۔(پ1،البقرۃ:43)

(2) اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ﴿۱۰۳﴾

بے شک نماز مسلمانوں پر وقت کے مطابق واجب ہے۔(پ5،النسآء:103)

ان جیسی تمام آیتوں میں صلوٰۃ سے مراد نماز ہے کیونکہ یہاں صلوٰۃ سے علٰی کا تعلق نہیں دوسری آیت میں اگرچہ "علٰی" ہے مگر علٰی کا تعلق کتاباً سے ہے، نہ کہ صلوٰۃ سے لہٰذا یہاں بھی مراد نماز ہی ہے۔

قاعدہ نمبر ۱۲

مُردوں کا سننا اور ہیّت کے معانی اور ان کی پہچان

جب قرآن شریف میں مُردے، اندھے، بہرے، گونگے، قبر والے کے ساتھ نہ لوٹنے، نہ ہدایت پانے، نہ سنانے وغیرہ کا ذکر ہوگا تو ان لفظوں سے مراد کافر ہونگے یعنی دل کے مردے، دل کے اندھے وغیرہ عام مردے وغیرہ مراد نہ ہوں گے اور ان کے نہ سنانے سے مراد ان کا ہدایت نہ پانا ہوگا نہ کہ واقع میں نہ سننا۔ اور ان آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ ان دل کے مردے، اندھے، بہرے کافروں کو نہیں سنا سکتے جس سے وہ ہدایت پر آجاویں یہ مطلب نہ ہوگا کہ آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے مثال یہ ہے۔

(1) صُمٌّۢ بُکۡمٌ عُمۡیٌ فَہُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۸﴾

یہ کافر بہرے، گونگے، اندھے ہیں پس وہ نہ لوٹیں گے۔(پ1،البقرۃ:18)

(2)اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى وَلَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ

تم ان مردوں (کافروں) کو نہیں سنا سکتے اور نہ تم بہروں کو سنا سکتے ہو۔(پ20، النمل:80)

(3) وَمَنۡ كَانَ فِىۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى وَاَضَلُّ سَبِيۡلًا ﴿۷۲﴾

جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہے اور راستے سے بہکا ہوا ہے۔(پ15، بنی اسرآءیل:72)

یہ آیات قرآن شریف میں بہت جگہ آئی ہیں اور ان سب میں مردوں، اندھوں، بہروں سے مراد کفار ہی ہیں نہ کہ ظاہری آنکھوں کے اندھے او ربے جان مردے۔ ان آیات کی تفسیر ان آیتوں سے ہو رہی ہے۔

(1) اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰى وَلَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِيۡنَ ﴿۸۰﴾ وَمَاۤ اَنۡتَ بِهٰدِى الۡعُمۡىِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ ؕ اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۱﴾

بے شک تم نہیں سنا سکتے مردوں کو اور نہ سنا سکتے ہو بہروں کو جب پھریں پیٹھ دے کر اور نہ تم اندھوں کو ہدایت کرنے والے ہو۔ نہیں سنا سکتے تم مگر ان کو جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ مسلمان ہیں۔(پ20، النمل:80،81)

اس آیت میں مردے اور اندھے، بہرے کا مقابلہ مومن سے کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ مردوں سے مراد کافر ہیں۔

(2) وَالَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرٌ وَّهُوَ عَلَيۡهِمۡ عَمًى ؕ اُولٰۤئِكَ يُنَادَوۡنَ مِنۡ مَّكَانٍۢ بَعِيۡدٍ ﴿۴۴﴾

اور جو ایمان نہیں لائے ان کے کانوں میں ٹینٹ ہیں اور وہ ان پر اندھا پن ہے گویا وہ دور جگہ سے پکارے جا رہے ہیں۔(پ24، حٰم السجدۃ:44)

اس آیت نے بتایا کہ کافر گویا اندھا، بہرا ہے۔

(3) اُولٰۤئِكَ الَّذِيۡنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمۡ وَاَعۡمٰٓى اَبۡصَارَهُمۡ ﴿۲۳﴾

یہ کفار وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی پس انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ لعنت سے آدمی اندھا، بہرا ہو جاتا ہے یعنی دل کا اندھا، بہرا۔(پ26، محمد:23)

(4) وَسۡـئَلۡ مَنۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رُّسُلِنَاۤ ۚ اَجَعَلۡنَا مِنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ اٰلِهَةً يُّعۡبَدُوۡنَ ﴿۴۵﴾

جو رسول ہم نے آپ سے پہلے بھیجے ان سے پوچھئے کہ کیا ہم نے اللہ کے سوا اور معبود بنائے ہیں جن کی پوجا کی جاوے۔(پ۲۵، الزخرف:۴۵)

اس آیت نے بتایا کہ اللہ کے پیارے بندے وفات کے بعد سنتے بھی ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں۔ اگر گزشتہ وفات یافتہ پیغمبر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا کلام نہ سنتے یا جواب نہ دیتے تو ان سے پوچھنے کے کیا معنی تھے۔ مردوں کے سننے کی اور آیات بھی ہیں جو پہلے باب میں دعا کے معنی میں بیان کی جاچکیں۔

ہماری ان مذکورہ آیتوں نے بتادیا کہ جہاں مردوں کے سننے سنانے کی نفی کی گئی ہے وہاں مردوں سے مراد کافر ہیں۔ ان آیتوں سے یہ ثابت کرنا کہ مردے سنتے نہیں بالکل جہالت ہے ورنہ التحیات میں حضور کو سلام اور قبرستان میں مردوں کو سلام نہ کرایا جاتا کیونکہ نہ سننے والے کو سلام کرنا منع ہے۔ اسی لئے سوتے ہوئے کو سلام نہیں کرسکتے۔

قاعدہ نمبر ۱۳

ایمان و تقویٰ کے معانی اور ان کی پہچان

جب مومن کو ایمان کا حکم دیا جائے یا نبی کو تقویٰ کا حکم ہو تو اس سے مراد ایمان اور تقویٰ پر قائم رہنا ہو گا کیونکہ وہاں ایمان و تقویٰ تو پہلے ہی موجود ہے اور تحصیل حاصل محال ہے۔ اس کی مثال یہ ہے:

(1) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا

اے ایمان والو! ایمان لاؤ یعنی ایمان پر قائم رہو۔ (پ 5، النسآء: 136)

(2) یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ

اے نبی اللہ سے ڈرو یعنی اللہ سے ڈرے جاؤ۔ (پ 21، الاحزاب: 1)

(3) اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ

اے مومنو! اللہ و رسول پر ایمان لاؤ یعنی ایمان پر قائم رہو۔ (پ 27، الحدید: 7)

ان جیسی تمام آیات میں ایمان و تقویٰ پر استقامت مراد ہے تاکہ ترجمہ درست ہو، نیز مسلمانوں کو احکام عمل کرنے کے لئے دیئے جاتے ہیں اور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو احکام اس لئے دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ عمل کرائیں۔ جیسے جہاز کے مسافر پار اترنے کے لئے جہاز میں سوار ہوتے ہیں اور کپتان پار اتارنے کے لئے وہاں بیٹھتا ہے اسی لئے مسافر کرایہ دے کر اور کپتان تنخواہ لے کر سوار ہوتے ہیں۔

قاعدہ نمبر ۱۴

خلق کے معانی اور ان کی پہچان

الف: جب "خلق" کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد پیدا کرنا ہو گی یعنی نیست کو ہست کرنا۔

ب: جب "خلق" کی نسبت بندے کی طرف ہو تو اس سے مراد ہو گی بنانا، گھڑنا۔

"الف" کی مثال یہ آیات ہیں:

(1) خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا

اللہ نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ تمہارا امتحان کرے کہ کون اچھے عمل والا ہے۔(پ29،الملک:2)

(2) وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٠١﴾(پ7،الانعام:101)

اور پیدا کیا اللہ نے ہر چیز کو اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

(3) خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اللہ نے پیدا کیا تم کو اور تم سے پہلے والوں کو۔(پ1،البقرۃ:21)

ان جیسی تمام آیتوں میں "خلق" کے معنی پیدا کرنا ہے کیونکہ اس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے۔

"ب" کی مثال یہ ہے۔

(1) اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ

عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں بناتا ہوں تمہارے لئے مٹی سے پرندہ کی شکل۔(پ3،اٰل عمرٰن:49)

(2) اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا

تم خدا کے سوا بتوں کو پوجتے ہو اور جھوٹ گھڑتے ہو۔(پ20،العنکبوت:17)

(3) فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿ؕ١٤﴾

پس بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر بنانے ولا ہے۔(پ18،المؤمنون:14)

قاعدہ نمبر ۱۵

حکم، گواہی، ملکیت وکالت کے معانی اور ان کی پہچان

الف: حکم، گواہی، وکالت، حساب لینا، مالک ہونا۔ان چیزوں کو جہاں قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے وہاں حقیقی، دائمی، مستقل مراد ہوگا مثلاً کہا جاوے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے یا خدا کے سواء کسی کو وکیل نہ بناؤ تو مراد حقیقی دائمی مالک و مستقل وکیل ہے۔

ب: جب ان چیزوں کو بندوں کی طرف نسبت کیا جاوے تو ان سے مراد عارضی، عطائی، مجازی ہوں گے۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ

نہیں ہے حکم مگر اللہ تعالیٰ کا۔(پ7،الانعام:57)

(2) وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٧٩﴾

اور اللہ ہی کافی گواہ ہے۔(پ5،النسآء:79)

(3) اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ؕ﴿٢﴾

میرے سوا کسی کو وکیل نہ بناؤ۔(پ15،بنی اسرائیل:2)

(4) وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

آپ کا رب کافی وکیل ہے۔(پ15،بنی اسرائیل:65)

(5) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾

ہم نے آپ کو ان کافروں پر وکیل بنا کر نہ بھیجا۔(پ15،بنی اسرائیل:54)

(6) وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾

آپ ان کافروں پر وکیل نہیں۔(پ7،الانعام:107)

(7) وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۶﴾

اور اللہ کافی ہے حساب لینے والا۔(پ4،النسآء:6)

(8) وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہیں وہ چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔(پ4،اٰل عمرٰن:129)

(9) فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴿۹﴾

پس اللہ تعالیٰ ہی کو وکیل بناؤ۔(پ29،المزمل:9)

ان جیسی ساری آیتوں میں حقیقی مالک، حقیقی وکیل، حقیقی گواہ، حقیقی حساب لینے والا مراد ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حقیقی حاکم نہیں، کوئی حقیقی مالک، حقیقی وکیل، حقیقی گواہ نہیں جیسے کہ سکندر نامے میں ہے۔

پناہ بلندی و پستی توئی

ہمہ نیست اند، آنچہ ہستی توئی

"ب" کی مثال ان آیات میں ہے:

(1) وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا

اور اگر تم خاوند وبیوی کی مخالفت کا اندیشہ کرو تو ایک حکم پنچ خاوند والوں کی طرف سے اور دوسرا حکم پنچ عورت والوں کی طرف سے بھیجو۔(پ5،النسآء:35)

(2) وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ

اور جب تم لوگوں کے درمیان حکومت (فیصلہ) کرو تو انصاف سے کرو۔(پ5،النسآء:58)

(3) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

پس آپ کے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہ ہوں گے، یہاں تک کہ آپ کو اپنے اختلافات میں حاکم مان لیں۔(پ۵، النسآء:۶۵)

(4) وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس ان کا مقدمہ لے جاؤ۔(پ 1، البقرۃ:188)

(5) وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ

اور اپنے میں سے دو پرہیز گاروں کو گواہ بناؤ۔(پ 28، الطلاق:2)

(6) كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴿ؕ۱۴﴾

آج تو اپنے پر خود ہی کافی حساب لینے والا ہے۔(پ 15، بنی اسرآءیل:14)

(7) وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

اور حرام ہیں تم پر شوہر والی عورتیں سواء ان کے جن کے تم مالک ہو۔(پ 5، النسآء:24)

(8) وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ

اور اپنے مردوں میں سے دو گواہ بنالو۔(پ 3، البقرۃ:282)

(9) شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ

تمہاری آپس کی گواہی جب تم میں سے کسی کو موت آوے وصیت کرتے وقت تو تم میں سے دو معتبر شخص ہیں۔(پ 7، المآئدۃ:106)

ان جیسی تمام آیتوں میں عارضی، غیر مستقل، عطائی ملکیت، گواہی، وکالت، حکومت، حساب لینا، بندوں کے لئے ثابت کیا گیا ہے یعنی اللہ کے بندے مجازی طور پر حاکم ہیں، وکیل ہیں، گواہ ہیں لہٰذا آیات میں تعارض نہیں، جیسے سمیع، بصیر، حی وغیرہ اللہ کی صفتیں ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: **اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ** اللہ تعالیٰ ہی سننے والا دیکھنے والا ہے (پ۱۵، بنی اسراءیل:۱) اور بندوں کی بھی صفتیں یہ ہیں۔ فرماتا ہے: **فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۲﴾** ہم نے انسان کو سننے والا، دیکھنے والا بنادیا، اللہ کا سننا، دیکھنا(پ۲۹، الدھر:۲)۔ دائمی، غیر محدود، مستقل، ذاتی ہے اور بندوں کا دیکھنا، سننا، زندہ ہونا۔ عارضی، محدود، عطائی، غیر مستقل ہے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ کا نام بھی "علی" ہے۔ **وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ** (پ۳، البقرۃ:۲۵۵) اور حضرت علی مرتضی کا نام علی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے "مولنا" اَنْتَ مَوْلٰىنَا (پ۳، البقرۃ:۲۸۶) اور عالموں کو مولانا صاحب کہا جاتا ہے مگر اللہ کا علی یا مولیٰ ہونا اور طرح کا ہے اور بندوں کا علی اور مولیٰ ہونا کچھ اور قسم کا یہ فرق ضروری ہے۔

قاعدہ نمبر ۱۶

علم غیب کے مراتب اور ان کی پہچان

الف: جہاں علم غیب کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کیا جاوے یا اس کی بندوں سے نفی کی جاوے تو اس علم غیب سے ذاتی، دائمی، جمیع علوم غیبیہ، قدیمی مراد ہو گا۔

ب: جہاں علم غیب بندوں کے لئے ثابت کیا جاوے یا کسی نبی کا قول قرآن میں نقل کیا جاوے کہ فلاں پیغمبر نے فرمایا کہ میں غیب جانتا ہوں وہاں مجازی، حادث، عطائی علم غیب مراد ہو گا جیسا کہ قاعدہ نمبر ۱۵ میں دیگر صفات کے بارے میں بیان کر دیا گیا۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) قُل لَّا یَعۡلَمُ مَن فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ الۡغَیۡبَ اِلَّا اللّٰہُ

تم فرمادو کہ آسمانوں اور زمین میں غیب کوئی نہیں جانتا اللہ کے سوا۔ (پ20، النمل:65)

(2) عِنۡدَہٗ مَفَاتِحُ الۡغَیۡبِ لَا یَعۡلَمُہَاۤ اِلَّا ہُوَ

اس رب کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ (پ7، الانعام:59)

(3) اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ

قیامت کا علم اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ (پ21، لقمٰن:34)

(4) وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَکۡسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ

اور کوئی جان نہیں جانتی کہ کل کیا کمائے گی اور کوئی جان نہیں جانتی کہ کس زمین میں مرے گی۔ (پ21، لقمٰن:34)

(5) وَلَوۡ کُنۡتُ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ لَاسۡتَکۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَیۡرِ

اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت خیر جمع کر لیتا۔ (پ9، الاعراف:188)

ان جیسی تمام آیات میں علم غیب ذاتی یا قدیمی یا مستقل مراد ہے اس کی نفی

بندوں سے کی جارہی ہے۔ ب کی مثال یہ آیات ہیں:

(1) ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ

قرآن ان پرہیز گاروں کا ہادی ہے جو غیب پر ایمان لائیں (پ1، البقرۃ:2،3) (ظاہر ہے کہ غیب پر ایمان جان کر ہی ہو گا)

(2) عٰلِمُ الۡغَیۡبِ فَلَا یُظۡہِرُ عَلٰی غَیۡبِہٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ

اللہ غیب کا جاننے والا ہے پس نہیں مطلع کرتا اپنے غیب پر کسی کو سوا پسندیدہ رسول کے۔ (پ29، الجن:27،26)

(3) وَعَلَّمَکَ مَا لَمۡ تَکُنۡ تَعۡلَمُ ؕ وَکَانَ فَضۡلُ اللّٰہِ عَلَیۡکَ عَظِیۡمًا ﴿۱۱۳﴾

اور سکھا دیا آپ کو وہ جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ (پ5، النسآء:113)

(4) وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۲﴾

یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ جانتا ہوں میں اللہ کی طرف سے وہ جو آپ نہیں جانتے (پ8، الاعراف:62)

(5) وَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ

اور خبر دیتا ہوں میں تمہیں جو تم اپنے گھروں میں کھاتے ہو اور جو جمع کرتے ہو۔ (پ3، اٰل عمرٰن:49)

(6) قَالَ لَا یَاۡتِیۡکُمَا طَعَامٌ تُرۡزَقٰنِہٖۤ اِلَّا نَبَّاۡتُکُمَا بِتَاۡوِیۡلِہٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمَا ؕ ذٰلِکُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیۡ رَبِّیۡ

یوسف علیہ السلام نے فرمایا جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے وہ تمہارے پاس نہ آئیگا کہ میں اس کی تعبیر اس کے آنے سے پہلے تمہیں بتادوں گا یہ ان علموں میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے (پ13، یوسف:37)۔

(7) وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ﴿٢٤﴾

اور وہ نبی غیب بتانے پر بخیل نہیں۔ (پ30، التکویر:24)

ان جیسی تمام آیتوں میں علم غیب عطائی، غیر مستقل، حادث، عارضی مراد ہے کیونکہ یہ علم غیب بندہ کی صفت ہے جب بندہ خود غیر مستقل اور حادث ہے تو اس کی تمام صفات بھی ایسی ہی ہوں گی۔

قاعدہ نمبر ۱۷

شفاعت کی قسمیں اور ان کی پہچان

الف: جن آیتوں میں شفاعت کی نفی ہے وہاں یا تو دھونس کی شفاعت مراد ہے یا کفار کے لئے شفاعت یا بتوں کی شفاعت مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جبراً شفاعت کوئی نہیں کر سکتا یا کافروں کی شفاعت نہیں یا بت شفیع نہیں۔

ب: جہاں قرآن شریف میں شفاعت کا ثبوت ہے وہاں اللہ کے پیاروں کی مومنوں کے لئے محبت والی شفاعت بالاذن مراد ہے یعنی اللہ کے پیارے بندے مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی اجازت سے محبوبیت کی بنا پر بخشوائیں گے۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ

وہ قیامت کا دن جس میں نہ خرید و فروخت ہے نہ دوستی نہ شفاعت۔ (پ3، البقرۃ:254)

(2) وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿١٢٣﴾

اور اس دن سے ڈرو کہ کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو گی اور نہ اس کو کچھ لے کر چھوڑ دیں اور نہ اسے کوئی شفاعت نفع دے اور نہ ان کی مدد ہو۔ (پ1، البقرۃ:123)

(3) فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِينَ ﴿ؕ٤٨﴾

پس نہ نفع دے گی ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت۔ (پ29، المدثر:48)

(4) اَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ

کیا کافروں نے اللہ کے مقابل سفارشی بنا رکھے ہیں۔ (پ24، الزمر:43)

(5) مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴿ؕ١٨﴾

اور ظالموں کا نہ کوئی دوست نہ کوئی سفارشی جس کا کہامانا جائے۔(پ24،المؤمن:18)

(6) وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

شفاعت کا اختیار نہیں سواءان کے جو حق کی گواہی دیں اور علم رکھیں۔(پ25،الزخرف:86)

(۷) مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ

اللہ سے الگ ہو کر نہ تمہارا کوئی دوست ہے نہ سفارشی۔(پ۲۱،السجدۃ:۴)

ان جیسی تمام آیتوں میں کفار کی شفاعت،بتوں کی شفاعت،جبری شفاعت کا انکار ہے۔ان آیتوں کو نبیوں،ولیوں یا مومنوں کی شفاعت سے کوئی تعلق نہیں۔

ب کی مثال یہ ہے:

(1) وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ

اور آپ انہیں دعادیں بے شک آپ کی دعاان کے دل کا چین ہے۔(پ11،التوبۃ:103)

(2) مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

وہ کون ہے جو رب کے نزدیک اس کی بے اجازت شفاعت کرے۔(پ3،البقرۃ:255)

(3) لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾

یہ لوگ شفاعت کے مالک نہیں سواءان کے جنہوں نے رب کے نزدیک عہد لے لیا ہے۔(پ16،مریم:87)

(4) وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى

یہ حضرات نہ شفاعت کریں گے مگر اس کی جس سے رب راضی ہوا(مومن کی)۔(پ17،الانبیآء:28)

(5) لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾

شفاعت نفع نہ دے گی مگر ان کو جس کے لئے رب نے اجازت دی اور اس کے کلام سے رب راضی ہوا۔(پ16،طٰہٰ:109)

ان جیسی بہت سی آیتوں میں مسلمانوں کی شفاعت مراد ہے جو اللہ کے پیارے بندے کریں گے تاکہ آیات میں تعارض نہ ہو۔

نوٹ ضروری: جس حدیث میں ارشاد ہے کہ سنت چھوڑنے والا شفاعت سے محروم ہے۔اس سے بلندی درجات کی شفاعت مراد ہے یعنی اس کے درجے بلند نہ کرائے جائیں گے کیونکہ دوسری روایت میں ہے کہ گناہ کبیرہ والوں کے لئے شفاعت ہے یعنی بخشش کی شفاعت،نیز بعض روایات میں ہے کہ زکوٰۃ نہ دینے والے اپنے جانور اور مال کندھے پر لادے ہوئے حاضر بارگاہ نبوی ہوں گے اور شفاعت کی درخواست کریں گے مگر انہیں شفاعت سے منع کر دیا جاوے گا۔اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کے منکر ہو کر کافر ہو گئے تھے اور کافر کی شفاعت نہیں جیسے خلافت صدیقی میں بعض لوگ زکوٰۃ کے منکر ہو گئے یا مراد ہے شفاعت نہ کرنا نہ کہ نہ کر سکنا،اس کا بہت خیال چاہیے یہاں بہت دھوکا لگتا ہے۔

قاعدہ نمبر ۱۸

غیر خدا کو پکارنے کی قسمیں اور ان کی پہچان

الف: جب غیر خدا کو پکارنے سے منع فرمایا جاوے، یا پکارنے والوں کی برائی بیان ہو تو اس پکارنے سے مراد معبود سمجھ کر پکارنا ہے یعنی پوجنا۔

ب: جہاں غیر خدا کو پکارنے کا حکم ہے یا اس پکارنے پر ناراضگی کا اظہار نہ ہو تو اس سے مراد بلانا یا پکارنا ہی ہو گا۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جو خدا کے سوا پوجے۔(پ26، الاحقاف:5)

(2) فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾

اور اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پوجو۔(پ29، الجن:18)

ان جیسی صدہا آیتوں میں دعا کے معنی پوجنا ہے یعنی معبود سمجھ کر پکارنا نہ کہ محض پکارنا۔

"ب" کی مثال ان آیات میں ہے:

(1) وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اللہ کے سوا جس کو طاقت رکھتے ہو بلا لو۔(پ11، یونس:38)

(2) اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ

پکارو انہیں ان کے باپوں کی نسبت سے۔(پ21، الاحزاب:5)

ان جیسی صدہا آیات میں دعا کے معنی پکارنا یا بلانا ہے۔ اس کی پوری تحقیق پہلے باب میں دعا کی بحث میں گذر چکی، وہاں مطالعہ کرو۔

قاعدہ نمبر ۱۹

بندے کو ولی بنانے کی قسمیں اور ان کی پہچان

الف: جب غیر خدا کو ولی بنانے سے منع کیا جائے یا ولی ماننے والوں پر ناراضگی اور عتاب ہو یا ایسے کو مشرک کافر کہا جائے تو ولی سے مراد معبود یا رب کے مقابل مددگار ہو گا یا آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ قیامت میں کافروں کا مددگار کوئی نہیں۔

ب: جب غیر خدا کو ولی بنانے کا حکم دیا جاوے یا اس پر ناراضگی کا اظہار نہ ہو تو ولی سے مراد دوست، مددگار باذن اللہ یا قریب ہو گا۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۸﴾

اور ظالموں کیلئے نہ کوئی دوست ہے نہ مددگار۔ (پ25، الشوریٰ:8)

(2) وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۱۰۷﴾

اللہ کے مقابل تمہارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ مددگار۔ (پ1، البقرۃ:107)

ان جیسی صدہا آیتوں میں اللہ کے مقابل مددگار مراد ہے، ایسا مددگار ماننا کفر ہے۔

"ب" کی مثال ان آیات میں ہے:

(1) اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾

تمہارا مددگار اللہ اور اس کا رسول اور وہ مسلمان ہیں جو زکوٰۃ دیتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔ (پ6، المآئدۃ:55)

(2) وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۚۙ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا ﴿ؕ۷۵﴾

ہمارے لئے اپنی طرف سے دوست بنا اور ہمارے لئے اپنی طرف سے مددگار بنادے۔ (پ7، النسآء:75)

ان جیسی بے شمار آیتوں میں اللہ کے اذن سے مددگار مراد ہیں۔ اس کی پوری تفصیل پہلے باب میں ولی کی بحث میں گزر چکی۔ وہاں مطالعہ کرو۔

قاعدہ نمبر ۲۰

وسیلہ کی قسمیں اور ان کی پہچان

الف: جہاں وسیلہ کا انکار ہے وہاں بتوں کا وسیلہ یا کفار کے لئے وسیلہ مراد ہے۔ یا وہ وسیلہ مراد ہے جس کی پوجا پاٹ کی جاوے۔

ب: جہاں وسیلہ کا ثبوت ہے، وہاں رب کے پیاروں کا وسیلہ یا مومنوں کے لیے وسیلہ مراد ہے تا کہ آیتوں میں تعارض واقع نہ ہو۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى

نہیں پوجتے ہیں ہم ان بتوں کو مگر اس لئے تا کہ وہ ہمیں خدا سے قریب کر دیں۔ (پ23، الزمر:3)

اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین عرب اپنے بتوں کو جو اللہ کے دشمن ہیں خدا رسی کا وسیلہ سمجھ کر پوجتے تھے یعنی ان کے شرک کی وجہ دو ہوئیں۔ ایک دشمنان خدا کو اس تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھنا، دوسرے انہیں پوجنا، صرف وسیلہ اختیار کرنے کی وجہ سے مشرک نہ ہوئے۔ "ب" کی مثال یہ ہے:

(1) وَ ابْتَغُوْۤا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ

اس رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔ (پ6، المآئدۃ:35)

(2) وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۶۴﴾

اور اگر یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرکے آپکے حضور آجاویں پھر خدا سے معافی مانگیں اور رسول بھی ان کے لئے دعامغفرت کریں تو اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پاویں۔(پ5،النسآء:64)

(3) وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

اور وہ رسول انہیں پاک کرتے ہیں اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں۔(پ4،اٰل عمرٰن:164)

(4) قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ

فرماؤ کہ تمہیں موت دے گا وہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔(پ21،السجدۃ:11)

ان جیسی تمام آیتوں میں وسیلہ کا ثبوت ہے مگر وہی وسیلہ مراد ہے جو اللہ کے اذن اور اجازت سے اس کا پیارا بندہ رب تک پہنچائے۔

نوٹ ضروری: وسیلہ اسلام میں بڑی اہم چیز ہے کیونکہ سارے اعمال موت پر ختم ہوجاتے ہیں مگر وسیلہ پکڑنا موت، قبر، حشر ہر جگہ ضروری ہے کہ حضور صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کے نام پر موت ہو، قبر میں ان کے نام پر کامیابی ہو، حشر میں ان کے طفیل نجات ہو، نیز اور اعمال کی ضرورت صرف انسانوں کو ہے مگر وسیلہ کی ضرورت ہر مخلوق کو دیکھو کعبہ معظمہ حضور صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کے وسیلہ کے بغیر قبلہ نہ بنا اور حضور کے ہاتھوں کے بغیر بتوں کی گندگی سے پاک نہ ہوسکا۔ وسیلہ کا انکار اسلام کے بڑے اہم مسئلہ کا انکار ہے۔

قاعدہ نمبر ۲۱

کسی کے اعمال دوسرے کے کام آنے نہ آنے کا قاعدہ

الف: جن آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ انسان کو صرف اپنے عمل ہی کام آویں گے یا فرمایا گیا ہے کہ نہیں ہے انسان کے لئے مگر وہ جو خود کرے، اس سے مراد بدنی فرض عبادتیں ہیں یا یہ مطلب ہے کہ قابل اعتماد اپنے اعمال ہیں کسی کے بھیجنے کا یقین نہیں۔

ب: جن آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ دوسروں کی نیکی اپنے کام آتی ہے۔

اس سے مراد اعمال کا ثواب ہے یا مصیبت دور ہونا یا درجے بلند ہونا۔

"الف" کی مثال یہ ہے۔

(1) وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾

نہیں ہے انسان کیلئے مگر وہ جو کوشش کرے۔(پ27،النجم:39)

(2) لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

اس نفس کیلئے مفید ہیں وہ عمل جو خود کرے اور اس کو مضر ہیں وہ گناہ جو خود کرے۔(پ3،البقرۃ:286)

ان دنوں آیتوں کا منشا یہ ہے کہ کوئی کسی کی طرف سے فرض نماز نہیں پڑھ سکتا، فرضی روزہ نہیں رکھ سکتا، ان آیتوں میں اسی لئے سعی اور کسب کا ذکر ہے یا منشاء یہ ہے کہ اپنی ملکیت انہی عملوں پر ہے جو خود کر لئے جاویں کیا خبر کوئی دوسرا ثواب بھیجے یا نہ بھیجے۔ اس کے بھروسا پر خود غافل رہنا بیو قوفی ہے۔"ب" کی مثال یہ ہے:

(1) وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا

حضرت خضر نے فرمایا کہ اس دیوار کے نیچے دو یتیموں کا خزانہ ہے اور ان کا باپ نیک تھا پس تمہارے رب نے چاہا کہ یہ بالغ ہوں تو اپنا خزانہ نکالیں۔(پ16،الکھف:82)

(2) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ

اور جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ہم نے ان کی اولاد ان سے ملادی اور ان کے عمل میں انہیں کچھ کمی نہ دی ۔(پ27،الطور:21)

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ جس گرتی ہوئی دیوار کی مرمت حضرت خضر و موسیٰ علیہما السلام نے کی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اس کے نیچے خزانہ تھا جو ایک نیک آدمی کا تھا۔ اس کے دو چھوٹے بچے تھے، رب تعالیٰ نے چاہا کہ دیوار کھڑی رہے اور خزانہ محفوظ رہے تاکہ بچے جوان ہو کر نکال لیں۔ اس لئے دو پیغمبروں کو اس کی مرمت کے لئے بھیجا، ان نابالغ یتیموں پر یہ مہربانی ان کے باپ کی نیکی کی وجہ سے ہوئی۔

دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ نیکوں کی مومن اولاد جنت میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہے گی اگرچہ اولاد کے اعمال باپ سے کم درجہ کے ہوں۔ ایسے ہی نابالغ بچے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے فرزندان حضرت طیب وطاہر و قاسم وابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہم جنت میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ ہوں گے حالانکہ کوئی نیکی نہ کی۔ معلوم ہوا کہ کسی کی نیکی دوسرے کے کام آجاتی ہے۔ اسی وجہ سے ایصال ثواب، فاتحہ وغیرہ کرتے ہیں بلکہ حج بدل بھی دوسرے کی طرف سے کرسکتے ہیں۔ اور زکوۃ میں دوسرے کے نائب بن سکتے ہیں۔

قاعدہ نمبر ۲۲

کسی کا بوجھ اٹھانے کی صورتیں اور ان کی پہچان

الف: جن آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اس کا مطلب ہے کہ بخوشی نہ اٹھائے گا یا اس طرح نہ اٹھائے گا جس سے مجرم آزاد ہو جائے گا۔

ب: جن آیتوں میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت میں بعض لوگ بعض کا بوجھ اٹھائیں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ مجبوراً اٹھائیں گے یا یہ بھی اٹھائیں گے اور مجرم بھی

یہ تو اٹھائیں گے گناہ کرانے کی وجہ سے اور مجرم بوجھ اٹھائے گا گناہ کرنے کی وجہ سے۔

"الف" کی مثال یہ آیت ہے:

(1) وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى

اور نہ کمائے گا کوئی نفس مگر اپنے ذمہ پر اور کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گی۔(پ8،الانعام:164)

(2)اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا

اگر تم بھلائی کروگے تو اپنے لئے بھلائی کروگے اور اگر برا کروگے تو اپنا۔(پ15،بنی اسر آءیل:7)

(3)مَنِ اهۡتَدٰى فَاِنَّمَا يَهۡتَدِىۡ لِنَفۡسِهٖ‌ۚ وَمَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيۡهَا

جو راہ پر آیا وہ اپنے ہی بھلے کو راہ پر آیا اور جو بہکا وہ اپنے ہی برے کو بہکا۔(پ15،بنی اسر آءیل:15)

(4)وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوۡا سَبِيۡلَنَا وَلۡنَحۡمِلۡ خَطٰيٰكُمۡ ؕ وَمَا هُمۡ بِحٰمِلِيۡنَ مِنۡ خَطٰيٰهُمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ ؕ اِنَّهُمۡ لَـكٰذِبُوۡنَ ﴿۱۲﴾

اور کافر مسلمانوں سے بولے ہماری راہ پر چلو اور ہم تمہارے گناہ اٹھالیں گے حالانکہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ نہ اٹھائیں گے بے شک وہ جھوٹے ہیں۔(پ20،العنکبوت:12)

(5)لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَـكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ‌ۚ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۴﴾

اس جماعت کے لئے وہ ہے جو وہ خود کما گئی تمہارے لئے تمہاری کمائی ہے اور تم ان کے اعمال سے نہ پوچھے جاؤ گے۔(پ1،البقرۃ:134)

ان تمام آیتوں سے معلوم ہوا کہ کسی کی پکڑ دوسرے کی وجہ سے نہ ہوگی اور کوئی کسی کا نہ گناہ اٹھائے نہ نیکی سے فائدہ پائے بلکہ اپنی کرنی اپنی بھرنی ہے

"ب" کی مثال یہ ہے:

(1)وَلَيَحۡمِلُنَّ اَثۡقَالَهُمۡ وَاَثۡقَالًا مَّعَ اَثۡقَالِهِمۡ‌ وَلَيُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۳﴾

اور بے شک ضرور اپنے بوجھ اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ اور ضرور قیامت کے دن پوچھے جائیں گے جو کچھ بہتان اٹھاتے تھے۔(پ9،الانفال:25)

(2)يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَاَهۡلِيۡكُمۡ نَارًا وَّقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۔

اے ایمان والو! اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔(پ28،التحریم:6)

(3)وَاتَّقُوۡا فِتۡنَةً لَّا تُصِيۡبَنَّ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡكُمۡ خَآصَّةً ‌ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۵﴾

اور اس فتنہ سے ڈرتے رہو جو ہرگز تم میں سے خاص ظالموں کو ہی نہ پہنچے گا، اور جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

(4)وَلَا تَكُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ

تم قرآن کے پہلے کافر نہ بنو۔(پ1،البقرۃ:41)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ قیامت میں بعض گنہگار دوسرے مجرموں کا بھی بوجھ اٹھائیں گے اور یہ بھی پتا لگا کہ بعض کے گناہوں کی وجہ سے دنیا میں بھی دوسروں پر مصیبت آجاتی ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی نجات کے لئے اپنے گھر والوں کو ہدایت

دینا ضروری ہے۔ مطابقت اسی طرح ہوگی جو ہم نے عرض کر دیا کہ بخوشی کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور کوئی دوسرے کا بوجھ اس طرح نہ اٹھائے گا کہ اصلی مجرم بالکل آزاد ہو جائے ہاں گمراہ کرانے والا بری باتوں کا موجد سارے مجرموں کا بوجھ اٹھائے گا یہ ضرور خیال رکھنا چاہیے۔

قاعدہ نمبر ۲۳

رسولوں میں فرق کرنے کی صورتیں اوران کی پہچان

الف: جن آیتوں میں فرمایا گیاہے کہ رسولوں میں فرق نہ کرو۔ وہاں ایمان میں فرق کرنا مراد ہے یعنی ایسے فرق نہ کرو کہ بعض کو مانو اور بعض کو نہ مانو یا مراد یہ ہے کہ اپنی طرف سے فرق پیدا نہ کرو یعنی ان کے فضائل اپنی طرف سے نہ گھٹاؤ یا ایسا فرق نہ کرو جس سے بعض پیغمبروں کی توہین ہو جاوے۔

ب: جن آیتوں میں فرمایا گیا کہ پیغمبروں میں فرق ہے وہاں درجات اور مراتب کا فرق مراد ہے یعنی بعض کے درجے بعض سے اعلیٰ ہیں۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

مسلمان کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے رسولوں میں فرق نہیں کرتے۔(پ3، البقرۃ:285)

(2) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾

اور وہ جو اللہ تعالیٰ اوراس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی میں فرق نہ کرے۔ یہ وہ ہیں جنہیں رب ان کا ثواب دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔(پ6، النسآء:152)

ان آیتوں میں ایمان کا فرق مراد ہے یعنی بعض پیغمبروں کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا یہ کفر ہے۔ ایمان کے لئے سب نبیوں کو ماننا ضروری ہے اس کی تفسیر اس آیت نے کی۔

(3) اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾

بے شک وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں کا اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان میں رستہ بنالیں۔(پ6، النسآء:150)

اس آیت نے بتادیا کہ پیغمبروں کے درمیان ایمان لانے میں فرق کرنا منع ہے۔

"ب" کی مثال یہ ہے:

(1) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ

یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر بزرگی دی ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض وہ ہیں جنہیں درجوں میں بلند کیا۔(پ3، البقرۃ:253)

(2) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

اے نبی ہم نے آپ کو بھیجا گواہ خوش خبریاں دیتا اور ڈر سناتا اور اللہ کی طرف اس کے اذن سے بلاتا اور چمکانے والا سورج۔(پ22،الاحزاب:45۔46)

(3) وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۷﴾

اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام جہانوں کی رحمت۔(پ17،الانبیآء:107)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ بعض پیغمبر بعض سے افضل ہیں اور خصوصاً ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سارے رسولوں میں ایسے ہیں جیسے تاروں میں سورج اور سارے جہان کی رحمت ہیں یہ صفات اوروں کو نہ ملیں۔

نوٹ ضروری: بعض احادیث میں آیا ہے کہ ہم کو یونس علیہ السلام پر بھی بزرگی نہ دو اور بعض میں آیا ہے کہ ہم تمام اولاد آدم کے سردار ہیں۔ ان احادیث میں مطابقت اسی طرح ہے کہ ایسی بزرگی دینا جس سے یونس علیہ السلام کی توہین ہو جاوے منع ہے اور اس طرح حضور کی شان بیان کرنا کہ ان حضرات کی عظمت برقرار رہے اور حضور کی شان معلوم ہو جائے۔ بالکل جائز بلکہ ضروری ہے۔

قاعدہ نمبر ۲۴

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کو اپنے انجام کی خبر ہونے کی صورتیں اور ان کی پہچان

الف: قرآن شریف میں جہاں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے کہلوایا گیا ہے کہ مجھے خبر نہیں کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا ہو گا۔ وہاں اٹکل، حساب، قیاس، اندازے سے جاننا مراد ہے۔یعنی میں اندازے یا قیاس سے یہ نہیں جانتا۔

ب: اور جہاں اسکے خلاف ہے وہاں وحی، الہام کے ذریعہ سے علم دینا مراد ہے۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) وَمَآ اَدۡرِیۡ مَا یُفۡعَلُ بِیۡ وَلَا بِکُمۡ ؕ

اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جاوے گا اور تمہارے ساتھ کیا۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کے معاملات نجوم، رمل، قیاس، حساب، اٹکل سے معلوم نہیں ہو سکتے میں باوجودیکہ پیغمبر ہوں اور پیغمبر کی عقل تمام دنیا سے بڑھ

چڑھ کر ہوتی ہے لیکن میری کامل عقل ان باتوں کے جاننے کے لئے کافی نہیں میں بھی عقل سے یہ چیزیں نہیں جانتا تو تم کیسے جان سکتے ہو۔ مجھے یہ علم وحی کے ذریعہ ہوا اور تم صاحب وحی نہیں ہو تو ایسی باتوں میں عقل پر زور نہ دیا کرو، اس کی تفسیر اسی آیت کے آخر میں یوں ہو رہی ہے۔

اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ وَ مَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۹﴾ **(پ26،الاحقاف:9)**

میں نہیں پیروی کرتا مگر اس کی جو میری طرف وحی ہوتی ہے اور میں نہیں مگر صاف ڈر سنانے والا۔

معلوم ہوا کہ آخرت کی پکڑ اور نجات وغیرہ وحی سے معلوم ہوتے ہیں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر آتی ہے اس لئے اس آیت میں درایت کی نفی کی گئی۔ درایت کے معنی ہیں عقل سے جاننا، خدا تعالیٰ کے علم کو درایت نہیں کہتے کیونکہ وہ عقل سے پاک ہے، اس کا علم عقلی نہیں حضوری ہے ۔اس کی مثال یہ آیت ہے:

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ

اور یونہی ہم نے تمہیں وحی بھیجی ایک جاں فزا چیز اپنے حکم سے اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے نہ ایمان تفصیل دار۔(پ25، الشوریٰ:52)

اس آیت کا مطلب بھی یہ ہی ہے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن اور ایمان کو عقل، قیاس، اندازے سے معلوم نہ فرمایا۔ بلکہ اس کا ذریعہ وحی الٰہی ہے۔ یہاں بھی داریت کی نفی ہے نہ کہ مطلق علم کی ورنہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ظہور نبوت سے پہلے عبادات کرتے تھے ایمان سے خبر دار تھے۔ عیسی علیہ السلام کا ماں کی گود میں توحید، رسالت، احکام سے واقف ہونا قرآن شریف سے ثابت ہے کہ آپ نے اپنی پیدائش سے چند گھنٹے بعد قوم سے فرمایا۔

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾

فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے اس نے کتاب دی اور نبی فرمایا۔(پ16، مریم:30)

جب کلمۃ اللہ صلوات اللہ علیہ وسلامہ بچپن میں رب سے بے خبر نہیں تو جو حبیب اللہ ہوں وہ کیسے بے خبر ہوں گے۔ لہٰذا اس آیت کے معنی وہ ہی ہیں جو عرض کئے گئے یعنی قیاس سے معلوم کرنا۔

"ب" کی مثال اس آیت میں ہے:

(1) لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ

تاکہ بخش دے اللہ تمہارے طفیل تمہارے وہ گناہ جو اگلے ہیں اور پچھلے ہیں۔(پ26، الفتح:2)

یہاں تمہارے گناہ سے مراد امت کے وہ گناہ ہیں جن کا بخشوانا حضور کے ذمہ کرم پر ہے جیسے وکیل کہتا ہے میرا مقدمہ فتح ہو گیا یعنی وہ مقدمہ جس کی پیروی میرے ذمہ ہے نہ یہ مطلب کہ میں اس میں گرفتار ہوں کیونکہ نبی گناہ سے معصوم ہیں۔

(1) اِنَّاۤ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ؕ﴿۱﴾

ہم نے تم کو کوثر دے دیا۔(پ30، الکوثر:1)

(۲) وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ﴿۴﴾

ہم نے تمہارا ذکر اونچا کر دیا۔(پ۳۰، الانشراح:۴)

ان جیسی بہت سی آیات سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اپنے انجام سے باخبر کئے گئے ہیں مگر یہ علم وحی کا ہے نہ کہ محض عقلی، لہٰذا آیات میں تعارض نہیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تو اپنی امت کے انجام کی بھی خبر رکھتے ہیں قرآن میں حضور کو شاہد فرمایا اور گواہ وہی ہوتا ہے جو واقعہ سے خبر دار ہو۔ اسی لئے فرمایا: حسن حسین

جوانان جنت کے سردار ہیں، ابو بکر جنتی ہیں، فاطمۃ الزہرا جنتی ہیں۔

(مشکاۃ المصابیح، کتاب المناقب، باب مناقب اھل بیت النبی، الحدیث ۶۱۷۱، المجلد الثانی، ص ۴۴۱ والحدیث ۶۰۳۳، ص ۴۱۷، دار الکتب العلمیۃ بیروت)

قاعدہ نمبر ۲۵

نبی کی ہدایت کرنے کی صورتیں اوران کی پہچان

الف: جن آیات میں فرمایا گیا ہے کہ نبی ہدایت نہیں کرتے وہاں مراد ہے اللہ کی مرضی کے خلاف، اس کے مقابل ہدایت نہیں کرتے کہ رب چاہے کسی کو گمراہ کرنا اور نبی ہدایت کردیں یہ ناممکن ہے۔

ب: جہاں فرمایا گیا ہے کہ نبی ہدایت کرتے ہیں وہاں مراد ہے باذن الٰہی ہدایت کرتے ہیں۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) اِنَّكَ لَا تَهۡدِیۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِیۡنَ ﴿۵۶﴾

بے شک تم ہدایت نہیں کرتے جسے محبت کرو لیکن اللہ ہدایت کرتا ہے جسے چاہے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت والوں کو۔ (پ20، القصص:56)

لطیفہ: اس جگہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اَحۡبَبۡتَ فرمایا اور اللہ کیلئے یَشَآءُ فرمایا دونوں جگہ اَحۡبَبۡتَ یا دونوں جگہ یَشَآءُ نہیں بولا گیا۔ اس لئے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ساری مخلوق ہی سے محبت فرماتے ہیں۔ کیونکہ رحمت للعالمین ہیں اور آپ کو پسند ہے کہ سب کو ہی ہدایت ملے مگر آپ کی اس محبت پر ہدایت نہیں ملتی لیکن آپ اسی کی ہدایت چاہتے ہیں جس کی ہدایت رب چاہے جو فنافی اللہ ہو وہ اپنی مشیت رب کی مشیت میں فنا کر دیتا ہے۔ اس کے بغیر چاہے چاہتا بھی نہیں رب تعالیٰ بھی ربوبیت کے لحاظ سے ساری مخلوق سے محبت کرتا ہے کیونکہ رب العالمین ہے اسی لئے ہادی بھیجے مگر چاہتا اس کی ہدایت ہے جس کی ہدایت میں حکمت ہے تو ہدایت نہ حضور کی محض محبت سے ملتی ہے نہ اللہ کی محض محبت سے، ہاں رب کے ارادہ سے اور پھر حضور کے ارادے سے ہدایت نصیب ہوتی ہے۔

(1) وَاِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَیۡكَ اِعۡرَاضُهُمۡ فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ اَنۡ تَبۡتَغِیَ نَفَقًا فِی الۡاَرۡضِ اَوۡ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاۡتِیَهُمۡ بِاٰیَةٍ ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمۡ عَلَی الۡهُدٰی فَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡجٰهِلِیۡنَ ﴿۳۵﴾

اور اگر ان کفار کا پھرنا آپ پر شاق گزرا ہے تو اگر تم سے ہو سکے تو زمین میں کوئی سرنگ تلاش کر لو یا آسمان میں زینہ پھر ان کیلئے نشانی لے آؤ اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا پس تم نادان نہ بنو۔ (پ7، الانعام:35)

(2) لَیۡسَ عَلَیۡكَ هُدٰىهُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ

آپ پر ان کی ہدایت نہیں لیکن اللہ جسے چاہے ہدایت دے۔ (پ3، البقرۃ:272)

ان جیسی تمام آیتوں میں رب کے خلاف مرضی ہدایت دینا مراد ہے یہ نہ نبی سے ممکن ہے نہ قرآن سے۔ "ب" کی مثال یہ ہے:

(1)وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۲﴾

اور تم اے محبوب ہدایت کرتے ہو سیدھے راستے کی۔(پ25،الشورٰی:52)

(2)اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ

بے شک قرآن ہدایت دیتا ہے اس راستہ کی جو سیدھا ہے۔(پ15،بنی اسرآءیل:9)

(3)یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ

وہ نبی مسلمانوں پر اللہ کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور انہیں پاک کرتے ہیں۔(پ4،اٰل عمرٰن:164)

(4)شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ

ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کیلئے ہدایت اور راہنمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں ہیں۔(پ2،البقرۃ:185)

ان جیسی تمام آیات میں جن میں قرآن یا توریت یا نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو ہادی فرمایا گیا ہے۔ ہدایت سے مراد اللہ کی مرضی سے راہ دکھانا ہے۔

قاعدہ نمبر ۲۶

غیر خدا کے نام پر پکارے ہوئے جانور کے حرام حلال ہونے کی صورتیں اور ان کی پہچان

الف: جن آیات میں فرمایا گیا ہے کہ غیر خدا کے نام پر پکارا ہوا جانور حرام ہے وہاں ذبح کے وقت کسی کا نام پکارنا مراد ہے۔

ب: جن آیات میں فرمایا گیا ہے کہ 'غیر خدا کے نام پر پکارا ہوا جانور حرام نہیں ہے حلال ہے ان میں زندگی کی حالت میں کسی کا نام پکارنا مراد ہے جیسے بتوں کے نام پر چھوڑا ہوا جانور یا زید کی بکری، عبدالرحیم کی گائے۔

(1) وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ

اور حرام ہے وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر خدا کا نام پکارا گیا ہو۔(پ2،البقرۃ:173)

(2)وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ

اور تمہارا کیا حال ہے کہ وہ جانور نہیں کھاتے جس پر بوقت ذبح خدا کا نام پکارا گیا۔(پ8،الانعام:119)

(3)وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ

اور حرام ہے وہ جانور جو بتوں پر ذبح کیا جائے۔(پ6،المآئدۃ:3)

ان تمام آیتوں میں اس جانور کے کھانے سے منع فرمایا گیا ہے جو کسی غیر خدا کے نام پر ذبح کیا جاوے کہ حرام کرنے والی یہ ہی چیز ہے۔

ب کی مثال یہ ہے:

(1)مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّلَا سَآىٕبَةٍ وَّلَا وَصِیْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

نہیں مقرر کیا اللہ نے کان چرا ہوا اور نہ بجار اور نہ وصیلہ اور نہ حام لیکن کافر لوگ اللہ پر جھوٹ افترا باندھتے ہیں۔

یہ جانور جو اس آیت میں مذکور ہوئے مشرکین عرب کی طرف سے بتوں کے نام پر چھوڑے جاتے تھے یعنی زندگی میں ان پر غیر خدا کا نام پکارا جاتا تھا اور مشرکین انہیں حرام سمجھتے تھے ان کے حرام سمجھنے کی تردید اس آیت میں کر دی گئی ہے اور انہیں حلال فرمایا گیا۔ لہٰذا آج مشرکین کے چھوڑے ہوئے بجار حلال ہیں اللہ کے نام پر ذبح کرو اور کھاؤ۔ (پ7، المآئدۃ:103)

قاعدہ نمبر ۲۷

نبی کے نفع و نقصان کے مالک ہونے نہ ہونے کی صورتیں اور ان کی پہچان

الف: جہاں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے کہلوایا گیا ہے کہ میں اپنے اور تمہارے نفع کا مالک نہیں ہوں وہاں اللہ کے بغیر مرضی ملکیت مراد ہے۔

ب: جہاں فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم غنی کر دیتے ہیں

وہاں بعطاء الٰہی، اللہ عزوجل کے ارادے سے غنی کرنا اور دینا مراد ہے۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِیۡ نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ

تم فرماؤ کہ میں اپنی جان کے بھلے اور برے کا خود مختار نہیں مگر جو اللہ چاہے۔ (پ9، الاعراف:188)

(2) وَمَاۤ اُغۡنِیۡ عَنۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ

اور میں تم سے دفع نہیں کر سکتا اللہ کے مقابل کوئی چیز (پ13، یوسف:67)

(3) مَّا كَانَ یُغۡنِیۡ عَنۡهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ مِنۡ شَیۡءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیۡ نَفۡسِ یَعۡقُوۡبَ قَضٰىهَا

یعقوب نہیں دفع کر سکتے تھے ان سے اللہ کی کوئی مصیبت مگر یعقوب کے دل کی حاجت تھی جو پوری کر دی۔ (پ13، یوسف:68)

ان جیسی تمام آیتوں میں یہ مراد ہے کہ رب تعالیٰ کے اذن کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا ہر چیز میں اس کی اجازت کا حاجتمند ہوں۔

"ب" کی مثال یہ ہے:

(1) اَغۡنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ مِنۡ فَضۡلِهٖ

غنی کر دیا انہیں اللہ نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے۔ (پ10، التوبۃ:74)

(2) وَلَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ

اور اگر وہ راضی ہوتے اس پر جو انہیں اللہ اور اس کے رسول نے دیا۔ (پ10، التوبۃ:59)

(3) اِذۡ تَقُوۡلُ لِلَّذِیۡۤ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَاَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِ اَمۡسِكۡ عَلَیۡكَ زَوۡجَكَ

جب آپ کہتے تھے اس سے جس پر اللہ نے انعام کیا اور آپ نے اسے نعمت دی کہ اپنی بیوی کو روکو۔ (پ22، الاحزاب:37)

ان آیتوں سے پتالگا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم غنی کرتے ہیں نعمت دیتے ہیں ان میں یہ ہی مراد ہے کہ اللہ کے حکم، اللہ کے ارادہ اور اذن سے نعمتیں بھی دیتے اور فضل بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا دونوں قسم کی آیتوں میں تعارض نہیں۔

قاعدہ نمبر ۲۸

رفع کے معانی اور ان کی پہچان

الف: جب رفع کا مفعول کوئی زمینی جسم ہو تو رفع کے معنی ہوں گے اونچی جگہ میں اٹھانا چڑھانا، اونچا کرنا۔

ب: جب رفع کا مفعول کوئی زمینی جسم نہ ہو تو اس کے معنی ہوں گے روحانی بلندی، مرتبہ کا اونچا ہونا۔

"الف" کی مثال یہ آیات ہیں:

(1) یٰعِیۡسٰۤی اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَہِّرُکَ مِنَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا

اے عیسیٰ میں تمہیں وفات دینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور کافروں سے تمہیں پاک کرنیوالا ہوں۔ (پ3، ال عمرٰن:55)

(2) وَرَفَعَ اَبَوَیۡہِ عَلَی الۡعَرۡشِ

اٹھالیا یوسف نے اپنے ماں باپ کو تخت پر۔ (پ13، یوسف:100)

(3) وَرَفَعۡنَا فَوۡقَہُمُ الطُّوۡرَ

اور ہم نے بنی اسرائیل کے اوپر طور پہاڑ اٹھالیا۔ (پ6، نساء:154)

(4) وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ

اور جب ابراہیم بیت اللہ کی دیواریں اونچی کر رہے تھے۔ (پ1، البقرۃ:127)

ان آیتوں میں چونکہ رفع کا مفعول عیسیٰ علیہ السلام یا یوسف علیہ السلام کے والدین یا طور پہاڑ یا کعبہ کی دیوار ہے اور یہ سب زمینی جسم ہیں لہٰذا ان میں رفع کرنے کے معنی ہونگے بلند جگہ میں پہنچانا، اٹھانا، اونچا کرنا۔ درجے بلند کرنا مراد نہ ہو گا۔

"ب" کی مثال یہ آیت ہے:

(1) وَرَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ ؕ﴿۴﴾

ہم نے آپ کا ذکر اونچا کر دیا۔ (پ30، الانشراح:4)

(2) مِنۡہُمۡ مَّنۡ کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعۡضَہُمۡ دَرَجٰتٍ ؕ

ان پیغمبروں میں بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجے اونچے کئے۔ (پ3، البقرۃ:253)

(3) فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَیُذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ

ان گھروں میں جنہیں بلند کرنے کا اللہ نے حکم دیا اور ان میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔(پ18،النور:36)

ان تمام آیتوں میں چونکہ رفع کا مفعول زمینی جسم نہیں ہے بلکہ ذکر یا درجے یا خدا تعالیٰ کا نام ہے اس لئے یہاں مکانی بلندی مراد نہ ہو گی بلکہ روحانی بلندی مراد ہے، کیونکہ یہ ہی اس کے لائق ہے لہٰذا عیسی علیہ السلام کے بارے میں جو آیت آئی اِنِّیۡ رَافِعُکَ (اٰل عمرٰن:۵۵) اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمہیں آسمان پر اٹھانے والے ہیں یہ نہیں کہ تمہارے درجے بلند کرنے والے ہیں جیسا کہ قادیانی کہتے ہیں کیونکہ عیسی علیہ السلام زمینی جسم ہیں اور جسم کے لئے بلندی مکانی مناسب ہے۔

اعتراض: اگر اس آیت میں مکانی بلندی مراد ہے تو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ یعنی آسمانوں میں رہتا ہو کیونکہ فرمایا گیا ہے رَافِعُکَ اِلَیَّ اپنی طرف اٹھانے والا ہوں خدا کی طرف کونسی ہے؟

جواب: یہاں خدا کی طرف اٹھانے سے مراد آسمان کی طرف اٹھانا ہے کیونکہ اگرچہ زمین وآسمان ہر چیز خدا تعالیٰ ہی کی ہے لیکن آسمان خصوصیت سے تجلی گاہ الٰہی ہے کہ نہ وہاں کسی کی ظاہری بادشاہت ہے نہ کفر وشرک وگناہ لہٰذا آسمان پر جانا گویا خدا کے پاس جانا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا: ءَاَمِنۡتُمۡ مَّنۡ فِی السَّمَآءِ (پ۲۹،الملک:۱۶) یا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اِنِّیۡ ذَاہِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَہۡدِیۡنِ ﴿۹۹﴾ میں اپنے رب کی طرف جارہا ہوں وہ مجھے ہدایت کریگا (پ۲۳،الصّٰفّٰت:۹۹) حالانکہ آپ شام کے ملک میں جارہے تھے مگر چونکہ شام آپ کا عبادت گاہ تھا۔ اس لئے وہاں جانا رب کے پاس جانا قرار دیا گیا۔ اسی لئے مسجدوں کو اللہ کا گھر کہا جاتا ہے خدا وہاں رہتا نہیں مگر چونکہ وہاں کسی کا کام نہیں ہوتا اور نہ مسجد کسی انسان کی ملک ہے۔ لہٰذا وہ خدا کا گھر ہے۔

اعتراض: اس آیت میں فرمایا گیا: اِنِّیۡ مُتَوَفِّیۡكَ وَرَافِعُكَ میں تمہیں وفات دوں گا اور اٹھاؤں گا۔(پ۳،ال عمرٰن:۵۵) یہاں وفات کا ذکر پہلے ہے اور اٹھانے کا ذکر بعد میں معلوم ہوا کہ عیسی علیہ السلام کو موت کے بعد اٹھایا گیا نہ کہ موت سے پہلے۔ (قادیانی)

جواب: اگر یہاں وفات کے معنی موت مان لئے جائیں تو بھی واؤ کیلئے ترتیب لازم نہیں، بہت جگہ ترتیب کے خلاف ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں معنی یہ ہوئے کہ میں پہلے تمہیں اٹھاؤں گا پھر موت دوں گا جیسا کہ ان آیتوں میں ہے۔

(1) وَاسۡجُدِیۡ وَارۡكَعِیۡ

اے مریم تم سجدہ کرو اور رکوع کرو۔(پ3،اٰل عمرٰن:43)

(2) خَلَقَكُمۡ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ

اللہ نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے۔(پ1،البقرۃ:21)

(3) نَمُوۡتُ وَنَحۡیَا

ہم مریں گے اور جئیں گے (پ25،الجاثیۃ:24)

(4) خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَالسَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی ؕ﴿۴﴾

اللہ نے پیدا کیا زمین کو اور اونچے آسمانوں کو۔(پ16،طٰہٰ:4)

(5) خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَيٰوةَ

اس اللہ نے پیدا کیا موت اور زندگی کو۔ (پ29، الملک:2)

(6) وَلَقَدۡ اُوۡحِیَ اِلَیۡكَ وَاِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِكَ

اور بے شک وحی کی گئی تمہاری طرف اور ان پیغمبروں کی طرف جو تم سے پہلے تھے۔ (پ24، الزمر:65)

ان تمام آیتوں میں واؤ ترتیب کے خلاف ہے۔ ایسے ہی اس آیت میں ہے اور اگر واؤ یہاں ترتیب بتائے تب مُتَوَفِّيۡكَ میں جو وفات یا توفّی مذکور ہے۔ اس سے موت مراد نہیں سلانا یا پورا لینا مراد ہے قرآن شریف میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ اے عیسی میں تمہیں سلا کر اپنی طرف اٹھاؤں گا یا میں تمہیں پورا پورا جسم مع روح اپنی طرف اٹھاؤں گا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِبۡرٰهِيۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی ﴿۳۷﴾ یہاں وَفّٰی کے معنی ہیں پورا کیا۔ فرماتا ہے: يَتَوَفّٰكُمۡ بِالَّيۡلِ وَيَعۡلَمُ مَا جَرَحۡتُمۡ بِالنَّهَارِ (پ27، النجم:37) یہاں وفات کے معنی سلانا ہیں یعنی رب تعالیٰ تم کو رات میں سلا دیتا ہے، وہی معنی یہاں مراد ہیں۔

قاعدہ نمبر ۲۹

غیر خدا سے ڈرنے کی صورتیں اور ان کے احکام

الف: جن آیتوں میں خدا کے سوا دوسرے سے ڈرنے کی ممانعت فرمائی گئی یا فرمایا گیا کہ صرف اللہ ہی سے ڈرو۔ وہاں عذاب کا خوف، حساب کا ڈر، پکڑ کا خوف، الوہیت اور کبریائی کا خوف مراد ہے کہ کسی کو معبود سمجھ کر نہ ڈرو یا رب تعالیٰ کے مقابل کسی سے خوف نہ کرو۔

ب: جن آیتوں میں دوسرے سے ڈرنے کا حکم دیا گیا یا فرمایا گیا کہ فلاں پیغمبر فلاں سے ڈرے، وہاں تکلیف کا ڈر، ایذا پہنچانے کا خوف یا فتنہ کا خوف مراد ہے تاکہ آیتوں میں تعارض نہ ہو خلاصہ یہ ہے کہ کبریائی کی ہیبت مومن کے دل میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی چاہیے اور دوسری قسم کے فتنہ، تکلیف کا خوف مخلوق کا ہو سکتا ہے۔

"الف" کی مثال یہ آیات ہیں:

(1) وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ وَاِيَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾

تم میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور صرف مجھ سے ہی ڈرو۔ (پ1، البقرۃ:40)

(2) فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِیۡ

پس ان کافروں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو۔ (پ2، البقرۃ:150)

(3) الَّذِيۡنَ يُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخۡشَوۡنَهٗ وَلَا يَخۡشَوۡنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ

جو اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچاتے اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ (پ22، الاحزاب:39)

(4) فَلَا تَخَافُوۡهُمۡ وَخَافُوۡنِ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۷۵﴾

پس ان سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو اگر تم مسلمان ہو۔(پ4،ال عمرٰن:175)

(5) اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

خبر دار ہو کہ اللہ کے دوستوں پر نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(پ11،یونس:62)

ان جیسی تمام وہ آیتیں جن میں غیر خدا سے ڈرنے کی ممانعت ہے۔ان میں الوہیت کا خوف مراد ہے یا مخلوق کا وہ خوف جو رب کی اطاعت سے روک دے یہ ڈر ممنوع ہے۔"ب" کی مثال یہ آیات ہیں:

(1) اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَ اَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْہُمْ ۚ

تمہاری بعض بیویاں اور بعض اولاد تمہاری دشمن ہیں ان سے ڈرتے رہو۔(پ28،التغابن:14)

(2) قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَاۤ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ﴿۴۵﴾

حضرت موسیٰ وہارون نے عرض کیا کہ اے ہمارے رب ہم ڈرتے ہیں کہ فرعون ہم پر زیادتی کریگا یا سرکشی۔(پ16،طہ:45)

(3) فَلَمَّا رَاٰہَا تَہْتَزُّ کَاَنَّہَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰی لَا تَخَفْ

پھر موسیٰ نے اس لاٹھی کو دیکھا لہراتا ہوا گویا سانپ ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگے اور مڑ کر نہ دیکھا اے موسیٰ نہ ڈرو۔(پ19،النمل:10)

(4) فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی ﴿۶۷﴾

موسیٰ علیہ السلام اپنے دل میں ڈر گئے۔(پ16،طہ:67)

(5) قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْہُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾

کہا موسیٰ علیہ السلام نے اے میرے رب میں نے ان میں ایک آدمی مارڈالا ہے تو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کردیں گے۔(پ20،القصص:33)

(6) فَاَوْجَسَ مِنْہُمْ خِیْفَۃً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ

تو ابراہیم اپنے دل میں ان فرشوں سے ڈر گئے وہ بولے آپ ڈریئے نہیں۔(پ26،الذٰریٰت:28)

ان جیسی بہت سی وہ آیتیں جن میں مخلوق سے ڈرنے کا حکم ہے یا ان سے ڈرنے کا ثبوت ہے ان میں وہی خوف مراد ہے جو عرض کیا گیا یعنی تکلیف کا خوف یا فتنہ کا ڈر۔اس قسم کے ڈر نہ ایمان کے خلاف ہیں اور نہ ولایت اور نبوت کے منافی۔دیکھو موسیٰ علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام نبی ہیں مگر سانپ سے،فرعون سے،ملائکہ سے خوف فرماتے ہیں لہٰذا انبیاء اور اولیاء اللہ سے خوف کرنا کہ یہ ناراض ہو کر بددعائیں دیں گے اور ہم کو نقصان پہنچ جائیگا۔ایمان کے خلاف نہیں بلکہ ایمان کو قوی کرتا ہے موسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے فرعونیوں کا بیڑا غرق ہوا،نوح علیہ السلام کی بددعا سے ساری دنیا کے کافر ہلاک کردیئے گئے۔معلوم ہوا کہ ان کی بددعا خطرناک ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے بغیر کسی بندے کی بددعا کے کسی کو ہلاک نہ کیا۔

ہیچ قومے راخدا رسوانہ کرد تادلے صاحب دلے نامد بدرد

قاعدہ نمبر ۳۰

نبی ﷺ کے ہم جیسے بشر ہونے نہ ہونے کی صورتیں اورانکی پہچان۔ حضور ﷺ نے اپنی بشریت کا اعلان کیوں کیا؟

الف: جن آیتوں میں نبی سے کہلوایا گیا ہے کہ ہم تم جیسے بشر ہیں وہاں مطلب یہ ہے کہ خالص بندے ہونے میں تم جیسے بشر ہیں کہ جیسے تم نہ خدا ہو نہ خدا کے

بیٹے، نہ خدا کے ساجھی، شریک ایسے ہی ہم نہ خدا ہیں نہ اس کے بیٹے نہ اس کے ساجھی۔ خالص بندے ہیں۔

ب: جن آیتوں میں نبی کو بشر کہنے پر کفر کا فتوے دیا گیا ہے اور انہیں بشر کہنے والوں کو کافر کہا گیا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ جو نبی کی ہمسری اور برابری کا دعوی کرتے ہوئے انہیں بشر کہے یا ان کی اہانت کرنے کے لئے بشر کہے یا یوں کہے کہ جیسے ہم محض بشر ہیں نبی نہیں ایسے ہی تم نبوت سے خالی ہو محض بشر ہو۔ وہ کافر ہے۔

"الف" کی مثال یہ ہے:

(1) قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَیَّ

فرمادو کہ میں تم جیسا بشر ہوں کہ میری طرف وحی کی گئی۔ (پ16، الکھف:110)

(2) قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ

ان کے رسولوں نے ان سے کہا کہ ہم تو تمہاری طرح انسان ہیں مگر اللہ اپنے بندوں میں جس پر چاہے احسان فرماتا ہے۔ (پ13، ابراھیم:11)

ان جیسی تمام آیات میں یہی مراد ہے کہ ہم "اِلٰہ" نہ ہونے میں اور خالص بندہ ہونے میں تم جیسے بشر ہیں اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عام انسان پیغمبر کے برابر ہو جاویں۔ ان آیات کی تائید ان آیتوں سے ہو رہی ہے۔

(1) وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓىٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ

اور نہیں ہے کوئی زمین میں چلنے والا اور نہ کوئی پرندہ کہ اپنے پروں پر اڑتا ہو مگر تم جیسی امتیں ہیں۔ (پ7، الانعام:38)

(2) مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ

اس اللہ کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق جس میں چراغ ہے۔ (پ18، النور:35)

ان آیتوں میں تمام جانوروں کو انسانوں کی مثل فرمایا گیا حالانکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اللہ تعالیٰ کے نور کو طاق اور چراغ سے مثال دی گئی۔ حالانکہ کہاں طاق اور چراغ اور کہاں رب کا نور جیسے ان دونوں آیتوں کی وجہ سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم جانوروں کی طرح یا رب کا نور طاق اور چراغ کی طرح۔ اسی طرح نہیں کہا جاسکتا کہ ہم نبی کے برابر یا ان کی طرح ہیں۔ یہ تمثیل فقط سمجھانے کیلئے ہے۔

"ب" کی مثال یہ ہے:

(1) فَقَالُوْۤا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا٘ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّ اسْتَغْنَى اللّٰهُ

پس کافر بولے کیا بشر ہمیں ہدایت کریگالہٰذا وہ کافر ہو گئے پھر وہ پھر گئے اور اللہ بے پرواہ ہے۔(پ28،التغابن:6)

(2) قَالَ لَمۡ اَكُنۡ لِّاَسۡجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۳۳﴾

شیطان نے کہا مجھے زیبا نہیں کہ بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے بجتی مٹی سے بنایا جو سیاہ لیسدار گارے سے تھی۔(پ14،الحجر:33)

(3) فَقَالَ الۡمَلَؤُا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ

تو جس قوم کے سرداروں نے کفر کیا وہ بولے یہ تو نہیں مگر تم جیسا آدمی۔(پ18،المؤمنون:24)

(4) وَلَئِنۡ اَطَعۡتُمۡ بَشَرًا مِّثۡلَكُمۡ ۙ اِنَّكُمۡ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ ﴿۳۴﴾

کفار نے کہا کہ اگر تم کسی اپنے جیسے آدمی کی اطاعت کروگے تو تم ضرور گھاٹے میں رہوگے۔(پ18،المؤمنون:34)

(5) فَقَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَيۡنِ مِثۡلِنَا وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوۡنَ ﴿۴۷﴾

فرعونی بولے کیا ہم ایمان لائیں اپنے جیسے دو آدمیوں پر اور ان کی قوم ہماری بندگی کر رہی ہے۔

ان جیسی تمام آیتوں میں فرمایا گیا کہ پیغمبر کو بشر کہنا اولاً شیطان کا کام تھا پھر ہمیشہ کفار نے کہا مومنوں نے یہ کبھی نہ کہا اور ان کفار کے کفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ انبیاء علیہم السلام سے برابری کے دعویدار ہو کر انہیں اپنی طرح بشر کہتے تھے۔

نوٹ ضروری: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا بارہا اپنی بندگی اور بشریت کا اعلان کرنا اس لئے تھا کہ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام میں دو معجزے دیکھ کر انہیں خدا کا بیٹا کہہ دیا، ایک تو ان کا بغیر باپ پیدا ہونا اور دوسرے مردے زندہ کرنا مسلمانوں نے صدہا معجزے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے دیکھے، چاند پھٹتا ہوا۔ سورج لوٹتا ہوا دیکھا کنکر کلمہ پڑھتے دیکھے انگلیوں سے پانی کے چشمے بہتے دیکھے۔ اندیشہ تھا کہ وہ بھی حضور کو خدا یا خدا کا بیٹا کہہ دیں۔ اس احتیاط کے لئے بار بار اپنی بشریت کا اعلان فرمایا۔(پ18،المؤمنون:47)

تیسرا باب

مسائل قرآنیہ

اس باب میں ان ضروری مسائل کا ذکر ہوگا جس کا بعض لوگ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ قرآن شریف سے صراحۃً ثابت ہے اور ان کے ثبوت میں صرف قرآنی آیات ہی پیش کی جاویں گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل قبول فرمائے۔

مسئلہ نمبرا

کرامات اولیاء اللہ حق ہیں

جو عجیب و غریب حیرت انگیز کام نبی (علیہ السلام) سے صادر ہو تو اگر نبوت کے ظہور سے پہلے صادر ہو اوہ ارہاص ہے۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن شریف میں کلام فرمانا یا ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو کنکروں، پتھروں کا بچپن میں سلام کرنا۔

اگر ظہور نبوت کے بعد ہو تو اسے معجزہ کہتے ہیں۔ جیسے موسی علیہ السلام کا عصا اور ید بیضا۔ یا نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا چاند کو چیرنا، سورج کو واپس لانا، اور جو ولی (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) سے صادر ہو اسے کرامت کہتے ہیں اور جو عجیب و غریب کام کافر سے ہو وہ استدراج کہلاتا ہے۔ جیسے دجال کا پانی برسانا، مردے زندہ کرنا۔

ابھی تک اللہ عزوجل کے فضل و کرم سے مسلمانوں میں کوئی فرقہ ایسا پیدا نہیں ہوا جو معجزات کا انکار کرتا ہو۔ قادیانی صرف حضرت عیسی علیہ السلام کے معجزات کا انکار کرتے ہیں وہ صرف اس لئے کہ ان کے مسیح موعود میں کوئی معجزہ نہیں۔ تو وہ کہتے ہیں کہ چونکہ اصلی مسیح میں کوئی معجزہ نہ تھا اس لئے ان کے مثل مسیح میں کوئی معجزہ نہیں، ورنہ معجزات کے وہ بھی قائل ہیں۔ خود قرآن کریم کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کا معجزہ مانتے ہیں۔ ہاں بہت لوگ کرامات اولیاء اللہ کے منکر ہو گئے اور کہنے لگے کہ ساری کرامات گھڑے ہوئے قصے کہانی ہیں، قرآن سے ثبوت نہیں۔ ہم وہ آیات قرآنیہ پیش کرتے ہیں جن میں کرامات کا صریحی ذکر ہے۔

(1) كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۗ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ

جب مریم کے پاس زکریا علیہ السلام آتے تو بے موسم پھل پاتے تو کہا اے مریم تمہارے پاس یہ کہاں سے آئے تو بولیں یہ رب کے پاس سے آئے ہیں۔ (پ3، ال عمرٰن: 37)

حضرت مریم بنی اسرائیل کی ولیہ ہیں ان کی کرامت یہ بیان ہوئی کہ مقفل کوٹھڑی میں بے موسم پھل انہیں غیب سے عطا ہوئے یہ کرامت ولی ہے۔

(2) وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾

اصحاب کہف غار میں تین سو برس ٹھہرے نو اوپر۔ (پ15، الکھف: 25)

اصحاب کہف نبی نہیں بلکہ بنی اسرائیل کے ولی ہیں ان کی کرامت یہ بیان ہوئی کہ غار میں تین سو نو برس سوتے رہے۔ اتنا عرصہ بے غذا سونا اور فنا نہ ہونا کرامت ہے۔

(1) وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۗ

اور تم انہیں جاگتا سمجھو اور وہ سور ہے ہیں اور ہم انہیں دائیں بائیں کروٹیں بدلتے ہیں اور ان کا کتا اپنی کلائیاں پھیلائے ہوئے غار کی چوکھٹ پر ہے۔ (پ15، الکھف: 18)

اس آیت میں اصحاب کہف جو اولیاء ہیں۔ ان کی تین کرامتیں بیان ہوئیں ایک تو جاگنے کی طرح اب تک سونا۔ دوسرے رب کی طرف سے کروٹیں بدلنا اور زمین کا ان کے جسموں کو نہ کھانا اور بغیر غذا باقی رہنا تیسرے ان کے کتے کا اب تک لیٹے رہنا یہ بھی ان کی کرامت ہے نہ کہ کتے کی۔

(2) قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۗ

اور بولا وہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ میں تخت بلقیس آپ کے پاس لے آؤں گا آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے۔ (پ19، النمل: 40)

اس آیت میں آصف بن برخیا کی جو بنی اسرائیل کے نبی نہیں بلکہ ولی ہیں کئی کرامتیں بیان ہوئیں۔ بغیر کسی کے پوچھے یمن پہنچ جانا۔ وہاں سے اتناوزنی تخت لے آنا اور یہ دور دراز سفر شام سے یمن تک جانا آنا ایک آن میں طے کرلینا۔

(3) فَانْطَلَقَا ٛ حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ

دونوں موسیٰ و خضر علیہما السلام چلے یہاں تک کہ جب کشتی میں سوار ہوئے تو خضر نے کشتی کو توڑ دیا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تم نے اس لئے توڑ دیا کہ کشتی والے ڈوب جائیں۔(پ15، الکھف:71)

اس آیت کریمہ میں خضر علیہ السلام جو کہ غالباً کسی قوم کے ولی ہیں۔ ان کی یہ کرامت بیان کی کہ انہوں نے کشتی توڑ ڈالی مگر کشتی نہ ڈوبی۔ حالانکہ موسی علیہ السلام کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

(1) وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَیْنِ فَخَشِیْنَاۤ اَنْ یُّرْهِقَهُمَا طُغْیَانًا وَّ كُفْرًا ﴿۸۰﴾

حضرت خضر نے فرمایا کہ اس بچے کے ماں باپ مومن ہیں ہم نے خوف کیا کہ وہ انہیں سرکشی اور کفر پر چڑھادے۔(پ16، الکھف:80)

اس آیت میں حضرت خضر کی یہ کرامت بیان ہوئی کہ انہوں نے مقتول بچے اور اس کے والدین کے انجام کو جان لیا کہ وہ مومن رہیں گے اور یہ کافر ہو گا حالانکہ یہ علوم خمسہ میں سے ہے۔

(2) وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ

خضر نے فرمایا کہ اس دیوار کے نیچے دو یتیموں کا خزانہ ہے اور ان کا باپ نیک آدمی تھا۔(پ16، الکھف:82)

اس آیت میں خضر علیہ السلام کی یہ کرامت بیان ہوئی کہ انہوں نے زمین کے نیچے کا دفینہ معلوم کرلیا۔ ان جیسی بہت سی آیات میں اولیاء اللہ کی کرامات بیان ہوئیں، ان کا علم غیب، طی الارض یعنی بہت جلد سفر طے کرنا، بے آب و غذا بہت عرصہ زندہ رہنا، غرضیکہ بہت کرامات کا ذکر ہے۔

مسئلہ نمبر ۲

اولیاء اللہ مشکل کشا، دافع البلاء، حاجت روا ہیں

اللہ کے مقبول بندے باذن الٰہی مشکل کشا حاجت روا دافع بلا ہیں

اللہ کے پیارے اللہ کے حکم سے بندوں کی حاجتیں پوری کرتے ہیں مشکلیں حل کرتے ہیں قرآن کریم اس کا اعلان فرما رہا ہے۔ دور و نزدیک ہر جگہ سے مافوق الاسباب مشکل کشائی اور مدد کرتے ہیں۔

(1) اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ بَصِیْرًا ۚ

میرا یہ کرتہ لے جاؤ اسے میرے باپ کے منہ پر ڈال دو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی۔(پ13، یوسف:93)

(2) فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا ۚ

پھر جب خوشی سنانے والا آیا تو وہ قمیص یعقوب کے منہ پر ڈال دی۔ اسی وقت ان کی آنکھیں لوٹ آئیں۔(پ13،یوسف:96)
یعقوب علیہ السلام نابینا ہو گئے تھے ان کی اس مصیبت کو یوسف علیہ السلام نے اپنی قمیص کے ذریعہ دور فرمایا اور ان کی مشکل کشائی کی قمیص سے شفا دینا مافوق الاسباب مدد ہے

(3)وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۗ

اور بے شک زلیخانے قصد کر لیا یوسف کا اور یوسف علیہ السلام بھی ارادہ کر لیتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے۔(پ12،یوسف:24)
یوسف علیہ السلام کو زلیخا نے سات کوٹھڑیوں میں بند کر کے اپنی طرف مائل کرنا چاہا تو آپ نے سامنے یعقوب علیہ السلام کو دیکھا کہ آپ اشارے سے منع فرمارہے ہیں جس سے آپ کے دل میں ادھر میلان نہ پیدا ہوا۔ یہ رب تعالیٰ کی برہان تھی جس کا ذکر اس آیت میں ہے تو یعقوب علیہ السلام نے کنعان سے بیٹھے ہوئے مصر کی بند کوٹھڑی میں یوسف علیہ السلام کی یہ مدد کی کہ انہیں بڑی آفت اور ارادہ گناہ سے بچالیا۔ یہ ہے اللہ والوں کی مشکل کشائی اور مافوق الاسباب امداد۔

(1)وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ

عیسی علیہ السلام نے کہا کہ میں اللہ کے حکم سے شفا دیتا ہوں مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں۔(پ3،ال عمرٰن:49)
اندھا، کوڑھی ہونا بلا ہے جسے عیسی علیہ السلام اللہ کے حکم سے دفع کر دیتے ہیں لہٰذا اللہ کے پیارے دافع البلا ہوتے ہیں یعنی مافوق الاسباب مشکل کشائی فرماتے ہیں۔

(2)فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۗ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ۗ

ہم نے موسی علیہ السلام سے کہا کہ اپنی لاٹھی سے پتھر کو مارو پس فوراً اس پتھر سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔(پ1،البقرۃ:60)
بنی اسرئیل تیہ کے میدان میں پیاس کی آفت میں پھنسے تو رب تعالیٰ نے
براہ راست انہیں پانی نہ دیا بلکہ موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ ان کے لئے دافع البلا بن جائیں تاکہ انہیں پانی ملے معلوم ہوا کہ اللہ کے بندے بحکم الٰہی پیاس کی بلا دور کرتے ہیں مافوق الاسباب۔

(3)قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا

جبریل نے مریم سے کہا کہ میں تمہارے رب کا قاصد ہوں آیا ہوں تاکہ تمہیں ستھرا بیٹا دوں۔(پ16،مریم:19)
معلوم ہوا کہ حضرت جبریل علیہ السلام اللہ عزوجل کے حکم سے بیٹا بخشتے ہیں یعنی بندوں کی حاجتیں پوری کرتے ہیں۔

(1) وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۶۴﴾

اے محبوب اگر یہ مجرم لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر کے آپ کے پاس آجاویں اور خدا سے مغفرت مانگیں اور آپ بھی ان کی سفارش کریں تو اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں۔(پ5،النساء:64)

اس آیت نے بتایا کہ جو گناہوں کی بیماری میں پھنس جاوے وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے شفاخانہ میں پہنچے وہاں شفا ملے گی آپ دافع البلاء ہیں اور مافوق الاسباب گناہ بخشوا دیتے ہیں۔

(2) اُرۡکُضۡ بِرِجۡلِکَ ۚ ہٰذَا مُغۡتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ﴿۴۲﴾

اے ایوب زمین پر اپنا پاؤں مارو یہ ہے ٹھنڈا چشمہ نہانے اور پینے کو۔(پ23،ص:42)

ایوب علیہ السلام کی بیماری اس طرح دور فرمائی گئی کہ ان سے فرمایا گیا۔ اپنا

پاؤں زمین پر رگڑو۔ رگڑنے سے پانی کا چشمہ پیدا ہوا۔ فرمایا اسے پی لو۔ اور غسل فرمالو۔ پینے سے اندرونی تکلیف دور ہوئی اور غسل سے بیرونی بیماری کو شفا ہوئی معلوم ہوا کہ پیغمبروں کے پاؤں کا دھوون اللہ کے حکم سے شفا ہے۔ آج آب زمزم اس لئے شفا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایڑی سے پیدا ہوا۔ مدینہ پاک کی مٹی کو خاک شفا کہتے ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پاؤں مبارک سے مس ہوگئی معلوم ہوا کہ بزرگ دافع بلا ہیں اور یہ برکتیں مافوق الاسباب ہیں۔

(1) فَقَبَضۡتُ قَبۡضَۃً مِّنۡ اَثَرِ الرَّسُوۡلِ فَنَبَذۡتُہَا وَ کَذٰلِکَ سَوَّلَتۡ لِیۡ نَفۡسِیۡ ﴿۹۶﴾

پس میں نے فرشتے کے اثر سے ایک مٹھی مٹی لے لی پس یہ مٹی اس بچھڑے میں ڈالدی میرے دل نے یہی چاہا۔(پ16،طہ:96)

سامری نے حضرت جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کے ٹاپ کے نیچے کی خاک اٹھالی اور سونے کے بچھڑے کے منہ میں ڈالی جس سے اس میں زندگی پیدا ہوگئی اور وہ آواز کرنے لگا یہ ہی اس آیت میں مذکور ہے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے تبرکات بے جان دھات میں جان ڈال سکتے ہیں باذن اللہ!

(1) اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ التَّابُوۡتُ فِیۡہِ سَکِیۡنَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَبَقِیَّۃٌ مِّمَّا تَرَکَ اٰلُ مُوۡسٰی وَاٰلُ ہٰرُوۡنَ تَحۡمِلُہُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ

نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس صندوق آوے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے دل کا چین ہے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں معزز موسی اور معزز ہارون کے ترکہ کی اٹھائے لائیں گے اسے فرشتے۔(پ2،البقرۃ:248)

بنی اسرائیل کو ایک صندوق رب تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا جس میں حضرت موسی علیہ السلام کی پگڑی، حضرت ہارون علیہ السلام کی نعلین شریف وغیرہ تھے اور

انہیں حکم تھا کہ جنگ میں اسے اپنے سامنے رکھیں فتح ہوگی۔ اس آیت میں یہی واقعہ مذکور ہے جس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے تبرکات ان کی وفات کے بعد دافع البلاء ہیں خیال رہے مٹی سے جان پڑنا تبرکات سے فتح ہونا مافوق الاسباب مدد ہے۔

(1) وَمَا کَانَ اللہُ لِیُعَذِّبَہُمۡ وَ اَنۡتَ فِیۡہِمۡ ؕ

اور اللہ تعالیٰ انہیں عذاب نہیں دے گا حالانکہ آپ ان میں ہیں۔(پ9،الانفال:33)

(2) لَوۡ تَزَیَّلُوۡا لَعَذَّبۡنَا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡہُمۡ

اگر مسلمان مکہ سے نکل جاتے تو ہم کافروں پر عذاب بھیجتے۔(پ26،الفتح:25)

(3) فَاَخۡرَجۡنَا مَنۡ کَانَ فِیۡہَا مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳۵﴾

پس نکال دیاہم نے قوم لوط کی بستی سے ان مومنوں کو جو وہاں تھے۔(پ27،الذٰریت:35)

ان آیات میں فرمایا کہ دنیاپر عذاب نہ آنے کی وجہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا تشریف فرماہوناہے نیز مکہ والوں پر فتح مکہ سے پہلے اس لئے عذاب نہ آیا کہ وہاں کچھ غریب مسلمان تھے قوم لوط پر عذاب جب آیاتو مومنین کو وہاں سے پہلے ہی نکال دیامعلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور مومنین کے طفیل سے عذاب الٰہی نہیں آتا۔یہ حضرات دافع البلاءہیں بلکہ آج بھی ہمارے اس قدر گناہوں کے باوجود جو عذاب نہیں آتا یہ سب اس سبز گنبد کی برکت سے ہے۔اعلیٰ حضرت نے کیاخوب فرمایا۔

تمہیں حاکمِ برایا تمہیں قاسمِ عطایا

تمہیں دافعِ بلایا تمہیں شافعِ خطایا

کوئی تم ساکون آیا

اعتراض: قرآن شریف سے ثابت ہے کہ بہت دفعہ پیغمبروں نے کسی کو دعایابددعادی۔مگر قبول نہ ہوئی پھر وہ مشکل کشا،دافع البلاکیسے ہوئے؟

جواب: یہ حضرات اللہ کے حکم سے دافع البلاءاور مشکل کشاہیں جہاں اذن الٰہی نہ ہو وہاں بلادفع نہ ہو گی۔ہر چیز کا یہی حال ہے کہ خدا کے حکم سے نفع یا نقصان دیتی ہے غرضیکہ انبیاءواولیاءمافوق الاسباب مدد کرتے ہیں مشکلیں آسان،مصیبت دور فرماتے ہیں۔

مسئلہ نمبر۳

تمہارے منہ سے جو نکلی وہ بات ہو کے رہی

تمہارے منہ سے جو نکلی وہ بات ہو کے رہی!

اللہ کے پیاروں کی زبان کن کی کنجی ہے جوان کے منہ سے نکل جاتاہے وہ اللہ کے حکم سے پوراہو جاتاہے۔اس پر قرآن شریف کی آیتیں گواہ ہیں۔

(1) قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایااچھاجاتیری سزادنیاکی زندگی میں یہ ہے کہ تو کہتاپھریگاکہ چھونہ جانااور بے شک تیرے لئے ایک وعدے کاوقت ہے جو تجھ سے خلاف نہ ہو گا(پ16،طٰہٰ:97)

موسیٰ علیہ السلام سامری سے ناراض ہوگئے کیونکہ اس نے بچھڑا بنا کر لوگوں کو مشرک کر دیا تھا تو آپ کے منہ سے نکل گیا جا تیرے جسم میں یہ تاثیر پیدا ہو جائے گی کہ جس سے تو چھو جاوے تو اسے بھی بخار آ جاوے اور تجھے بھی ایسا ہی ہوا اور وہ لوگوں سے کہتا پھرتا تھا کہ مجھے کوئی نہ چھونا اور فرمایا کہ یہ تو دنیا کی سزا ہے۔ آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے۔

(2) وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ ﴿۴۱﴾

اور لیکن دوسرا قیدی پس سولی دیا جائیگا اور پھر پرندے اس کا سر کھائیں گے فیصلہ ہو چکا اس بات کا جس کا تم سوال کرتے ہو۔ (پ12، یوسف:41)

یوسف علیہ السلام سے جیل میں ایک قیدی نے اپنا خواب بیان کیا آپ نے تعبیر دی کہ تجھے سولی ہوگی۔ وہ بولا کہ میں نے خواب تو کچھ بھی نہ دیکھا تھا میں تو مذاق میں کہتا تھا آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ تو نے خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو جو میرے منہ سے نکل گیا وہ رب تعالیٰ کے ہاں فیصلہ ہو گیا، پتا لگا کہ ان کی زبان رب کا قلم ہے۔

(1) رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤی اَمْوَالِهِمْ وَ اشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۸۸﴾

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے ہمارے رب فرعونیوں کے مال برباد کر دے اور ان کے دل سخت کر دے پس یہ نہ ایمان لاویں جب تک کہ درد ناک عذاب دیکھ لیں۔ (پ11، یونس:88)

موسیٰ علیہ السلام نے فرعونیوں کے لئے تین بد دعائیں کیں ایک یہ کہ ان کے مال ہلاک ہو جائیں۔ دوسرے اپنے جیتے جی یہ ایمان نہ لاویں۔ تیسرے یہ کہ مرتے وقت ایمان لاویں اور پھر ایمان قبول نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ فرعونیوں کا روپیہ پیسہ، پھل، غلہ سب پتھر ہو گیا اور ایمان کی توفیق زندگی میں نہ ملی۔ اور ڈوبتے وقت فرعون ایمان لایا اور بولا اٰمَنْتُ بِرَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ میں حضرت موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لاتا ہوں مگر ایمان قبول نہ ہوا۔ دیکھو فرعون کے سوا کوئی کافر قوم ایمان لا کر نہ مری جو کلیم اللہ علیہ السلام کے منہ سے نکلا وہ ہی ہوا۔

(1) وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ

جب ابراہیم نے عرض کیا کہ مولیٰ اس جگہ کو امن والا شہر بنادے اور یہاں کے باشندوں کو طرح طرح کے پھل دے۔ (پ1، البقرۃ:126)

(2) وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ

ابراہیم نے دعا کی کہ ہماری اولاد میں ہمیشہ ایک جماعت فرمانبردار رکھ۔ (پ1، البقرۃ:128)

(3) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ

اے رب ہمارے اسی مسلم جماعت میں وہ رسول آخری بھیج جو ان پر تیری آیتیں تلاوت کرے۔ (پ1، البقرۃ:129)

(4) رَبَّنَاۤ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْۤ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾

اے میرے رب میں نے اپنی کچھ اولاد ایک جنگل میں بسائی ہے جس میں کھیتی نہیں تیرے حرمت والے گھر کے پاس اے رب ہمارے اس لئے کہ نماز قائم رکھیں تو تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انہیں کچھ پھل کھانے کو دے شائد وہ احسان مانیں۔ (پ13، ابراھیم:37)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی حسب ذیل دعاؤں کا ذکر فرمایا:

(۱)اس جنگل کو شہر بنادے(۲)شہر امن والا ہو(۳)یہاں کے باشندوں کو روزی اور پھل دے(۴)ہماری اولاد سب کافر نہ ہو جائے۔ہمیشہ کچھ مسلمان ضرور رہیں

(۵)اس مومن اولاد میں نبی آخر الزمان پیدا ہوں(۶)لوگوں کے دل اس بستی کی طرف مائل فرمادے۔(۷)یہ لوگ نماز قائم رکھیں۔

آج بھی دیکھ لو کہ یہ سات دعائیں کیسی قبول ہوئیں۔وہاں آج تک مکہ شریف آباد ہے آپ کی ساری اولاد کافر نہ ہوئی سید صاحبان سب گمراہ نہیں ہو سکتے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اسی مومن جماعت میں پیدا ہوئے۔وہاں باوجود یکہ کھیتی باڑی نہیں مگر رزق اور پھل کی کثرت ہے ہر جگہ قحط سے لوگ مرتے ہیں مگر وہاں آج تک کوئی قحط سے نہیں مرا مسلمانوں کے دل مکہ شریف کی طرف کیسے مائل ہیں وہ دن رات دیکھنے میں آرہا ہے کہ فاسق وفاجر بھی مکہ پر فدا ہیں۔

نوٹ ضروری:حضرت ابراہیم علیہ السلام کے منہ سے نکل گیا کہ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ بے کھیتی والا جنگل تاثیر تو دیکھو کہ اب تک وہ جگہ ریتلی ہی ہے کہ وہاں کھیتی ہو سکتی ہی نہیں۔یہ ان کی زبان کی تاثیر ہے۔اور کیوں نہ ہو رب تعالیٰ نے فرمایا:اپنا لڑکا ذبح کر دو۔عرض کیا:بہت اچھا۔فرمایا:اپنے کو نمرود کی آگ میں ڈال دو۔عرض کیا:بہت اچھا۔فرمایا:اپنے بچے بیوی کو ویران جنگل میں بے آب ودانہ چھوڑ آؤ۔عرض کیا:بہت اچھا۔یہ نہ پوچھا کہ کیوں؟ جب وہ رب تعالیٰ کی اتنی مانتے ہیں تو رب تعالیٰ بھی ان کی مانتا ہے۔ خلیل نے کہا جلیل نے مانا غرضکہ انکی زبان کن کی کنجی ہے۔

(1)وَقَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ دَیَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّکَ اِنۡ تَذَرۡہُمۡ یُضِلُّوۡا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَلِوَالِدَیَّ وَلِمَنۡ دَخَلَ بَیۡتِیَ مُؤۡمِنًا وَّلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾

اور نوح نے عرض کیا کہ اے رب میرے زمین پر کافروں میں سے کوئی رہنے والا نہ چھوڑ،بے شک اگر تو انہیں چھوڑے گا تو تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور نہ جنیں گے مگر بدکار ناشکر کو۔اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور اسے جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں ہے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں کو اور کافروں کو نہ بڑھا(پ29،نوح:26۔28)مگر تباہی

سورہ نوح کی ان آخری تین آیتوں میں نوح علیہ السلام کی تین دعائیں ذکر

ہوئیں۔سارے کافروں کو ہلاک کر دے کہ اب ان کی اولاد بھی کافر ہی ہو گی۔میری اور میرے ماں باپ کی مغفرت کر اور جو میرے گھر میں پناہ لے لے اسے بھی بخش دے۔ان دعاؤں کو رب تعالیٰ نے حرف بحرف قبول فرمایا۔سارے عالم کے کافر غرق کر دیے گئے۔آپ کے ماں باپ کی مغفرت کی گئی اور جس نے کشتی میں پناہ لی اسے بچالیا گیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے نبوت کی عینک سے ان کی ہونے والی اولاد تک کا حال معلوم کر لیا کہ وہ کافر ہی ہو گی۔خلاصہ یہ ہوا کہ ان حضرات کی زبانیں"کن"کی کنجی ہیں۔

یہ بھی خیال رہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی جو دعا ارادہ الٰہی کے خلاف ہوتی ہے اس سے انہیں روک دیا جاتا ہے تاکہ ان کی زبان خالی نہ جاوے اور یہ انتہائی عظمت ہوتی ہے۔رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1)یٰۤاِبۡرٰہِیۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ ہٰذَا ۚ اِنَّہٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّکَ ۚ وَاِنَّہُمۡ اٰتِیۡہِمۡ عَذَابٌ غَیۡرُ مَرۡدُوۡدٍ ﴿۷۶﴾

اے ابراہیم اس دعا سے اعراض کرو قوم لوط پر عذاب آنے والا ہے نہیں لوٹ سکتا۔(پ12،ھود:76)

(2) وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ؕ

آپ منافقین میں سے کسی پر جو مر جائے نماز نہ پڑھیں اور اس کی قبر پر کھڑے نہ ہوں۔ (پ10، التوبۃ:84)

ابراہیم علیہ السلام نے قوم لوط کے لئے دعا فرمائی لیکن چونکہ ان کی نجات ارادہ الٰہی کے خلاف تھی لہٰذا انہیں اس سے روک دیا گیا۔ ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو

منافق پر جنازہ سے روک دیا گیا کیونکہ اس نماز میں میت کے لئے دعا بخشش ہوتی ہے اور منافقین کی بخشش ارادہ الٰہی کے خلاف ہے لہٰذا آپ کو اور آپ کے صدقے سے سب کو اس سے منع کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان حضرات کی دعا قبول ہو تو بھی ان کی عظمت اور اگر ان کی دعا کسی وجہ سے قبول نہ بھی ہو سکے تو بھی ان کی عظمت ہے، ان کی مثل کوئی ہو سکتا ہی نہیں۔

مسئلہ نمبر ۴

محبوبانِ خدا دور سے سنتے دیکھتے ہیں

اللہ کے پیارے بندے نزدیک و دور کی چیزیں دیکھتے ہیں اور دور کی آہستہ آواز بھی باذنِ الٰہی سنتے ہیں۔ قرآن کریم اس پر گواہ ہے۔

(1) قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا

ایک چیونٹی بولی کہ اے چیونٹیو اپنے گھروں میں چلی جاؤ تمہیں کچل نہ ڈالیں سلیمان اور ان کا لشکر بے خبری میں تو سلیمان اس چیونٹی کی آواز سن کر مسکرا کر ہنسے۔ (پ19، النمل:19،18)

چیونٹی کی آواز نہایت باریک جو ہم کو قریب سے بھی معلوم نہیں ہوتی حضرت سلیمان علیہ السلام نے کئی میل دور سے سنی کیونکہ وہ اس وقت چیونٹیوں سے کہہ رہی تھی جب آپ کا لشکر ابھی اس جنگل میں داخل نہ ہوا تھا اور لشکر تین میل میں تھا تو آپ نے یہ آواز یقیناً تین میل سے زیادہ فاصلہ سے سنی۔ رہا چیونٹیوں کا یہ کہنا کہ "وہ بے خبری میں کچل دیں۔" اس سے مراد بے علمی نہیں ہے بلکہ ان کا عدل و انصاف بتانا مقصود ہے کہ وہ بے قصور چیونٹی کو بھی نہیں مارتے۔ اگر تم کچلی گئیں تو اس کی وجہ صرف ان کی بے توجہی ہو گی کہ تمہارا خیال نہ کریں اور تم کچلی جاؤ۔

(1) وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْ لَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾

جب قافلہ مصر سے جدا ہوا یہاں ان کے باپ نے کہا کہ بے شک میں یوسف کی خوشبو پاتا ہوں اگر تم مجھے سٹھیا ہوا نہ کہو۔ (پ13، یوسف:94)

یعقوب علیہ السلام کنعان میں ہیں اور یوسف علیہ السلام کی قمیص مصر سے چلی ہے اور آپ نے خوشبو یہاں سے پالی۔ یہ نبوت کی طاقت ہے۔

(2) قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ؕ

اس نے کہا جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہ میں اسے آپ کے پاس حاضر کر دوں گا آپ کے پلک مارنے سے پہلے۔(پ19، النمل:40)

آصف شام میں ہیں اور بلقیس کا تخت یمن میں اور فوراًلانے کی خبر دے رہے ہیں اور لانا جانے کے بغیر ناممکن ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ اس تخت کو یہاں سے دیکھ رہے ہیں یہ ہے ولی کی نظر۔

(3) وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۗ

عیسٰی علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہیں خبر دیتا ہوں اس کی جو تم اپنے گھروں میں کھاتے ہو اور جو جمع کرتے ہو۔(پ3، اٰل عمرٰن:49)

عیسٰی علیہ السلام کی آنکھ گھروں کے اندر جو ہو رہا ہے اسے دور سے دیکھ رہی ہے کہ کون کھا رہا ہے اور کیا رکھ رہا ہے یہ ہے نبی کی قوت نظر۔

(4) اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۗ

وہ ابلیس اور اس کا قبیلہ تم سب کو دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھتے۔(پ8، الاعراف:27)

(1) قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ

فرمادو تم سب کو موت کا فرشتہ موت دیگا جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔(پ21، السجدۃ:11)

شیطان اور اس کی ذریت کو گمراہ کرنے کے لئے، ملک الموت کو جان نکالنے کے لئے یہ طاقت دی کہ عالم کے ہر انسان بلکہ ہر جاندار کو دیکھ لیتے ہیں تو انبیاء و اولیاء کو جو رہبر و ہادی ہیں سارے عالم کی خبر ہونا لازم ہے تاکہ دوا کی طاقت بیماری سے کم نہ ہو۔

(2) وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ

اور لوگوں کو حج کا اعلان سنادو وہ آئیں گے تمہارے پاس پیدل اور ہر اونٹنی پر۔(پ17، الحج:27)

ابراہیم علیہ السلام کی آواز تمام انسانوں نے سنی جو قیامت تک ہونے والے ہیں۔

(3) وَكَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾

اور اس طرح ہم ابراہیم کو دکھاتے ہیں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اور اس لئے کہ وہ عین الیقین والوں میں سے ہو جائیں۔(پ7، الانعام:75)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی آنکھوں کو رب تعالٰی نے وہ بینائی بخشی کہ انہوں نے "تحت الثرٰی" سے "عرش اعلٰی" تک دیکھ لیا۔ کیونکہ خدا کی بادشاہی تو ہر جگہ ہے اور ساری بادشاہی انہیں دکھائی گئی۔

(4) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۗ﴿۱﴾

کیا نہ دیکھا آپ نے کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں سے کیا کیا؟(پ30، الفیل:1)

(1) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿۶﴾

کیا نہ دیکھا آپ نے اے محبوب کہ آپ کے رب نے قوم عاد سے کیا کیا؟(پ30، الفجر:6)

اصحاب فیل کی تباہی نبی صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم کی ولادت شریف سے چالیس دن پہلے ہے اور قوم عاد و ثمود پر عذاب آنا حضور کی ولادت شریف سے ہزاروں برس پہلے ہے لیکن ان دونوں قسم کے واقعوں کے لئے رب تعالٰی نے استفہام انکاری کے طور پر فرمایا: "اَلَمْ تَرَ" کیا آپ نے یہ واقعات نہ

دیکھے یعنی دیکھے ہیں معلوم ہوا کہ نبی کی نظر گذشتہ آئندہ سب کو دیکھتی ہے اس لئے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے معراج کی رات دوزخ میں مختلف قوموں کو عذاب پاتے دیکھا۔ حالانکہ ان کا عذاب پانا قیامت کے بعد ہو گا۔ اس لئے رب تعالیٰ نے فرمایا:

(2) سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۱﴾

پاک ہے وہ اللہ جو راتوں رات لے گیا اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں بے شک وہ بندہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ (پ15، بنی اسرآءیل:1)

معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نظر نے اگلے پچھلے واقعات، اللہ کی ذات، صفات، نشانیاں، قدرت سب کو دیکھا۔

اعتراض: یعقوب علیہ السلام کی نظر اور قوت شامہ اگر اتنی تیز تھی کہ مصر کے حالات معلوم کر لیئے تو چالیس سال تک فراق یوسف میں کیوں روتے رہے ان کے رونے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ یوسف علیہ السلام سے بے خبر تھے۔

جواب: اس کا آسان جواب تو یہ ہے کہ انبیاء کی تمام قوتیں اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہیں جب چاہتا ہے تب انہیں ادھر متوجہ کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے ادھر متوجہ نہیں فرماتا۔ بے علمی اور ہے بے توجہی کچھ اور۔ تحقیقی جواب یہ ہے کہ یعقوب علیہ السلام کا گریہ عشق الٰہی میں تھا یوسف علیہ السلام اس کا سبب ظاہری تھے مجاز حقیقت کا پل ہے ورنہ آپ یوسف علیہ السلام کے ہر حال سے واقف تھے خود قرآن کریم نے ان کے کچھ قول ایسے نقل فرمائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتے تھے۔ فرماتا ہے۔

(1) قَالَ اِنَّمَاۤ اَشۡکُوۡا بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ وَ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۶﴾ یٰبَنِیَّ اذۡہَبُوۡا فَتَحَسَّسُوۡا مِنۡ یُّوۡسُفَ وَ اَخِیۡہِ وَ لَا تَایۡـَٔسُوۡا مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ ؕ

میں اپنی پریشانی اور غم کی فریاد اللہ سے کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اے بچو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ سے ناامید نہ ہو۔ (پ13، یوسف:87،86)

(2) عَسَی اللّٰہُ اَنۡ یَّاۡتِیَنِیۡ بِہِمۡ جَمِیۡعًا ؕ

قریب ہے کہ اللہ ان تینوں یہودا، بنیامین، یوسف کو میرے پاس لائے گا۔ (پ13، یوسف:83)

پہلی آیت میں فرمایا گیا کہ برادارن یوسف علیہ السلام بنیامین کو مصر میں چھوڑ کر آئے تھے مگر آپ فرماتے ہیں یوسف اور اس کے بنیامین بھائی کا سراغ لگاؤ یعنی وہ دونوں ایک ہی جگہ ہیں دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ دوبارہ مصر میں بظاہر یہودا اور بینامین دونوں گئے تھے مگر آپ فرماتے ہیں کہ اللہ ان تینوں کو میرے پاس لائے گا تیسرے کون تھے وہ یوسف علیہ السلام ہی تو تھے۔

(3) وَ کَذٰلِکَ یَجۡتَبِیۡکَ رَبُّکَ وَ یُعَلِّمُکَ مِنۡ تَاۡوِیۡلِ الۡاَحَادِیۡثِ

اے یوسف تمہیں اللہ اسی طرح نبوت کے لئے چنے گا اور تمہیں باتوں کا انجام بتائے گا۔ (پ12، یوسف:6)

خود تعبیر دے چکے ہیں کہ تم نبی بنو گے اور علم تعبیر دیئے جاؤ گے اور ابھی تک وہ تعبیر ظاہر نہ ہوئی تھی اور آپ جانتے تھے کہ یہ خواب سچا ہے ضرور ظاہر ہو گا۔

اعتراض: حضرت سلیمان علیہ السلام کو بلقیس کے ملک کی خبر نہ ہوئی ہدہد نے کہا
اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَ جِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ ﴿۲۲﴾
میں وہ بات دیکھ آیا ہوں جو آپ نے نہ دیکھی اور میں آپ کے پاس سبا سے سچی خبر لایا ہوں۔ (پ19، النمل:22)
اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:
قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾
فرمایا اب ہم دیکھیں گے کہ تونے سچ کہا یا تو جھوٹوں میں سے ہے۔ (پ19، النمل:27)
اگر آپ ملک بلقیس سے واقف ہوتے تو بلقیس کے پاس خط بھیج کر یہ تحقیق کیوں فرماتے کہ ہدہد سچا ہے یا جھوٹا معلوم ہوا کہ آپ بلقیس سے بے خبر تھے اور ہدہد خبر دار تھا پتا لگا کہ نبی کے علم سے جانور کا علم زیادہ ہو سکتا ہے۔ (وہابی دیوبندی)
جواب: ان آیات میں رب تعالیٰ نے کہیں نہ فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام کو علم نہ تھا ہدہد نے بھی آکر یہ نہ کہا کہ آپ کو بلقیس کی خبر نہیں وہ کہتا ہے اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ میں وہ چیز دیکھ کر آیا جو آپ نے نہ دیکھی۔ یعنی نہ آپ وہاں گئے تھے نہ دیکھ کر آئے تھے۔ یہ کہاں سے پتا لگا کہ آپ بے خبر بھی تھے اگر بے خبر ہوتے تو جب آصف کو حکم دیا کہ بلقیس کا تخت لاؤ تو آصف نے کہا کہ حضور میں نے وہ جگہ دیکھی نہیں نہ مجھے خبر ہے کہ

اس کا تخت کہاں رکھا ہے آپ ہدہد کو میرے ساتھ بھیجیں وہ راستہ دکھائے تو میں لادوں گا نہ کسی سے راستہ پوچھا نہ پتا دریافت کیا بلکہ آناً فاناً حاضر کر دیا۔ اگر وہ تخت ان کی نگاہوں کے سامنے نہ تھا تو لے کیسے آئے جب آصف کی نگاہ سے تخت غائب نہیں تو حضرت سلیمان علیہ السلام سے کیسے غائب ہو گا۔ مگر ہر کام کا ایک وقت اور ایک سبب ہوتا ہے بلقیس کے ایمان لانے کا یہ ہی وقت تھا اور ہدہد کو اس کا سبب بنانا منظور تھا تاکہ پتا لگے کہ پیغمبروں کے درباری جانور بھی لوگوں کو ایمان دیا کرتے ہیں اس لیے اس سے پہلے آپ کو بلقیس کی خبر نہ دی۔ آپ کا تحقیق فرمانا بے علمی کی دلیل نہیں ورنہ رب تعالیٰ بھی قیامت میں تمام مخلوق کے اعمال کی تحقیق فرما کر فیصلہ کرے گا۔ تو چاہئے کہ وہ بھی بے خبر ہو۔

مسئلہ نمبر ۵

مردے سنتے ہیں اور محبوبین بعد وفات مدد کرتے ہیں

اس مسئلہ کی تحقیق پہلے بابوں میں ہو چکی ہے کہ مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے کہ مردے سنتے ہیں اور زندوں کے حالات دیکھتے ہیں کچھ اجمالی طور سے یہاں عرض کیا جاتا ہے۔
(1) فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ﴿۷۹﴾

پس پکڑ لیا قوم صالح کو زلزلے نے تو وہ صبح کو اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے پھر صالح نے ان سے منہ پھیرا اور کہا کہ اے میری قوم میں نے تمہیں اپنے رب کی رسالت پہنچادی اور تمہاری خیر خواہی کی لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔(پ8،الاعراف:78۔79)

(2)فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْۚ-فَكَیْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ﴿۹۳﴾

توشعیب نے ان مرے ہوؤں سے منہ پھیرا اور کہااے میری قوم میں تمہیں اپنے رب کی رسالت پہنچا چکا اور تمہیں نصیحت کی تو کیوں کر غم کروں کافروں پر۔(پ9،الاعراف:93)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ صالح علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام نے ہلاک شدہ قوم پر کھڑے ہو کر ان سے یہ باتیں کیں۔

(3)وَ سْــٴَـلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ٘-اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ﴿۴۵﴾

ان رسولوں سے پوچھو جو ہم نے آپ سے پہلے بھیجے کیا ہم نے رحمن کے سوا اور خدا ٹھہرائے ہیں جو پوجے جاویں۔(پ25،الزخرف:45)

گزشتہ نبی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں وفات پاچکے تھے فرمایا جارہا ہے کہ وفات یافتہ رسولوں سے پوچھو کہ ہم نے شرک کی اجازت نہ دی تو ان کی امتیں ان پر تہمت لگا کر کہتی ہیں کہ ہمیں شرک کا حکم ہمارے پیغمبروں نے دیا ہے۔

اگر مردے نہیں سنتے تو ان سے پوچھنے کے کیا معنی؟ بلکہ اس تیسری آیت سے تو یہ معلوم ہوا کہ خاص بزرگوں کو مردے جواب بھی دیتے ہیں اور وہ جواب بھی سن لیتے ہیں۔اب بھی کشف قبور کرنے والے مردوں سے سوال کرلیتے ہیں۔اس لئے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے بدر کے مقتول کافروں سے پکار کر فرمایا کہ بولو میرے تمام فرمان سچے تھے یا نہیں۔فاروق اعظم نے عرض کیا کہ بے جان مردوں سے آپ کلام کیوں فرماتے ہیں تو فرمایا وہ تم سے زیادہ سنتے ہیں۔

(صحیح البخاری،کتاب الجنائز،باب فی عذاب القبر،الحدیث1370،ج1،ص462،دار الکتب العلمیۃ بیروت)

دوسری روایت میں ہے کہ دفن کے بعد جب زندے واپس ہوتے ہیں تو مردہ ان کے پاؤں کی آہٹ سنتا ہے۔(مکاشفۃ القلوب،الباب الخامس والاربعون فی بیان القبر وسؤالہ،ص۱۷۱،دار الکتب العلمیۃ بیروت)

اسی لئے ہم نمازوں میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کرتے ہیں اور کھانا کھانے والے،استنجا کرنے والے،سوتے ہوئے کو سلام کرنا منع ہے کیونکہ وہ جواب نہیں دے سکتے تو جو جواب نہ دے سکے اسے سلام کرنا منع ہے اگر مردے نہ سنتے ہوتے تو قبرستان جاتے وقت انہیں سلام نہ کیا جاتا اور نماز میں حضور کو سلام نہ ہوتا۔

ضروری ہدایت:زندگی میں لوگوں کی سننے کی طاقت مختلف ہوتی ہے بعض قریب سے سنتے ہیں جیسے عام لوگ اور بعض دور سے بھی سن لیتے ہیں جیسے پیغمبر اور اولیائ۔مرنے کے بعد یہ طاقت بڑھتی ہے گھٹتی نہیں لہٰذا عام مردوں کو ان کے قبرستان میں جاکر پکار سکتے ہیں دور سے نہیں لیکن انبیاء واولیاء علیہم الصلوۃ والسلام کو دور سے بھی پکار سکتے ہیں کیونکہ وہ جب زندگی میں دور سے سنتے تھے تو بعد وفات بھی سنیں گے۔لہٰذا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو ہر جگہ سے سلام عرض کرو مگر دوسرے مردوں کو صرف قبر پر جاکر دور سے نہیں۔

دوسری ہدایت: اگرچہ مرنے کے بعد روح اپنے مقام پر رہتی ہے لیکن اس کا تعلق قبر سے ضرور رہتا ہے کہ عام مردوں کو قبر پر جا کر پکارا جاوے تو سنیں گے مگر اور جگہ سے نہیں۔ جیسے سونے والا آدمی کہ اس کی ایک روح نکل کر عالم میں سیر کرتی ہے لیکن اگر اس کے جسم کے پاس کھڑے ہو کر آواز دو تو سنے گی۔ دوسری جگہ سے نہیں سنتی۔

اعتراض: حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو جو نماز وغیرہ میں سلام کیا جاوے اس میں یہ نیت نہ ہو کہ آپ سن رہے ہیں بلکہ جیسے کسی سے سلام کہلا کر بھیجتے ہیں یا کسی کو خط میں سلام لکھتے ہیں ایسے ہی سلام کیا جائے کیونکہ دور کے آدمی کا سلام فرشتے پہنچاتے ہیں اور پاس والے کا سلام خود حضور سنتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ (وہابی)

جواب: اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ تمہارے عقیدے کے یہ بھی خلاف ہے کہ تم تو کہتے ہو کہ مردے سنتے ہی نہیں اور آیات پیش کرتے ہو اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبر انور میں سے سن لیا تو تمہارے قول کے خلاف ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ جب کسی کے ہاتھ سلام کہہ کر بھیجتے ہیں تو اسے خطاب کر کے السلام علیکم نہیں کہتے بلکہ جانے والے کو کہتے ہیں کہ ہمارا سلام کہہ دینا ہم لوگ نماز وغیرہ میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو خط تو لکھتے نہیں تمہارے قول کے مطابق فرشتوں سے کہلا کر بھیجتے ہیں تو اس صورت میں یہ نہ کہا جاتا کہ اے نبی تم پر سلام ہو بلکہ یوں کہا جانا چاہئے کہ اے فرشتو! حضور سے ہمارا سلام کہنا، خطاب فرشتوں سے ہونا چاہیے تھا۔ تیسرے یہ کہ تمہاری پیش کردہ حدیث میں یہ نہیں ہے کہ دور والے کا سلام نہیں سنتے صرف یہ ہے کہ دور والے کا سلام ملائکہ پیش کرتے ہیں ہو سکتا ہے کہ ملائکہ بھی پیش کرتے ہوں اور سرکار خود بھی سنتے ہوں، جیسے کہ فرشتے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں بندوں کے اعمال پیش کرتے ہیں تو خدا کیا ان کے اعمال خود نہیں جانتا ضرور جانتا ہے مگر پیشی بھی ہوتی ہے۔

اعتراض: مردے نہیں سنتے قرآن کریم فرما رہا ہے:

(1) وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ ﴿۲۲﴾

تم قبر والوں کو نہیں سنا سکتے۔ (پ22، فاطر: 22)

(2) اِنَّكَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی وَ لَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ ﴿۸۰﴾ وَ مَاۤ اَنۡتَ بِهٰدِی الۡعُمۡیِ عَنۡ ضَلٰلَتِهِمۡ ؕ

پس تم نہیں سنا سکتے مردوں کو اور نہیں سنا سکتے بہروں کو پکار جب وہ پیٹھ دے کر پھریں اور نہ اندھوں کو ان کی گمراہی سے راہ پر لاؤ۔ (پ20، النمل: 80،81)

ان آیات میں صاف بتایا گیا کہ قبر والے اور مردے نہیں سنتے۔

جواب: اس اعتراض کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ تم بھی نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے سننے کے قائل ہو کہ جو قبر انور پر سلام پڑھا جاوے وہ سرکار سن لیتے ہیں وہ بھی اس آیت کے خلاف ہوا۔ دوسرے یہ کہ آیت میں یہ بھی ہے کہ تم اندھوں کو گمراہی سے نہیں نکال سکتے حالانکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے ہزاروں اندھے ہدایت پر آ گئے۔ تیسرے یہ کہ یہاں قبر والوں اور مردوں، اندھوں اور بہروں سے مراد وہ کفار ہیں جن پر مہر ہو چکی جن کے ایمان کی توقع نہیں اسے خود قرآن کریم بتا رہا ہے۔ چنانچہ تمہاری پیش کردہ انہی آیات کے آخر میں یہ ہے۔

(1) اِنۡ تُسۡمِعُ اِلَّا مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۱﴾

تم اس کو سناتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاویں اور وہ مسلمان ہوں۔(پ20،النمل:81)

یہ سورہ نمل اور سورہ روم میں دونوں جگہ ہے اگر وہاں اندھے، بہرے، مردے سے مراد یہ اندھے اور مردے ہوتے تو ان کے مقابل ایمان اور اسلام کا ذکر کیوں ہوتا۔ پتا لگا کہ اس سے دل کے مردے، دل کے اندھے مراد ہیں۔ انہیں مردہ بہرہ اس لئے فرمایا کہ جیسے مردے پکار سے نفع او ر نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ ایسے ہی یہ لوگ ہیں نیز قرآن کریم کافروں کے بارے میں فرماتا ہے:

(2) صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡیٌ فَهُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۸﴾

یہ کفار بہرے، گونگے، اندھے ہیں پس وہ نہ لوٹیں گے۔(پ1،البقرۃ:18)

(3) اَوَمَنۡ كَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِهٖ فِی النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا ؕ كَذٰلِكَ زُیِّنَ لِلۡكٰفِرِیۡنَ مَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾

اور کیا وہ جو مردہ تھا تو ہم نے اسے زندہ کر دیا اور اس کے لئے ایک نور کر دیا جس سے لوگوں میں چلتا ہے وہ اس جیسا ہو گا جو اندھیروں میں ہے ان سے نکلنے والا نہیں یوں ہی کافروں کی آنکھ میں ان کے اعمال بھلے کر دیئے گئے ہیں۔(پ8،الانعام:122)

اس آیت میں مردے سے مراد کافر، زندگی سے مراد ہدایت، اندھیروں سے مراد کفر، روشنی سے مراد ایمان ہے۔ یہ آیت تمہاری پیش کردہ آیات کی تفسیر ہے۔

(4) وَمَنۡ كَانَ فِیۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰی فَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰی وَاَضَلُّ سَبِیۡلًا ﴿۷۲﴾

جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہے اور راستے سے بہکا ہوا ہے۔(پ15،بنی اسرآءیل:72)

اس میں بھی اندھے سے مراد دل کا اندھا ہے نہ کہ آنکھ کا اندھا، بہر حال جن آیتوں میں اندھوں، مردوں، بہروں کے نہ سننے نہ ہدایت پانے کا ذکر ہے ۔ وہاں کفار مراد ہیں بلکہ مردے مدد بھی کرتے ہیں آیات ملاحظہ ہوں۔

(1) وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِیۡثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ ؕ

اور وہ وقت یاد کرو جب اللہ نے نبیوں کا عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تمہارے پاس رسول تشریف لاویں جو تمہاری کتابوں کی تصدیق کریں تو تم ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا۔(پ3،اٰل عمرٰن:81)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام پیغمبروں سے عہد لیا کہ تم محمد مصطفی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا حالانکہ وہ پیغمبر آپ کے زمانہ میں وفات پا چکے تو پتا لگا کہ وہ حضرات بعد وفات حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان بھی لائے اور روحانی مدد بھی کی چنانچہ سب نبیوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے معراج کی رات نماز پڑھی یہ اس ایمان کا ثبوت ہوا حج وداع میں بہت سے پیغمبر آپ کے ساتھ حج میں شریک ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام نے اسلام والوں کی مدد کی کہ پچاس نمازوں کی پانچ کرا دیں آخر میں عیسیٰ علیہ السلام بھی ظاہری مدد کے لئے آئیں گے اموات کی مدد ثابت ہوئی۔

(2) وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۶۴﴾

اور اگر یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو تمہارے پاس آجاویں پھر خدا سے مغفرت مانگیں اور رسول بھی ان کیلئے دعاء مغفرت کریں تو اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں۔(پ5،النساء:64)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مدد سے توبہ قبول ہوتی ہے اور یہ مدد زندگی سے خاص نہیں بلکہ قیامت تک یہ حکم ہے یعنی بعد وفات بھی ہماری توبہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ہی کی مدد سے قبول ہوگی بعد وفات مدد ثابت ہوئی۔ اسی لئے آج بھی حاجیوں کو حکم ہے کہ مدینہ منورہ میں سلام پڑھتے وقت یہ آیت پڑھ لیا کریں اگر یہ آیت فقط زندگی کے لئے تھی تو اب وہاں حاضری کا اور اس آیت کے پڑھنے کا حکم کیوں ہے۔

(3) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۷﴾

اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر جہانوں کے لئے رحمت۔(پ17،الانبیاء:107)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تمام جہانوں کی رحمت ہیں اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد بھی جہان تو رہے گا اگر آپ کی مدد اب بھی باقی نہ ہو تو عالم رحمت سے خالی ہو گیا۔

(4) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا

اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام لوگوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر۔(پ22،سبا:28)

اس "لِلنَّاسِ" میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آئے اور آپ کی یہ مدد تا قیامت جاری ہے۔

(5) وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ

اور یہ بنی اسرائیل کافروں کے مقابلہ میں اسی رسول کے ذریعہ سے فتح کی دعا کرتے تھے پھر جب وہ جانا ہوا رسول ان کے پاس آیا تو یہ ان کا انکار کر بیٹھے۔(پ1،البقرۃ:89)

معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے بھی لوگ آپ کے نام کی مدد سے دعائیں کرتے اور فتح حاصل کرتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مدد دنیا میں آنے سے پہلے شامل حال تھی تو بعد بھی رہے گی اسی لئے آج بھی حضور کے نام کا کلمہ مسلمان بناتا ہے۔ درود شریف سے آفات دور ہوتی ہیں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے تبرکات سے فائدہ ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے تبرکات سے بنی اسرائیل جنگوں میں فتح حاصل کرتے تھے۔ یہ سب بعد وفات کی مدد ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ وآلہ وسلم! اب بھی بحیات حقیقی زندہ ہیں ایک آن کے لئے موت طاری ہوئی اور پھر دائمی زندگی عطا فرمادی گئی قرآن کریم تو شہیدوں کی زندگی کا بھی اعلان فرمارہا ہے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ زندوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ فلاں عالم ہے، حافظ ہے، قاضی ہے اور مردوں کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ عالم تھا، زندوں کے لئے "ہے" اور مردوں کے لئے "تھا" استعمال ہوتا ہے۔ نبی کا کلمہ جو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ کی زندگی میں پڑھتے تھے وہی کلمہ قیامت تک پڑھا جاوے گا کہ حضور اللہ کے رسول ہیں۔ صحابہ کرام بھی کہتے تھے کہ حضور اللہ کے رسول ہیں۔ شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین ہیں اور ہم بھی یہ ہی کہتے ہیں اگر آپ زندہ نہ ہوتے تو ہمارا کلمہ بدل جانا چاہئے تھا ہم کلمہ یوں پڑھتے کہ حضور اللہ تعالیٰ کے رسول تھے، جب آپ کا کلمہ نہ بدلا تو معلوم ہوا کہ آپ کا حال بھی نہ بدلا لہٰذا آپ اپنی زندگی شریف کی طرح ہی سب کی مدد فرماتے ہیں ہاں اس زندگی کا ہم کو احساس نہیں۔

مسئلہ نمبر ٦

یاد گاریں قائم کرنا اور بڑی تاریخوں پر خوشیاں منانا

جس تاریخ یا جس دن میں کبھی کوئی نعمت آئی ہو تا قیامت وہ تاریخ معظم ہو جاتی ہے۔ اس تاریخ میں یاد گاریں منانا، خوشیاں منانا، خوشی میں عبادتیں کرنا حکم قرآن ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔ (پ2، البقرۃ:185)

(2) اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا لَیْلَةُ الْقَدْرِ ﴿۲﴾ لَیْلَةُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ﴿۳﴾

بے شک ہم نے قرآن شب قدر میں اتارا اور تمہیں کیا خبر کہ شب قدر کیا ہے شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ (پ30، القدر:1۔3)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ شب قدر اور ماہ رمضان کی اتنی عظمت ہے کہ شب قدر تو ہزار ماہ سے افضل ہو گئی اور ماہ رمضان باقی مہینوں سے بہتر ہو گیا اور اس کا نام قرآن میں آیا اس کے سوا کسی مہینہ کا نام قرآن میں نہ آیا محض اس لئے کہ یہ مہینہ اور یہ رات قرآن کے نزول کا وقت ہے قرآن تو ایک دفعہ اتر چکا مگر ان کی یہ عظمت ہمیشہ کیلئے ہو گئی۔

(3) وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾

اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو۔ (پ30، الضحیٰ:11)

(4) قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

فرمادو کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت پر خوب خوشیاں مناؤ وہ ان کی دھن دولت سے بہتر ہے۔ (پ11، یونس:58)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ جس تاریخ میں اللہ کی نعمت ملی ہو اس کی یاد گار مناؤ، خوشیاں مناؤ۔

(5) وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۵﴾

اے موسیٰ بنی اسرائیل کو اللہ کے دن یاد دلادو جن دنوں میں ان پر نعمتیں اتریں بے شک اس میں نشانیاں ہیں ہر بڑے صبر والے شکر گزار کو۔ (پ13، ابراھیم:5)

(6) قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآىٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰیَةً مِّنْكَ

عیسیٰ ابن مریم نے عرض کیا کہ یارب ہم پر آسمان سے دستر خوان اتار کہ وہ ہمارے لئے اگلوں پچھلوں کی عید ہو اور یہ تیری طرف سے نشانی ہو۔ (پ7، المآئدۃ:114)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو انعامات کی تاریخیں یاد دلاتے رہو ان کی یادگاریں قائم کرو اور عیسیٰ علیہ السلام نے غیبی دستر خوان کے آنے کی تاریخ کو اپنے اگلے پچھلے سارے عیسائیوں کے لئے عید قرار دیا۔ لہٰذا میلاد شریف، گیارہویں شریف، بزرگوں کے عرس، فاتحہ، چالیسواں، تیجہ وغیرہ سب جائز ہیں کیونکہ یہ اللہ کی نعمت کی یادگاریں ہیں اور یادگاریں منانا حکم قرآنی ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(7) وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

اللہ کی نعمت یاد کرو جو تم پر ہے۔ (پ6، المآئدۃ:7)

اعتراض: مسلم و بخاری کی روایت میں ہے کہ جمعہ کا روزہ نہ رکھو۔

(صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب صوم یوم الجمعۃ، الحدیث ۱۹۸۴، ج۱، ص ۶۵۲، دار الکتب العلمیۃ بیروت)

بعض روایتوں میں ہے کہ جمعہ کو روزے سے خاص نہ کرو۔

معلوم ہوا کہ کسی دن کی تعیین منع ہے۔ چونکہ میلاد اور عرس میں تاریخ مقرر ہوتی ہے لہٰذا منع ہے۔ (وہابی)

جواب: اس کا جواب اسی حدیث میں آگے ہے کہ اگر جمعہ کسی ایسی تاریخ میں آجائے جس کے روزے کے تم عادی ہو تو رکھو یعنی اگر کسی کی عادت بارہویں کے روزے کی ہے اور جمعہ بارہویں کو آ گیا تو رکھ لے، نیز فرماتے ہیں نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کہ "صرف جمعہ کو روزہ نہ رکھے بلکہ آگے پیچھے ایک دن اور بھی ملائے "معلوم ہوا کہ مقرر کرنا منع نہیں بلکہ جمعہ کے روزہ کی ممانعت ہے ممانعت کی وجہ کچھ اور ہے۔ کیا وجہ ہے؟ اس کے متعلق علماء کے بہت سے قول ہیں ایک یہ بھی ہے کہ جمعہ مسلمانوں کی عید ہے اور عید کو روزہ منع ہوتا ہے اس مناسبت سے اس کا روزہ منع ہے یعنی یہ مشابہ عید کے ہے دوسرے یہ کہ جمعہ کا دن کام کاج کا ہے غسل کرنا، کپڑے تبدیل کرنا، جمعہ کی تیاری کرنا، خطبہ سننا، نماز جمعہ پڑھنا، ممکن ہے کہ روزے کی وجہ سے تکلیف ہو لہٰذا ان کاموں کی وجہ سے روزہ نہ رکھے جیسے حاجی کو نویں تاریخ بقر عید کا روزہ اور حاجی کو بقر عید کی نماز مکروہ ہے اس لئے کہ وہ دن اس کے کام کے ہیں روزے سے اس کے کاموں میں حرج ہوگا۔ تیسرے یہ کہ صرف جمعہ کے روزے میں یہود سے مشابہت ہے کہ وہ صرف ہفتہ کا روزہ رکھتے ہیں تم اگر جمعہ کا روزہ رکھو تو آگے پیچھے ایک دن اور ملالو تاکہ مشابہت نہ رہے۔ چوتھے یہ کہ خود نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ دوشنبہ کا روزہ کیسا ہے فرمایا کہ اسی دن ہماری ولادت ہے اسی دن نزول وحی کی ابتداء ہوئی۔ لہٰذا روزہ رکھو اور خود نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے عاشورہ کا روزہ اسی خوشی میں رکھا کہ اس تاریخ میں موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نجات ملی اگر یادگاریں منانا برا ہوتا تو یہ یادگاریں کیوں منائی جاتیں؟

اعتراض: چونکہ میلاد شریف اور عرس میں لوگ بہت حرام کام بھی کرتے ہیں لہٰذا یہ منع ہے۔

جواب: قاعدہ غلط ہے کوئی سنت حرام کام کے ملنے سے ناجائز نہیں ہو جاتی نکاح سنت ہے مگر لوگوں نے اس میں ہزاروں خرافات ملا دیں تو نکاح کو نہیں روکا جاتا بلکہ ان چیزوں سے منع کیا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر ۷

بزرگوں کی جگہ کی تعظیم اور وہاں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے

جس جگہ کوئی ولی رہتے ہوں یا رہے ہوں یا کبھی بیٹھے ہوں وہ جگہ حرمت والی ہے، وہاں عبادت اور دعا زیادہ قبول ہوتی ہے اس کی تعظیم کرو، دعا مانگو۔
رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(1) وَاِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ فَكُلُوۡا مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ نَّغۡفِرۡ لَـكُمۡ خَطٰيٰكُمۡ‌ؕ وَسَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۵۸﴾

اور یاد کرو جب ہم نے کہا کہ داخل ہو تم اس بستی میں پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک خوب کھاؤ اور دروازے میں سجدہ کرتے داخل ہو اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور نیکی والوں کو اور زیادہ دیں گے۔(پ 1، البقرۃ:58)

اس آیت میں بتایا گیا کہ جب بنی اسرائیل کی توبہ قبول ہونے کا وقت آیا تو ان سے کہا گیا کہ بیت المقدس کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے گھسو اور گناہ کی معافی مانگو، بیت المقدس نبیوں کی بستی ہے اس کی تعظیم کرائی گئی کہ سجدہ کرتے ہوئے جاؤ اور وہاں جاکر توبہ کرو۔

(2) وَمَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا‌ؕ

جو اس مکہ میں داخل ہو گیا امن والا ہو گیا۔(پ4، اٰل عمرٰن:97)

(3) اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ حَوۡلِهِمۡ‌ؕ اَفَبِالۡبَاطِلِ يُؤۡمِنُوۡنَ وَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَكۡفُرُوۡنَ ﴿۶۷﴾

کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ ہم نے حرم شریف کو امن والا بنایا اور ان کے آس پاس کے لوگ اچک لئے جاتے ہیں کیا باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔(پ 21، العنکبوت:67)

ان آیتوں سے پتہ چلا کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی بستی جو کعبہ معظمہ کا شہر ہے بہت حرمت والا اور عظمت والا ہے۔

(4) هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ‌ۚ قَالَ رَبِّ هَبۡ لِىۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً‌ ۚ اِنَّكَ سَمِيۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

وہاں مریم کے پاس زکریا نے دعا مانگی عرض کیا کہ اے رب مجھے اپنی طرف سے ستھری اولاد دے بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔(پ 3، اٰل عمرٰن:38)

(5) قَالَ الَّذِيۡنَ غَلَبُوۡا عَلٰٓى اَمۡرِهِمۡ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيۡهِمۡ مَّسۡجِدًا ﴿۲۱﴾

اور جو اس معاملہ پر غالب آئے وہ بولے کہ ہم اصحاب کہف پر مسجد بنائیں گے۔(پ 15، الکہف:21)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس کھڑے ہو کر اولاد کی دعا مانگی تاکہ قرب ولی کی وجہ سے دعا جلد قبول ہو اور مسلمانوں نے اصحاب کہف کے غار پر مسجد بنائی تاکہ ان کی برکت سے زیادہ قبول ہوا کرے۔

(6) لَاۤ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِۙ ﴿۱﴾ وَاَنۡتَ حِلٌّ ۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِۙ ﴿۲﴾

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر مکہ کی جبکہ اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو۔(پ30،البلد:1۔2)

(7) وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ﴿۱﴾ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ﴿۲﴾ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ﴿۳﴾

قسم ہے انجیر کی، زیتون کی اور طور سینا پہاڑ کی اور اس امانت والے شہر کی۔(پ30،التین:1۔3)

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ جس جگہ اللہ کے بندے ہوں وہ جگہ ایسی حرمت والی ہو جاتی ہے کہ اس کی رب قسم فرماتا ہے۔

ان آیات سے یہ بھی پتہ لگا کہ بزرگوں کے چلّے جہاں انہوں نے عبادت کی وہاں جاکر نماز پڑھنا، دعا کرنا، اس جگہ کی تعظیم کرنا باعث ثواب ہے اسی لئے مدینہ منورہ میں ایک عبادت کا ثواب پچاس ہزار ہے اور مکہ مکرمہ میں ایک کا ثواب ایک لاکھ۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ جگہ اللہ کے پیاروں کی ہے، ریل اگرچہ مساوی لائن سے گزرتی ہے مگر ملتی صرف اسٹیشن پر ہے، اللہ کے بندوں کی جگہ رحمت خدا کے اسٹیشن ہیں۔

مسئلہ نمبر ۸

سچے مذہب کی پہچان

اسلام میں آج بہت سے فرقے ہیں اور ہر فرقہ اپنے کو حق کہتا ہے اور ہر ایک قرآن سے اپنا مذہب ثابت کرتا ہے۔ قرآن سے پوچھو کہ سچا مذہب کون ہے وہ فرماتا ہے:

(1) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اے مسلمانو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔(پ11،التوبۃ:119)

(2) اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

ہم کو سیدھے رستے کی ہدایت دے اور ان کا رستہ جن پر تو نے انعام کیا۔(پ1،الفاتحۃ:5۔6)

(3) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی تو تم ان ہی کی راہ پر چلو۔(پ7،الانعام:90)

(4) قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ

اولاد یعقوب نے کہا کہ ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم اسمٰعیل اسحاق کے معبودوں کو پوجیں گے۔(پ1،البقرۃ:133)

(5) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں اچھی پیروی ہے۔(پ21،الاحزاب:21)

(6) قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا

فرمادو بلکہ ہم پیروی کریں گے ابراہیم کے دین کی جو ہر برائی سے دور ہے۔(پ1،البقرۃ:135)

(7)وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الۡهُدٰى وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ﴿۱۱۵﴾

اور جو رسول کی مخالفت کرے اس کے بعد کہ حق اس پر کھل چکا اور مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ چلے ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے۔(پ5،النسآء:115)

(8)وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا ؕ

اور ایسے ہی ہم نے تم کو درمیانی امت بنایا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تم پر نگہبان گواہ ہیں۔(پ2،البقرۃ:143)

ان مذکورہ آیتوں سے معلوم ہوا کہ سچے مذہب کی پہچانیں دو ہیں ایک تو یہ کہ اس مذہب میں سچے لوگ یعنی اولیاء اللہ، صالحین، علماء ربانی ہوں ، دوسرے یہ کہ وہ عام مومنین کا مذہب ہو، چھوٹے چھوٹے فرقے جن میں اولیاء صالحین نہیں وہ غلط راستے ہیں اس آیت کی تفسیر وہ حدیث ہے اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ (المستدرک للحاکم،کتاب العلم،باب من شذ شذ فی النار،الحدیث ۴۰۴،ج۱،ص۳۱۷،دار المعرفۃ بیروت) بڑے گروہ کی پیروی کرو یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے اب تک جس مذہب پر عام مسلمان رہے ہوں وہ قبول کرو۔ یہ دونوں علامتیں آج صرف مذہب اہل سنت میں پائی جاتی ہیں۔ شیعہ، وہابی، دیوبندی، چکڑالوی میں نہ اولیاء اللہ تھے نہ ہیں۔ تمام چشتی، قادری، سہروردی، نقشبندی اسی سنی مذہب میں گزرے ہیں اور اسی مذہب میں آج ہیں نیز حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم، ان سے حاجتیں مانگنا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو علم غیب ماننا وغیرہ تمام چیزیں عام مسلمان کا مذہب رہا اور ہے۔ اس کی تحقیق کے لئے ہماری کتاب جاء الحق کا مطالعہ کرو۔

لطیفہ: ہر قوم کی تاریخ اس کے نام سے معلوم کرو، قوموں کے موجودہ نام تاریخی نام ہیں ہم اس پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

مرزائی: اس فرقہ کی پیدائش مرزا غلام احمد قادیانی کے وقت سے ہے یعنی بارہویں صدی کی پیداوار ہے اس جماعت کی عمر سو برس ہے۔

چکڑالوی: اس فرقہ کی پیدائش عبداللہ چکڑالوی پنجابی کے وقت سے ہوئی یعنی اس کی عمر ایک سو پندرہ سال ہے۔

اثنا عشری شیعہ: اس فرقہ کی پیدائش بارہ اماموں کے وقت سے ہوئی کیونکہ اثنا عشر کے معنی ہیں بارہ امام، جب بارہ امام پیدا ہوئے تو یہ فرقہ ظہور میں آیا اس لئے اس کی عمر تقریباً گیارہ سو برس ہے یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے تین سو سال بعد میں ہوا، خیال رہے کہ ان شیعہ کے عقیدہ میں امام مہدی پیدا ہو چکے ہیں جو قرآن لے کر چھپ گئے ہیں قریب قیامت آئیں گے۔

وہابی: خواہ دیوبندی ہوں یا غیر مقلد اس فرقے کی پیداوار عبدالوہاب نجدی کے وقت میں ہوئی لہذا اس کی عمر ایک سو پچھتر سال ہے یعنی گیارہویں صدی میں پیدا ہوا۔

بابی، بہائی: ان دونوں فرقوں کی پیداوار بہاء اللہ اور عبداللہ باب کے زمانہ میں ہوئی ان کی عمر سو برس سے بھی کم ہے۔

اہل سنت والجماعت: جب سے سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں آئی تب سے یہ مذہب آیا یعنی جو عمر سنت رسول اللہ کی ہے وہی اس مذہب کی ہے اور چونکہ مسلمانوں کی عام جماعت کا یہی مذہب ہے لہذا اس فرقے کا نام ہوا اہل سنت وجماعت یعنی سنت رسول اور جماعت مسلمین والا فرقہ۔

قرآن پاک کی مذکورہ آیات سے معلوم ہوا کہ یہ ہی فرقہ حق ہے اگرچہ قرآن
پاک کا ترجمہ سب کرتے ہیں حدیثیں سب دبائے پھرتے ہیں اور علماء سارے فرقوں میں ہیں مگر صادقین یعنی اولیاء کاملین، حضور غوث پاک، خواجہ اجمیر، خواجہ بہاؤالدین نقشبند، شیخ شہاب الدین سہروردی گزشتہ اولیاء اللہ اور موجودہ اولیاء کرام، تونسہ شریف، سیال شریف، گولڑہ شریف، علی پور شریف، بٹالہ شریف وغیرہ تمام آستانے والے اسی مذہب پر ہیں۔لہذا ان آیات نے صاف طور پر بتایا کہ یہ ہی مذہب حق ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی پر ہم سب کو رکھے اور اسی پر خاتمہ کرے۔ آمین

مسئلہ نمبر ۹

دم درود کرنا، پڑھ کر پھونکنا
بعض لوگ صوفیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے تعویذ، دم، جھاڑ پھونک کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کھانے کمانے کے ڈھنگ ہیں قرآن میں اس کا ثبوت نہیں بلکہ جو ہوا پیٹ میں سے نکلتی ہے وہ گرم اور بیماری والی ہوتی ہے وہ پھونک بیمار کرے گی شفا نہ دے گی مگر یہ خیال قرآن کے خلاف ہے۔
قرآن کریم نے دم کرنے اور پھونکنے کی تاثیر کا اعلان فرمایا ہے آیات ملاحظہ ہوں پھونکنے میں تاثیر ہے۔
(1) فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴿۲۹﴾
رب تعالیٰ نے فرمایا تو جب میں آدم کے جسم کو ٹھیک کرلوں اور ان میں اپنی طرف سے روح پھونک دوں تو ان کیلئے سجدے میں گر جانا۔(پ14، الحجر:29)
اس آیت سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے روح پھونک کر آدم علیہ السلام کو زندگی
بخشی رب تعالیٰ کا پھونکنا وہ ہے جو اس کی شان کے لائق ہو مگر لفظ پھونکنے کا استعمال فرمایا گیا بلکہ جان کو روح اسی واسطے کہتے ہیں کہ وہ پھونکی ہوئی ہوا ہے ۔روح کے معنی ہوا، پھونک ہیں۔
(۲) وَ مَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ ﴿۱۲﴾

اللہ بیان فرماتا ہے اور عمران کی بیٹی مریم کا جس نے اپنی پارسائی کی حفاظت کی تو ہم نے اپنی طرف سے اس میں روح پھونک دی اور اس نے اپنے رب کی باتوں اور کتابوں کی تصدیق کی اور فرماں برداروں میں ہوئی۔(پ۲۸، التحریم:۱۲)
اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے گریبان میں دم کیا جس سے آپ حاملہ ہوئیں اور عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اسی لئے آپ کا لقب روح اللہ بھی ہے اور کلمۃ اللہ بھی، یعنی اللہ کا دم یا اللہ کا کلمہ۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے کچھ پڑھ کر حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر دم کیا جس سے یہ فیض دیا۔ اب بھی شفا وغیرہ کے لئے پڑھ کر دم ہی کرتے ہیں۔
(3) اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْــٴَـةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِۚ

فرمایا عیسیٰ نے کہ میں بناتا ہوں تمہارے لئے پرندے کی صورت پھر اس میں دم کرتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور کوڑھی اندھے کو اچھا کرتا ہوں اور مردے جلاتا ہوں اللہ کے حکم سے۔(پ3،اٰل عمرٰن:49)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام دم کرکے مردے زندہ کرتے تھے، کوڑھی اور اندھوں کو اچھا کرتے تھے، یہاں بھی دم سے ہی یہ فیض دیئے گئے۔

(4)وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ

اور پھونکا جائے گا صور میں تو بیہوش ہوجائیں گے وہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔(پ23،الزمر:68)

(5)يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾

جس دن پھونکا جاوے گا صور میں پس آؤ گے تم فوج در فوج۔(پ30،النبا:18)

معلوم ہوا قیامت کے دن صور میں پھونکا جاوے گا جس سے مردے زندہ ہوں گے غرضیکہ ابتداء،انتہاء اور بقاہمیشہ فیض دم سے ہوا اور ہوتا ہے او رہو گا اسی لئے آج بھی صوفیاء قرآن کریم پڑھ کر دم کرتے ہیں خود نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بیماروں پر قرآن شریف پڑھ کر دم فرماتے تھے کیونکہ جیسے پھولوں سے چھو کر ہوا میں خوشبو پیدا ہوجاتی ہے ایسے ہی جس زبان سے قرآن شریف پڑھا گیا ہو اس سے چھو کر جو ہوا آوے گی وہ شفادے گی،اسی طرح تبرکات سے شفاملتی ہے جیسا کہ اسی باب کے شروع میں آیات سے ثابت کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر ۱۰

سارے صحابہ برحق ہیں

قرآن کریم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حقانیت وصداقت کا اعلان فرمارہا ہے، فرماتا ہے:

(1)الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ

وہ بلند رتبہ کتاب(قرآن)شک کی جگہ نہیں اس میں۔(پ1،البقرۃ:1۔2)

اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ قرآن میں کوئی شک وتردد نہیں۔ شک کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو بھیجنے والا غلطی کرے یا لانے والا غلطی کرے یا جس کے پاس آیا ہو وہ غلطی کرے یا جنہوں نے اس سے سن کر لوگوں کو پہنچایا انہوں نے دیانت سے کام نہ لیا ہو۔ اگر ان چاروں درجوں میں کلام محفوظ ہے تو واقعی شک وشبہ کے لائق نہیں۔ قرآن شریف کا بھیجنے والا اللہ تعالیٰ،لانے والے حضرت جبریل علیہ السلام،لینے والے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور حضور سے لے کر ہم تک پہنچانے والے صحابہ کرام ہیں(رضی اللہ عنہم اجمعین)اگر قرآن شریف اللہ تعالیٰ، جبریل علیہ السلام، نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک تو محفوظ رہے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سچے نہ ہوں اوران کے ذریعہ قرآن ہم کو پہنچے تو یقینا قرآن میں شک پیدا ہوگیا کیونکہ فاسق کی کوئی بات قابل اعتبار نہیں ہوتی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا

اگر تمہارے پاس فاسق کوئی خبر لاوے تو تحقیق کر لیا کرو۔(پ26،الحجرات:6)

اب قرآن کا بھی اعتبار نہ رہے گا قرآن پر یقین جب ہی ہو سکتا ہے کہ صحابہ کرام کے تقویٰ و دیانت پر یقین ہو۔

(2) هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

قرآن ہدایت ہے ان متقیوں کو جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔(پ1،البقرۃ:2۔3)

یعنی اے کافرو! جن پرہیزگاروں یعنی جماعت صحابہ کو تم دیکھ رہے ہو انہیں

قرآن نے ہی ہدایت دی اور یہ لوگ قرآن ہی کی ہدایت سے ایسے اعلیٰ متقی بنے ہیں۔ قرآن کریم نے ہی ان کی کایاپلٹ دی اگر قرآن کا کمال دیکھنا ہو تو ان صحابہ کرام کا تقویٰ دیکھو۔ اس آیت میں قرآن نے صحابہ کرام کے ایمان و تقویٰ کو اپنی حقانیت کی دلیل بنایا اگر وہاں ایمان و تقویٰ نہ ہو تو قرآن کا دعویٰ بلا دلیل رہ گیا۔

(3) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾

اور وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ جنہوں نے رسول کو جگہ دی اور ان کی مدد کی وہ سچے مسلمان ہیں ان کے لئے بخشش ہے اور عزت کی روزی۔(پ10،الانفال:74)

اس آیت میں صحابہ کرام، مہاجرین اور انصار کا نام لے کر انہیں سچا مومن، متقی اور مغفور فرمایا گیا۔

(4) لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۸﴾

ان فقیر ہجرت والوں کے لئے جو اپنے گھروں اور مالوں سے نکالے گئے اللہ کا فضل اور اس کی رضا چاہتے ہیں اور اللہ و رسول کی مدد کرتے ہیں وہ ہی سچے ہیں۔(پ28،الحشر:8)

اس آیت میں تمام مہاجر صحابہ کو نام و پتہ بتا کر سچا کہا گیا ہے یعنی یہ ایمان میں سچے اور اقوال کے پکے ہیں۔

(5) وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ۫ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۹﴾

اور وہ جنہوں نے پہلے سے اس شہر اور ایمان میں گھر بنالیا دوست رکھتے ہیں انہیں جو ان کی طرف ہجرت کرکے آئے اور اپنے دلوں میں کوئی حاجت نہیں پاتے اس چیز کی جو دیئے گئے اور اپنی جان پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں بہت محتاجی ہو اور جو اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہ ہی کامیاب ہے۔(پ28،الحشر:9)

اس آیت میں انصار مدینہ کو نام لے کر پتہ بتا کر کامیاب فرمایا گیا۔ معلوم ہوا کہ سارے مہاجرین و انصار سچے اور کامیاب ہیں۔

(6) لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ

تم میں برابر نہیں وہ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ اور جہاد کیا وہ مرتبہ میں ان سے بڑے ہیں جنہوں نے بعد فتح خرچ اور جہاد کیا اور ان سب سے اللہ جنت کا وعدہ فرما چکا ہے۔(پ27،الحدید:10)

اس آیت نے بتایا کہ سارے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے رب تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمالیا ہے لیکن وہ خلفاء راشدین جو فتح مکہ سے پہلے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثار رہے وہ بہت درجے والے ہیں ان کے درجہ تک کسی کے وہم و گمان کی رسائی نہیں کیونکہ رب تعالیٰ نے ساری دنیا کو قلیل یعنی تھوڑا فرمایا اور اتنے بڑے عرش کو عظیم یعنی بڑا فرمایا لیکن ان خلفائے راشدین کے درجہ کو چھوٹا نہ کہا، بڑا نہ فرمایا بلکہ اعظم یعنی بہت ہی بڑا فرمایا۔

(7) وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿۱۷﴾ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾

اور دوزخ سے بہت دور رکھا جائے گا وہ سب سے بڑا پرہیز گار جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ ستھرا ہو اور کسی کا اس پر کچھ احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جاوے صرف اپنے رب کی رضا چاہتا ہے اور بے شک قریب ہے کہ وہ راضی ہوگا۔(پ30،اللیل:17۔21)

یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں نازل ہوئی جب آپ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھاری قیمت دے کر خریدا اور آزاد کیا، کفار نے حیرت سے کہا کہ شاید حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آپ پر کوئی احسان ہو گا جس کا بدلہ ادا کرنے کے لئے آپ نے اتنی بڑی قیمت سے خرید کر آزاد کیا۔ ان کفار کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی اس میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حسب ذیل خصوصی صفات بیان ہوئے:

ان کا دوزخ سے بہت دور رہنا، ان کا سب سے بڑا متقی ہونا یعنی اتقیٰ، ان کا بے مثل سخی ہونا، ان کے اعمال طیبہ طاہرہ کا ریا سے پاک ہونا خالص رب عزوجل کے لیے ہونا اور جنت میں انہیں رب تعالیٰ کی طرف سے ایسی نعمتیں ملنا جس سے وہ راضی ہو جاویں۔

لطیفہ: اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے لئے فرمایا **وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴿۵﴾** آپ کو آپ کا رب اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جاویں گے۔(الضحیٰ:۵) اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے فرمایا **وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾** عنقریب صدیق راضی ہو جاویں گے۔(اللیل:۲۱) معلوم ہوا کہ آپ کو نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے بہت ہی قرب ہے۔

(9) يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

اے نبی آپ کو اللہ اور آپ کی پیروی کرنے والے یہ مومن کافی ہیں۔(پ10،الانفال:64)

یہ آیت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایمان لانے پر نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ حقیقتاً آپ کو اللہ کافی ہے اور عالم اسباب میں عمر کافی ہیں۔

(10) وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

جو صحابہ ان نبی کے ساتھی ہیں وہ کافروں پر سخت، آپس میں نرم ہیں۔(پ26،الفتح:29)

(11) ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ

یہ جماعت صحابہ وہ ہیں جن کی مثال توریت وانجیل میں اس کھیت سے دی گئی ہے جس نے اپنا پٹھا نکالا...(یہاں تک کہ فرمایا) تاکہ ان سے کافروں کے دل جلیں۔(پ26،الفتح:29)

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تمہارے صحابہ کے نام کے ڈنکے ہم نے توریت وانجیل میں بجادیئے وہ تو میری ہری بھری کھیتی ہیں جنہیں دیکھ کر میں توخوش ہوتا ہوں اور میرے دشمن رافضی جلتے ہیں۔

لطیفہ: قرآن کریم نے بعض لوگوں پر صاف صاف فتویٰ کفر دیا ایک تو نبی کی توہین کرنے والے، اور دوسرے صحابہ کرام کے دشمن، صحابہ کرام کے دشمنوں پر رب تعالیٰ نے کفر کا فتویٰ دیا کسی اور سے نہ دلوایا۔

(12) ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ

ابو بکر دو میں کے دوسرے ہیں جبکہ وہ غار میں ہیں جب فرماتے تھے رسول اپنے ساتھی سے غم نہ کر۔(پ10،التوبۃ:40)

یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں اتری، اس میں اس واقعہ کا ذکر ہے کہ جب غار میں یار کو لے کر بیٹھے اور مار سے اپنے کو کٹوایا۔ اس آیت نے ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحابیت کا صراحۃً اعلان فرمایا، ان کی صحابیت ایسی ہی قطعی اور یقینی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کیونکہ جس قرآن نے توحید ورسالت کا صراحۃً اعلان کیا، اسی قرآن نے صدیق کی صحابیت کا ڈنکا بجایا لہذا ان کی صحابیت وعدالت پر ایمان لانا ایسا ہی ضروری ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لانا اور ان کی صحابیت کا منکر ایسا ہی بے دین ہے جیسے توحید ونبوت کا منکر۔

(13) وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴿۱۳۹﴾

نہ سست پڑو تم لوگ نہ غمگین ہو اور تم ہی بلند ہوا گر تم سچے مومن ہو۔(پ4،اٰل عمران:139)

(14) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۪ وَ لَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ

اللہ نے وعدہ دیا ان کو جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے ضرور انہیں زمین میں خلافت دے گا جیسی ان سے پہلوں کو دی اور ضرور جمادے گا ان کے لئے ان کا وہ دین جو ان کیلئے پسند کیا اور ضرور ان کے اگلے خوف کو امن سے بدل دے گا۔(پ18،النور:55)

ان دو آیتوں میں مسلمانوں سے دو شرطوں پر چند وعدے کئے گئے ہیں شرطیں ایمان اور تقویٰ کی ہیں ان سے وعدہ ہے۔(۱) بلندی (۲) خلافت دنیا (۳) خوف کے بعد امن بخشنا (۴) دین کو مضبوط کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو بلندی بھی دی زمین میں خلافت بھی بخشی، امن بھی عطا کیا اور ان کے زمانہ میں دین کو ایسا مضبوط فرمایا کہ آج اس مضبوطی کی وجہ سے اسلام قائم ہے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دونوں شرطیں بھی پوری کیں اور مومن بھی رہے اور پرہیز گار متقی بھی، ورنہ انہیں یہ چار نعمتیں نہ دی جاتیں۔

یہ چند آیات بطور نمونہ پیش کی گئیں ورنہ قرآن کریم کی بہت سی آیات ان حضرات کے فضائل میں ہیں اور کیوں نہ ہوں یہ حضرات نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے کمال کا مظہر ہیں جیسے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ذات رب تعالیٰ کے کمال کا نمونہ ہے جیسے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تنقیص رب تعالیٰ کے کمال کا انکار ہے ایسے ہی ان کا انکار حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے کمال کا انکار ہے استاد کا زور علمی شاگردوں کی

لیاقت سے معلوم ہوتا ہے۔ اگر صف اول کی نماز فاسد ہو تو پچھلی صفوں کی نماز درست نہیں ہو سکتی کیونکہ امام کو دیکھنے والی صف اول ہی ہے، اگر انجن کے پیچھے والا ڈبہ انجن سے کٹ کر رہ جائے تو پچھلے ڈبے کبھی سفر نہیں کر سکتے، وہ حضرات اسلام کی صف اول ہیں اور ہم آخری صفیں وہ گاڑی کا اگلا ڈبہ ہم پچھلے۔ اگر وہ ایمان سے رہ گئے تو ہم کیسے مومن ہو سکتے ہیں؟

اعتراض: ان آیتوں کے نزول کے وقت تو یہ سب مومن تھے مگر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کا حق چھین کر اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی میراث تقسیم نہ کرنے کی وجہ سے اسلام سے نکل گئے یہ آیات اسوقت کی ہیں بعد سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔

جواب: اس اعتراض کے چند جواب ہیں

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اگر خلفاء راشدین کا انجام اچھا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کے فضائل قرآن شریف میں بیان نہ فرماتا نیز رب تعالیٰ نے ان مذکورہ آیتوں میں خبر دی کہ یہ دوزخ سے بہت دور رہیں گے، ہم انہیں اتنا دیں گے کہ وہ راضی ہو جاویں گے ہم نے ان سب سے جنت کا وعدہ کر لیا۔ یہ باتیں انجام بخیر سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ اگر یہ حضرات ایمان سے پھر گئے ہوتے تو اہلبیت اطہار خصوصاً حضرت علی مرتضی رضی اللہ تعالیٰ عنہم ان کے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے خلیفہ رسول وہ ہو سکتا ہے جو مومن متقی ہو بلکہ جیسے حضرت علی مرتضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صفین میں جنگ کی اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کربلا میں جان دے دی مگر یزید کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دیا، اس وقت بھی وہ جنگ کرتے۔

تیسرے یہ کہ جیسے صدیق اکبر و فاروق اعظم و عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد ان کی خلافتیں میراث کے طور پر ان کی اولاد کو نہ ملیں بلکہ جس پر سب کا اتفاق ہو گیا وہ خلیفہ ہو گیا اسی طرح نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت میں نہ میراث تھی نہ کسی کی ملکیت بلکہ رائے عامہ پر ہی انتخاب ہوا

چوتھے یہ کہ پیغمبر کی میراث مال نہیں بلکہ علم ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ

اور وارث ہوئے سلیمان داؤد کے اور فرمایا کہ ہم کو پرندوں کی بولی کا علم دیا گیا۔(پ19، النمل:16)

دیکھو داؤد علیہ السلام کے بہت بیٹے تھے مگر وارث صرف حضرت سلیمان علیہ السلام ہوئے اور مال کے نہیں بلکہ علم کے وارث ہوئے اسی لئے نبی کی بیویاں بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی میراث نہ پا سکیں اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اپنے زمانہ خلافت میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی میراث تقسیم نہ فرمائی۔

اعتراض: تم کہتے ہو کہ سارے صحابہ متقی پرہیز گار ہیں حالانکہ قرآن شریف انہیں فاسق کہہ رہا ہے۔ فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا

اے مومنو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کسی قسم کی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو۔

ولید بن عقبہ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آکر خبر دی تھی کہ فلاں قوم نے زکوۃ نہ دی۔ اس پر یہ آیت اتری جس میں ولید صحابی کو فاسق کہا گیا اور فاسق متقی نہیں ہو سکتا۔

جواب: اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ یہاں ان کو فاسق نہ کہا گیا بلکہ ایک قانون بیان کیا گیا کہ آئندہ اگر کوئی فاسق خبر لائے تو تحقیقات کر لیا کرو۔
دوسرے یہ کہ اس خاص وقت میں ان کو فاسق گنہگار کہا گیا صحابی سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے وہ
معصوم نہیں ہاں اس پر قائم نہیں رہتے توبہ کی توفیق مل جاتی ہے جیسے حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زنا ہو گیا مگر بعد میں ایسی توبہ نصیب ہوئی کہ سبحان اللہ!

مسئلہ نمبر ۱۱

عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ ہوئے

سارے مسلمانوں کا عقیدہ تھا اور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا اور اپنی قدرت کا نمونہ دکھایا مگر اب موجودہ زمانہ میں قادیانیوں نے اس کا انکار کیا، ان کی دیکھا دیکھی بعض بھولے جاہل مسلمان بھی اس ظاہری مسئلہ کے منکر ہو گئے اور کہنے لگے کہ قرآن سے یہ ثابت نہیں حالانکہ قرآن شریف اس کا بہت زور شور سے اعلان فرما رہا ہے، رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(1) اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۵۹﴾ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۶۰﴾

بے شک عیسیٰ کی کہاوت اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے کہ اسے مٹی سے بنایا پھر اس سے فرمایا کہ ہو جا وہ فوراً ہو جاتا ہے یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے تو تم شک والوں میں سے نہ ہو۔ (پ۳، اٰل عمرٰن:۵۹۔۶۰)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو آدم علیہ السلام کی پیدائش سے تشبیہ دی کہ جیسے آدم علیہ السلام بغیر نطفے کے پیدا ہوئے ایسے ہی آپ بھی۔ جب آدم علیہ السلام خدا کے بیٹے نہ ہوئے تو اے عیسائیو! عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے کب ہو سکتے ہیں؟ اگر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش عام انسانوں کی طرح ہوتی تو انہیں آدم علیہ السلام سے تشبیہ نہ دی جاتی۔

(2) قَالَتۡ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّ لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ
قَالَ کَذٰلِکِ ۚ قَالَ رَبُّکِ ہُوَ عَلَیَّ ہَیِّنٌ ۚ وَ لِنَجۡعَلَہٗۤ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَ رَحۡمَۃً مِّنَّا ۚ

مریم نے جبریل سے کہا کہ میرے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے مجھے تو کسی مرد نے چھوا بھی نہیں
فرمایا ایسے ہی ہو گا تمہارے رب نے فرمایا کہ یہ کام مجھ پر آسان ہے اور تاکہ بنائیں ہم اس بچہ کو لوگوں کے لئے نشان اور اپنی طرف سے رحمت۔ (پ16، مریم:20)(پ16، مریم:21)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بیٹا ملنے کی خبر پر حیرت کی کہ بغیر مرد کے بیٹا کیسے پیدا ہو گا اور انہیں رب کی طرف سے جواب ملا کہ اس بچہ سے رب تعالیٰ کی قدرت کا اظہار مقصود ہے لہذا ایسے ہی بغیر باپ کے ہو گا، اگر آپ کی پیدائش معمول کے مطابق تھی تو تعجب کے کیا معنی اور رب تعالیٰ کی نشانی کیسی؟

(3)فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهٗ ؕ قَالُوۡا يٰمَرۡيَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَيۡـئًـا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾

تو انہیں گود میں اپنی قوم کے پاس لائیں بولے اے مریم تو نے بہت بری بات کی۔(پ16، مریم:27)

معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش پر لوگوں نے حضرت مریم کو بہتان لگایا اگر آپ خاوند والی ہوتیں تو اس بہتان کی کیا وجہ ہوتی۔

(4)فَاَشَارَتۡ اِلَيۡهِ ؕ قَالُوۡا كَيۡفَ نُكَلِّمُ مَنۡ كَانَ فِى الۡمَهۡدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ؕ

پھر مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کر دیا وہ بولے ہم کیسے بات کریں اس سے جو پالنے میں بچہ ہے، بچہ نے فرمایا میں اللہ کا بندہ ہوں ۔(پ16، مریم:29-30)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں ہی گویائی دی اور آپ علیہ السلام نے خود اپنی ماں کی پاکدامنی اور رب تعالیٰ کی قدرت بیان فرمائی اگر آپ کی پیدائش باپ سے ہے تو اس معجزے اور گواہی کی ضرورت نہ تھی۔

(5)اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلۡقٰٮهَاۤ اِلٰى مَرۡيَمَ وَرُوۡحٌ مِّنۡهُ

عیسیٰ مریم کا بیٹا اللہ کا رسول ہی ہے اور اس کا ایک کلمہ کہ مریم کی طرف بھیجا اور رب کی طرف سے ایک روح۔(پ6، النسآء:171)

اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کو مریم کا بیٹا فرمایا حالانکہ اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے نہ کہ ماں کی طرف آپ کا اگر والد ہوتا تو آپ کی نسبت اسی کی طرف ہونی چاہیے تھی نیز قرآن کریم نے کسی عورت کا نام نہ لیا اور نہ کسی کی پیدائش کا واقعہ اس قدر تفصیل سے بیان فرمایا چونکہ آپ کی پیدائش عجیب طرح صرف ماں سے ہے لہذا ان بی بی کا نام بھی لیا اور واقعہ پیدائش پورے ایک رکوع میں بیان فرمایا، نیز انہیں کلمۃ اللہ اور اللہ کی روح فرمایا، معلوم ہوا کہ آپ کی پیدائش ایک کلمہ سے ہے اور آپ کی روح مافوق الاسباب آئی ہے۔

(6)وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الۡمَهۡدِ وَكَهۡلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۴۶﴾

عیسیٰ کلام کریں گے لوگوں سے پالنے سے اور پکی عمر میں اور خاص نیکوں میں ہوں گے۔(پ3، اٰل عمرٰن:46)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت بچپن اور بڑھاپے میں کلام کرنا ہے بچپن میں کلام کرنا تو اس لئے معجزہ ہے کہ بچے اتنی عمر میں بولا نہیں کرتے

اور بڑھاپے میں کلام کرنا اس لئے معجزہ ہے کہ آپ بڑھاپے سے پہلے آسمان پر گئے اور وہاں سے آکر بوڑھے ہو کر کلام کریں گے۔

ان آیات مذکورہ بالا سے روز روشن کی طرح آپکا بغیر باپ کے پیدا ہونا ظاہر ہوا۔

اعتراض: اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ انسان بلکہ سارے حیوانات کو نطفے سے پیدا فرمادے اور قانون کی مخالفت ناممکن ہے لہذا عیسیٰ علیہ السلام کا خلاف قانون پیدا ہونا غیر ممکن ہے۔ رب تعالیٰ صاف فرمارہا ہے:

(1)اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ ۖ نَّبۡتَلِيۡهِ فَجَعَلۡنٰهُ سَمِيۡعًۢا بَصِيۡرًا ﴿۲﴾

بے شک ہم نے پیدا کیا انسان کو ماں باپ کے مخلوط نطفے سے کہ ہم اسے آزمائیں پس ہم نے اسے سننے دیکھنے والا بنا دیا۔(پ29، الدہر:2)

(2)وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ مِنَ الۡمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهۡرًا ؕ

اور وہی ہے جس نے پانی سے بنایا آدمی پھر اس کے رشتے اور سسرال مقرر کر دی۔(پ19،الفرقان:54)

(3)وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَيۡءٍ حَيٍّ ۖ اَفَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۰﴾

اور ہم نے ہر جاندار چیز پانی سے بنائی تو کیا وہ ایمان نہ لائیں گے۔(پ17،الانبیآء:30)

(4)فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا ۚ

اور تم ہر گز اللہ کے قانون کو بدلتا ہوا نہ پاؤ گے۔(پ22،فاطر:43)

(5)وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحۡوِيۡلًا ﴿۷۷﴾

اور تم ہمارا قانون بدلتا ہوا نہ پاؤ گے۔(پ15،بنی اسرآءیل:77)

ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ تمام انسان اور حیوانات کی پیدائش کا قانون یہ ہے کہ اس کی پیدائش نطفے سے ہو۔ دوسرے یہ کہ خدا کے قانون میں تبدیلی ناممکن ہے اگر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بغیر باپ مانی جائے تو ان آیات کے خلاف ہو گا۔

جواب:اس اعتراض کے دو جواب ہیں ایک الزامی، دوسرا تحقیقی۔

الزامی جواب تو یہ ہے کہ آدم علیہ السلام بغیر نطفے کے پیدا ہوئے ہمارے سروں میں جوئیں، چارپائی میں کھٹمل، پیٹ اور زخم میں کیڑے بغیر نطفے کے دن رات پیدا ہوتے ہیں، برسات میں کیڑے، پھل میں جانور بغیر نطفے کے پیدا ہوتے ہیں بتاؤ یہ قانون کے خلاف کیوں ہوا۔

تحقیقی جواب یہ ہے کہ معجزات اور کرامات اولیاء خود قانون الٰہی ہیں یعنی رب تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ نبی اور ولی پر حیرت انگیز باتیں ظاہر ہوں تو آپ کا بغیر باپ کے پیدا ہونا اس معجزے کے قانون کے ماتحت ہے تمہاری پیش کردہ آیات کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق خدا کے قانون میں تبدیلی نہیں کر سکتی اگر خالق خود کرے تو وہ قادر ہے۔ انسان کی پیدائش نطفے سے ہونا قانون ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر نطفے کے ہونا قدرت ہے ہم قانون کو بھی مانتے ہیں اور قدرت کو بھی، رب تعالیٰ قانون کا پابند نہیں ہم پابند ہیں۔

دیکھو قانون یہ ہے کہ آگ جلا دے مگر ابراہیم علیہ السلام کو نہ جلایا یہ قدرت ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلۡنَا يٰنَارُ كُوۡنِيۡ بَرۡدًا وَّسَلٰمًا عَلٰۤى اِبۡرٰهِيۡمَ ﴿۶۹﴾

ہم نے کہا کہ اے آگ ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا۔(پ17،الانبیآء:69)

اسی طرح اور بہت سارے معجزات کا حال ہے اللہ تعالیٰ قادر و قیوم ہے جو چاہے کرے اس کی قدرتوں کا انکار کرنا اپنے ایمان سے ہاتھ دھونا ہے۔ رب تعالیٰ ہم سب کو اس راستہ پر چلائے جو اس کے نیک بندوں کا ہے اور اس زمانہ کی ہواؤں سے ہمارا ایمان محفوظ رکھے۔ آمین آمین یارب العالمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین آمین برحمتہ وھو ارحم الرحمین.

ناچیز احمد یار خاں، ۵ ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ، یوم دوشنبہ مبارکہ

"یہ کتاب ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۷۱ھ، دوشنبہ کو شروع ہو کر ۵ ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ، دوشنبہ کو یعنی ایک ماہ بارہ دن میں اختتام کو پہنچی۔ جو کوئی اس سے فائدہ اٹھائے وہ مجھ گنہگار کے لئے حسن خاتمہ کی دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے صدقہ سے مجھے کلمہ طیبہ پر خاتمہ نصیب کرے اور مجھ گنہگار کی مغفرت فرمادے، اسی لالچ میں یہ محنت کی ہے۔"

احمد یار خاں

آخر میں ایک مضمون شامل کیا جارہاہے۔

پہلا مضمون ابو الصالح محمد فیض احمد اویسی کا ہے جس سے تفسیر قرآن میں اہل سنت کے امام اعلیٰ حضرت کی وسعت علمی کی نگارشات ہیں۔

امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ اور فن تفسیر

تالیف: علامہ مفتی محمد فیض احمد اویسی مدظلہ العالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم ط

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت قدس سرہ ان ہستیوں میں سے ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا!

افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علیٰ نور من ربہ

یہ شرح صدر ہی تو تھا کہ قلیل عرصہ میں جملہ علوم وفنون سے فراغت پالی ورنہ عقل کب باور کرسکتی ہے کہ چودہ سال کی عمر میں علوم وفنون ازبر ہوں

ایں سعادت بزور بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

(یہ سعادت بزور بازو نہیں ملتی جب تک کہ بخشنے والا خداوند تعالیٰ نہ عطا کرے)

اور یہ علوم وفنون صرف ازبر نہ تھے بلکہ ہر فن پر مبسوط تصانیف موجود ہیں اور وہ بھی کسی سے مستعار نہیں بلکہ قلم رضوی کے اپنے آب دار موتی ہیں اور تحقیق کے ایسے بہتے ہوئے بحر ذخار کو دیکھ کر بڑے بڑے محققین انگشت بدنداں ہو جاتے ہیں۔ آپ کو قلم کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔

تجربہ اور شواہد بتاتے ہیں کہ جس بندہ خدا کو جس فن کی مہارت نصیب ہو وہ دوسرے فن میں ہزاروں ٹھوکریں کھاتا ہے مثلاً امام بخاری قدس سرہ کو دیکھیئے کہ دنیائے اسلام نے فن حدیث کا انہیں ایسا امام مانا ہے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی لیکن فقہاء کے کے استنباط اور تاریخی حیثیت سے آپ کو وہ مرتبہ حاصل نہیں جو فن حدیث میں ہے لیکن اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ کی یہ خصوصیت ہے کہ فن کے ماہرین نے مانا ہے کہ آپ ہر فن میں

مہارت تامہ رکھتے ہیں چناچہ شاعروں نے آپ کو امام اشعراء سمجھا،فقہاء نے آپ کو وقت کا ابو حنیفہ مانا، محدثین نے امیر الحدیث وغیرہ وغیرہ اس لئے خود اعلیٰ ٰی حضرت قدس سرہ نے اپنے لئے فرمایا اور بجا فرمایا۔

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم

جس سمت آ گئے ہو سکے بٹھا دیئے ہیں

اس وقت فقیر کا موضوع سخن فن تفسیر ہے واضح کروں گا کہ آپ اس فن کے بھی مسلم امام ہیں اگرچہ اعلٰی حضرت قدس سرہ نے پورے قرآن پاک کی کوئی تفسیر نہیں لکھی لیکن حق یہ ہے کہ اگر آپ کی تصانیف کا بالاستیعاب مطالعہ کرکے تفسیری عبارات جمع کئے جائیں تو ایک مبسوط تفسیر معرض وجود میں آسکتی ہے چنانچہ فقیر اویسی غفرلہ نے اس کام کا آغاز کر رکھا ہے اللہ تعالٰی اس کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

شرائط فن تفسیر

امام جلال الملۃ والدین حضرت علامہ سیوطی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ نے اتقان میں لکھا ہے کہ مفسّر اس وقت تفسیر قرآن لکھنے اور بیان کرنے کا حق رکھتا ہے جب چودہ فنون کی مہارت حاصل کرلے۔ ورنہ تفسیر نہیں تحریف قرآن کا مرتکب ہو گا۔ اس قاعدہ پر اعلٰی حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ، نہ صرف ان چودہ فنون کے ماہر ہیں بلکہ پچاس فنون پر کامل دسترس رکھتے ہیں بلکہ بعض فنون پر آپ کی درجنوں تصانیف ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ کو مستقل طور پر تفسیر لکھنے کا موقعہ نہیں ملا لیکن آپ کی تصانیف سے قرآنی ابحاث کی ایک ضخیم تفسیر تیار ہو سکتی ہے اور فقیر اویسی نے اس کے اکثر اجزاء کو جمع کیا ہوا ہے بنام تفسیر امام احمد رضا،، خدا کرے کوئی بندہ اس کی اشاعت کیلئے کمربستہ ہو جائے۔ (آمین)

علاوہ ازیں تفاسیر پر آپ کی عربی حواشی کے اسماء ملتے ہیں مثلاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

الزلال الانقی من بحر سفینۃ اتقی

حاشیہ تفسیر بیضاوی شریف

حاشیہ عنایت القاضی شرح تفسیر بیضاوی

حاشیہ معالم التنزیل

حاشیہ الاتقان فی علوم القرآن سیوطی

حاشیہ الدر المنثور (سیوطی)

حاشیہ تفسیر خازن

علاوہ ازیں بعض آیات اور سورتوں پر آپ کی متعدد تصانیف موضوع تفسیر پر ملتی ہیں جنہیں ملک العلماء علامہ ظفر الدین بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے جمع فرمایا ہے چند ایک کے اسماء درج ہیں!

انوار العلم فی معنٰی میعاد واستجب لکم فارسی زبان میں ہے 1327ء تک غیر مطبوع تھی اس میں اعلٰی حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ نے تحقیق فرمائی ہے کہ اجابت دعا کے کیا کیا معنٰی ہے۔ اثر ظاہر نہ ہونا دیکھ کر بے دل ہونا حماقت ہے۔

ا**الصمام علی مشك فی آیة علوم الارحام** اس میں اعلٰی حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ نے پادریوں کا رد فرمایا ہے اردو زبان میں طبع شدہ موجود ہے۔

۔**انباء الحی ان کتاب المصون تبیان لکل شئی عربی**، اردو زبان میں ہے اس میں اعلٰی حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ نے ثابت فرمایا ہے کہ قرآن مجید اشیائے عالم کی ہر چیز کا مفصل بیان ہے۔

النفحة الفائحه من مسلك سورة الفاتحه اردو زبان میں ہے اس میں اعلٰی حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ نے سورۃ فاتحہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضائل کو ثابت فرمایا ہے۔

نائل الراح فی فرق الریح والریاح فارسی زبان میں ہے۔

مذکورہ رسائل صرف تفسیر سے متعلق ہیں۔ بعض اوقات کسی مسئلہ کے متعلق استفسار پر آپ نے تفسیری نقطہ نگاہ سے حل فرمایا دراصل آپ کو عالم دنیا سے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے فتاوٰی کے جوابات سے فرصت کم ملی ورنہ اگر اس طرف توجّہ دیتے تو تفسیر کا ایک جز ہزاروں صفحات پر پھیلتا۔ صرف بسم اللہ شریف کی تقریر پر مختصر سے وقت میں آپ کا ایک طویل مضمون موجود ہے جو آپ نے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موقع پر بریلی شریف میں بیان فرمایا تھا جو سوانح اعلٰی حضرت میں صفحہ 98 سے شروع ہو کر صفحہ 112 تک ختم ہوتا ہے۔ اسی طرح پھر دوسرا وعظ صفحہ 112 سے شروع ہو کر صفحہ 131 تک ختم ہوا یہ بھی تقریر کے رنگ میں ہوا جو تحریر کے میدان میں کوسوں دور سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اتنے صفحات کا مضمون بیان کر جانا کسی مرد میدان کا کام ہے اور وہ بھی مفسّرانہ رنگ میں اور پھر تفسیر سورہ والضحٰی لکھی تو سینکڑوں صفحات پھیلا دیئے۔ جس کی ایک ایک سطر کئی تفاسیر کے مجموعے کو دامن میں لئے ہوئے ہے۔

آپ کے تلامذہ کو رشک ہو گا کہ ایسے بحر بے پایاں کے قلم سے جس طرح فقہ اور حدیث اور دیگر فنون کے دریا بہائے گئے ہیں کچھ تفسیری نوٹ بھی آپ کی یادگار ہوں تو زہے قسمت اگرچہ اجمالی طور پر ہی سہی، چناچہ صدر الشریعۃ حضرت مولانا حکیم امجد علی صاحب مصنف بہار شریعت قدس سرہ کو

اللہ تعالیٰ ی اپنی خاص رحمتوں سے نوازے، انہوں نے اہلسنت پر احسان عظیم فرمایا کہ اعلیٰ ی حضرت قدس سرہ کی عدیم الفرصتی کے باوجود قرآن مجید کا ترجمہ لکھوا ہی لیا چناچہ سوانح نگار حضرات قرآن مجید کے ترجمے کے متعلق یوں لکھتے ہیں کہ صدر الشریعۃ حضرت مولانا حکیم امجد علی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ نے ترجمہ قرآن کی ضرورت پیش کرتے ہوئے اعلیٰ ی حضرت سے گزارش کی آپ نے وعدہ تو فرمالیا لیکن دوسرے مشاغل دینیہ کثیرہ کے ہجوم کے باعث تاخیر ہوتی رہی، جب حضرت صدر الشریعۃ کی جانب سے اصرار بڑھا تو اعلیٰ ی حضرت نے فرمایا

چوں کہ ترجمے کے لیے میرے پاس مستقل وقت نہیں ہے اس لئے آپ رات کو سونے کے وقت یا دن میں قیلولہ کے وقت کے وقت آجایا کریں۔ چنانچہ حضرت صدر الشریعۃ ایک دن قلم ودوات لے کر حاضر ہوگئے اور یہ دینی کام بھی شروع ہوگیا۔ ترجمہ کا طریقہ یہ تھا کہ اعلٰی حضرت زبانی طور پر ترجمہ آیۃ کریمہ کا فرماتے جاتے اور حضرت صدر الشریعۃ لکھتے جاتے لیکن یہ ترجمہ اس طرح پر نہیں تھا کہ آپ پہلے کتب تفسیر وحدیث ولغت کو ملاحظہ فرماتے اور آیات کو سوچتے پھر ترجمہ بیان فرماتے قرآن مجید کا فی البدیہہ برجستہ ترجمہ زبانی طور پر اس طرح بولتے جاتے تھے جیسے کوئی پختہ یاداشت یاداشت کا حافظ اپنی قوّت حافظ پر بغیر زور ڈالے قرآن شریف پڑھتا چلا جاتا ہے۔ علمائے کرام جب دوسری تفاسیر سے تقابل کرتے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ اعلٰی حضرت کا یہ برجستہ فی البدیہہ ترجمہ تفاسیر معتبرہ کے بالکل عین مطابق ہے، الغرض اسی قلیل وقت میں ترجمہ کا کام ہوتا رہا پھر وہ مباراک ساعت بھی آئی کہ قرآن مجید کا ترجمہ ختم ہوگیا اور حضرت صدر الشریعت کی کوشش بلیغ کی بدولت سنّیت کو کنزالایمان کی دولت عظمٰی نصیب ہوئی۔(فجزاء اللہ تعالٰی عنا وعن جمیع اہل السنۃ جزاء کثیر اواجرا جزیلا)

حضرت محمد کچھوچھوی سیّد محمد صاحب رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ فرماتے ہیں کہ اعلٰی حضرت کے علم قرآن کا اندازہ اس اردو ترجمہ سے کیجیئے جو اکثر گھروں میں موجود ہے اور جس کو کوئی مثال سابق نہ عربی زبان میں ہے نہ فارسی میں ہے اور نہ اردو میں اور جس کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر ایسا ہے کہ دوسرا لفظ اس جگہ لایا نہیں جاسکتا جو یہ بظاہر ترجمہ ہے مگر در حقیقت وہ قرآن مجید کی تفسیر ہے اور اردو زبان میں روح قرآن ہے بلکہ فقیر اویسی کا ذوق یوں گواہی دیتا ہے۔

ہست قرآن بزبان اردوی

ہمچوں مثنوی بزبان پہلوی

اس ترجمہ کی شرح میں حضرت صدر الافاضل استاذ العلماء مولانا نعیم الدین علیہ الرحمۃ حاشیہ پر فرماتے ہیں کہ دوران شرح میں ایسا کئی بار ہوا کہ اعلٰی حضرت کے استعمال کردہ لفظ کے مقام استنباط کی تلاش میں دن پر دن گذرے اور رات پر رات کٹتی رہی اور بالآخر ماخذ ملا تو ترجمہ کا لفظ اٹل ہی نکلا اعلٰی حضرت خود حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالٰی کے فارسی ترجمہ کو سراہا کرتے تھے۔ لیکن اگر حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ اردو زبان کے اس ترجمے کو پاتے تو فرما ہی دیتے کہ

ترجمہ قرآن شئ دیگر است وعلم القرآن شئ دیگر ست

۔۔۔۔۔۔۔علمائے دیوبند نہ صرف حریف بلکہ وہ آپ کو ہر معاملے میں ترچھی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن وہ بھی اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے کہ واقعی اعلٰی حضرت کا قرآن مجید کا ترجمہ بالکل صحیح اور درست ہے۔اور آپ کے ترجمے کے مقابلے میں موجود دور کے تمام اردو تراجم کو دیکھا جائے تو ان میں سینکڑوں غلطیاں ہیں اس لئے محققین نے اس کو دیکھ کر ذیل کی آرا قائم فرمائی ہیں۔

ترجمہ اعلٰی حضرت تفاسیر معتبرہ قدیمہ کے مطابق ہے۔

اپنی تفویض کے مسلک اسلم کا عکس ہے۔

اصحاب تاویل کے مذہب سالم کا موید ہے۔

زبان کی روانی اور سلامت میں بے مثل ہے۔

عوامی لغات و بازاری زبان سے یکسر پاک ہے۔

قرآن پاک کے اصل منشاء مراد کو بتایا ہے۔

آیات ربّانی کے انداز خطاب کو پہنچا ہے۔

قرآن کے مخصوص محاوروں کی نشاندہی کرتا ہے۔

قادر مطلق کی روائے عزت وجلال میں نقص وعیب کا دھبہ لگانے والوں کیلئے تیغ بران ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی عظمت وحرمت کا محافظ ونگہبان ہے۔

عام مسلمین کیلئے بامحاورہ اردو میں سادہ ترجمہ ہے۔

لیکن علماء کرام ومشائخ عظام کیلئے معرفت کا امنڈتا ہوا سمندر ہے۔

بس اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ قرآن حکیم قادر مطلق جل جلالہ کا مقدس کلام ہے اور کنز الایمان اس کا مہذب ترجمان ہے۔

فقیر نے جہاں بھی آپ کی تصانیف میں تحقیق مفسرانہ دیکھی تو رازی وغزالی رحمۃ اللہ تعالٰی علیہما کے قلم سے آفرین وتحسین سنی اختصار کے پیش نظر چند ایک نظائر مشتے نمونہ خروار ملاحظہ ہوں جو آپ کی تصنیف سے اخذ کئے گئے ہیں۔

پیشانی کا داغ

سائل نے صرف اتنا استفسار کیا کہ بعض نمازیوں کو بہ کثرت نماز کے نام یا پیشانی پر جو سیاہ داغ ہو جاتا ہے اس سے نمازی کو قبر و حشر میں خداوند کریم جل جلالہ کی پاک رحمت کا حصہ ملتا ہے یا نہیں اور زید کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کے دل میں بغض کا سیاہ داغ ہوتا ہے اس کی شامت اس کی ناک یا پیشانی پر کالا داغ ہوتا ہے، یہ قول زید کا باطل ہے یا نہیں اس کے جواب میں اعلٰی حضرت قدس سرہ کے قلم کو جنبش آئی تو چھ صفحات مفسرانہ حیثیت سے لکھے اور ثابت فرمایا کہ اس نشانی کے متعلق چار قول ماثور ہیں اور ہر ایک کا حکم جدا جدا اور آیت سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود کا ایسا مفہوم ادا فرمایا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ان اوہام کا ازالہ فرمایا جو پیشانی کے داغ کو سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود میں سمجھتے ہیں۔

یہ مضمون سوانح احمد رضا میں چند صفحات پر پھیلا ہوا ہے جو نہایت قابل مطالعہ ہے اور تمام تحقیق تفاسیر معتبرہ کے حوالہ جات سے مزین ہے۔

آیت میثاق

واذ اخذ اللہ میثاق النبیین الخ سے حضور اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت مطلقہ پر گفتگو فرماتے ہوئے آخر میں تحریر فرمایا اقول وباللہ التوفیق پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس مضمون کو قرآن کریم نے کس قدر مہتم بالشان ٹھرایا اور طرح طرح سے موکد فرمایا!

اوّلا۔۔۔انبیاء علیہم السلام معصومین ہیں زنہار حکم الٰہی کے خلاف ان سے کوئی کام صادر نہیں ہوتا کہ رب تعالٰی بہ طریق امر انہیں فرماتا کہ اگر وہ نبی تمہارے پاس آئے اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا مگر اس پر اکتفاء نہ فرمایا بلکہ ان سے عہد وپیمان لیا یہ عہد عہد است بربکم کا دوسرا پیمان تھا جیسے کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تاکہ ظاہر ہو کہ تمام ماسوائے اللہ پر پہلا فرض ربوبیّت الٰہیہ کا اذعان ہے پھر اس کے برابر رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وبارک وشرف ومجل وعظم)

ثانیا۔۔۔اس عہد کو لام قسم سے موکد فرمایا لتومنن بہ التنصرنہ جس طرح نوابوں سے بیعت سلاطین لی جاتی ہے۔امام سبکی رحمۃ اللہ تعالٰ ی علیہ فرماتے ہیں۔

مسئلہ۔۔۔بیعت اس آیت سے ماخوذ ہوئی ہے۔

ثالثاً۔۔۔نون تاکید

رابعاً۔۔۔وہ بھی ثقیلہ لاکر ثقل تاکید اور دوبالا فرمایا۔

خامساً۔۔۔یہ کمال اہتمام ملاحظہ کیجیے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام ابھی جواب نہ دینے پائیں کہ خود ہی تقدیم فرما کر پوچھتے ہیں اقررتم کیا اس امر پر اقرار لاتے ہیں یعنی کمال وتعجیل وتسجیل مقصود ہے۔

سادساً۔۔۔اس قدر پر بھی بس نہ فرمائی بلکہ ارشاد فرمایاواخذتم علیٰ ذالکم اصری خالی اقرار ہی نہیں بلکہ اس پر میرا بھاری ذمّہ لو۔

سابعاً۔۔۔علیہ یا علی ھذا کی جگہ علٰی ذالکم فرمایا کہ بعد اشارت عظمت ہو۔ثامناً۔۔۔اور ترقی ہوئی کہ فاشھدوا ایک دوسرے پر گواہ ہو جائے۔حالانکہ معاذ اللہ اقرار کرکے مکر جانا ان پاک مقدّس جنابوں سے معقول نہ تھا۔

تاسعًا۔۔۔کمال یہ ہے کہ صرف ان کی گواہی پر اکتفاء نہ ہوا بلکہ فرمایاانا معکم من الشاھدین میں خود بھی تمھارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔

عاشراً۔۔۔سب سے زیادہ نہایت کار یہ ہے کہ اس عظیم جلیل تاکیدوں کے بعد باآنکہ انبیاء علیہم السلام کو عصمت عطا فرمائی یہ سخت شدید تہدید بھی فرمادی گئی کہ فمن تولٰی بعد ذالک فاولئک ھم الفٰسقون اب جو اس اقرار سے پھرے گا فاسق ٹھہرے گا

اللہ اللہ یہ وہی اعتنائے تام واہتمام تمام ہے جو باری تعالیٰ کو اپنی توحید کے بارے میں منظور ہوا کہ ملائکہ معصومین کے حق میں بیان فرماتا ہے **ومن یقل منھم انی الہ من دونہ فذالك نجزیہ جھنم كذالك نجزی الظالمین**، جو ان میں سے کہے گا کہ میں اللہ کے سوا معبود ہوں اس کو جہنم کی سزادیں گے ہم ایسے ہی سزا دیتے ہیں ستم گروں کو گویا اشارہ فرماتے ہیں

جس طرح ہمیں ایمان کے جز اول لا الہ الا اللہ کا اہتمام ہے یوں ہی جز دوم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اعتنائے تام ہے کہ میں تمام جہانوں کا خدا کہ ملائکہ مقربین بھی میری بندگی سے سر نہیں پھیر سکتے اور میرا محبوب سارے عالم کا رسول ومقتداء کہ انبیائے مرسلین بھی اس کی بیعت وخدمت کے محیط دائرہ میں داخل ہوئے اور اس سے قبل اس آیۃ کا تبصرہ کئی صفحات پر فرمایا تبصرہ کرکے پھر معتبرہ تفاسیر اور محققین علمائے کرام کی تصانیف کے خلاصہ کو دریا کوزہ کی مثالی قائم فرمائی۔

کلی علم غیب

اور یہ صرف اعلٰی حضرت رحمۃ اللہ تعالٰی علیہ کا حصہ تھا کہ جب اعدائے دین نے شان نبوت ولایت پر ہاتھ ڈالا تو اعلٰی حضرت کا قلم ڈھال بنا اور مذہب مہذب اہل سنت کے جمیع مسائل کو قرآنی اصول کے مطابق ڈھالنے کی نہ صرف کوشش کی بلکہ حقیقت کو نصف النہار سے زیادہ آشکارا فرمایا چنانچہ علم غیب کلی اہل سنت اور مخالفین کے مابین نزاع کا ایک اہم مسئلہ ہے اعلٰی حضرت قدس سرہ جب گویا ہوئے تو جلال الملت والدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بھی ساتھ لیا۔

چنانچہ اعلٰی حضرت قدس سرہ نے علم غیب کلی کا دعوٰی یوں تحریر فرمایا: بے شک حضرت عزت وعظمت نے اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام اوّلین وآخرین کا علم عطا فرمایا مشرق تا مغرب عرش تا فرش سب انہیں دکھایا ملکوت السموت والارض کا شاہد بنایا روز اوّل سے روز آخرت یعنی روز قیامت تک کے سب ماکان ومایکون انہیں بتائے اشائے مذکورہ سے کوئی ذرّہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم سے باہر نہ رہا، علم حبیب کریم علیہ

افضل الصلواۃ التسلیم ان سب کو محیط ہوانہ صرف اجمالاً بلکہ ہر صغیر و کبیر ہر رطب و یابس جو پتہ گر تا ہے زمین کی اندھیروں میں جو دانہ کہیں پڑا ہے سب کو جدا جدا تفصیلاً جان لیا الحمدللہ حمداً کثیر ابلکہ یہ جو کچھ بیان ہوا ہر گز ہر گز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پورا علم نہیں صلی اللہ تعالیٰ ی علیہ وسلم و علیٰ وآلہ واصحابہ اجمعین وبارک وکرم وسلم بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم سے ایک چھوٹا حصّہ ہے ہنوز احاطہ علم محمدی میں وہ ہزار در ہزار بے حد و بے کنار سمندر لہرا رہے ہیں جن کی حقیقت وہ جانیں یا ان کا عطا کرنے والا مالک و مولا جل وعلا (والحمدللہ العلی الاعلیٰ ی) کتب حدیث و تصانیف علمائے قدیم وحدیث میں اس کے دلائل کا بہت شافی و بیان وانی ہے اس کے بعد آپ علم غیب کے مسئلہ کو قرآنی آیات سے ثابت فرما کر آخر میں اصول قرآنی پو بحث فرماتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

عبارت اعلیٰ حضرت قدس سرہ

اور اصول میں مبرہن ہو چکا کہ نکرہ حیز نفی میں مفید عموم ہے اور لفظ کل تو ایسا عام ہے کہ کبھی خاص ہو کر مستعمل ہی نہیں ہوتا اور عام افادہ استغراق میں قطعی ہے اور نصوص ہمیشہ ظاہر پر محمول رہیں گے بے دلیل شرعی تخصیص و تاویل کی اجازت نہیں ورنہ شریعت سے مان اٹھ جائے نہ حدیث آحاد اگرچہ کیسی اعلیٰ درجہ کی صحیح ہو عموم قرآن کی تخصیص تراخی نسخ ہے اور اخبار کا نسخ ناممکن اور تخصیص عقلی عام کو قطعت سے نازل نہیں کرتی نہ اس کے اعتماد پر کسی ظنی سے تخصیص ہو سکے تو بحمدللہ کیسے نص صریح قطعی سے روشن ہوا کہ ہمارے حضور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ عزوجل نے تمام موجودات جملہ ماکان ومایکون الیٰ یوم القیامۃ جمیع مندرجات لوح محفوظ کا علم دیا اور شرق و غرب سماءوارض عرض فرش میں کوئی ذرّہ حضور صلی اللہ تعالیٰ ی علیہ وآلہ وسلم سے باہر نہ رہا۔

جو کچھ اعلیٰ ی حضرت قدس سرہ نے اصول تفسیر کے طور پو اپنا مسلک واضح فرمایا وہی اصول امام سیوطی سینکڑوں سال پہلے بیان فرما گئے چنانچہ حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:-

العالم یستغرق الصالح من غیر حصر و صیغة کل مبتداۃ وما والمعروف بال و اسم الجنس المضاف والنکرۃ فی سیاق العفی۔۔۔۔ العالم الباقی فی عمومه من خاص القرآن ما کان مخصصاً لعموم السنة وهو عزیز قال ابن الحصار انما یرجع فی النسخ الیٰ نقل صریح عن رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وآله وسلم وعن اصحابی یقول آیة کذا نسخت کذا قال وحکم به عند وجود التعارض المقطوع به سع علم التاریخ یعرف التقدم و المتاخر قال ولا یعتمد فی النسخ قول عوام المفسرین بل ولا اجتهاد المجتهدین من غیر نقل صحیح ولا معارضة بینة لان النسخ یتضمن دفع حکم و اثبات حکم۔۔۔ نقرر---فی عهده صلی الله تعالیٰ علیه وآله وسلم الصعتمد فیه النقل والتاریخ دون الرای او الاجتهاد قال والناس فی هذا بین طرفی نقیض فمن قائل لا یقبل فی النسخ اخبار الاحاد العدول و من۔۔۔۔ یکتفی فیه بقول مفسر او

مجتهد والصواب خلاف قولهما ۔ ۔ ۔ اذا سیق العام للمدح الذم فهل هو باق علی عمومه فیه مذاهب احدها نعم اذلا صارف عنه ولا تنافی بین العموم و بین المدح و الذم ۔ ۔ الخ

تبحر فی فن التفسیر کے نمونے

بالاستعیاب تو نہیں چند آیات کے نمونے تفسیری حیثیت سے فقیر یہاں عرض کرتا ہے۔

فتاوٰی افریقہ 17 میں ہے سائل نے عبد المصطفٰ ' ے نام رکھنے کے متعلق سوال لکھا تو اعلٰی حضرت قدس سرہ نے عبد المصطفٰے نام رکھنے کے جواز میں آیۃ وانکحو الایٰمی منکم منکم والصالحین من عبادکم سے استدلال فرمایا اس کے بعد تفسیر القرآن بالحدیث کے قاعدہ پر آیات کی تفسیر اور اپنے موضوع کو احادیث مبارکہ کے چند حوالہ جات سے مزین فرمایا پھر اس کے بعد تفسیر القرآن بالقرآن جو تفسیر کا اعلٰی درجہ ہے آیت مذکورہ کیلئے یٰعبادی الذین اسرفوا سے استشہاد فرمایا۔ آپ کے استدلال پر فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کو سامنے رکھئے تو یقین آئیگا کی اعلٰی حضرت قدس سرہ طرز استدلال میں امام رازی ہیں۔

اسی فتاوٰی افریقہ 19 میں سائل نے سوال کیا کہ آپ نے اپنی بعض تصانیف میں اہل اسلام کو مخاطب فرمایا کیا آپ کا خدا تعالٰی سے کوئی تعلق نہیں جب کہ آپ دوسروں کو تمہارا خدا کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ اعلٰی حضرت قدس سرہ نے صرف اسی ایک چھوٹے سوال پر اختصاراً دس آیات اور دس احادیث سے جواب مرحمت فرمایا جو آپ کی قرآن دانی کا بین ثبوت ہے۔

اسی فتاوٰی افریقہ میں بد مذاہب سے بیزاری کے متعلق در جنوں آیات سے استدلال کے بعد متعدد احادیث مبارکہ سے استشہاد فرمایا۔

اسی فتاوٰی افریقہ کے صفحہ 13 پر آیۃ وسیلہ کا بیان مفصّل مفسّر فرمایا کہ جس میں وسیلہ کی تمام شقوں کی تفصیل پھر اس پر اسلاف صالحین کے ارشادات کی تزئین کے بعد پیری مریدی کی تمام اقسام واضح فرمائیں جن میں سچے اور جھوٹے پیروں اور فقیروں کی پہچان آسان فرمادی جو اسلاف صالحین کی تصانیف میں یکجا کہیں اسی تحقیق کے ساتھ نہ ملے گی پھر کمال یہ ہے کہ صرف ایک جملہ کی تحقیق پر کتاب کے کئی صفحات پُر فرمائے امام فخر الدین رازی قدس سرہ کو ناقدین نے معاف نہ فرمایا کہا امام موصوف آیت کے مضمون کو اتنا طول دیتے ہیں کہ فن تفسیر کا رنگ بکھر جاتا ہے لیکن ہمارے امام ممدوح کا مضمون اتنا پر بہار ہے کہ جتنا طویل ہوتا گیا اتنا فن تفسیر اجاگر ہوتا چلا گیا ہے۔ اگر وہی ناقدین ہمارے امام ممدوح کے مضمون کو دیکھ لیتے تو قلم رضا کو چوم لیتے۔

اکثر مفسّرین صرف ناقل ہوتے ہیں استنباط کرنے والے گنتی کے چند ملیں گے لیکن اعلٰی حضرت قدس سرہ کو اللہ کی طرف سے تائید غیبی نصیب تھی کہ آیت کی تفسیر میں نقول معتبرہ کے ساتھ احادیث مبارکہ سے جب استنباط فرماتے تو دریا بہادیتے چنانچہ آیت ان اشکرلی ولوالدیک کی تفسیر میں حقوق

الاولاد علی الوالد اسّی حقوق گنائے جوسب کے سب آیت کی تفسیر سے متعلق اور احادیث مبارکہ سے مستنبط ہیں۔ صرف اسی مضمون پر ایک رسالہ مشعلۃ الارشاد تیار ہو گیا۔

اس کے علاوہ اور درجنوں بحثیں آیت کی تفسیر میں لائے جنہیں پڑھنے کے بعد تصدیق ہوتی ہے کہ اعلیٰ حضرت کا تبحر فی فن التفسیر بے مثال ہے۔

اجمالی آیات کی تفسیر میں مفسرین کا ہمیشہ اختلاف چلا آرہا ہے لیکن مفسرین کی عادت رہی ہے کہ اپنے موقف کو دلائل سے ثابت کرتے وقت زیادہ سے زیادہ درجنوں دلائل قائم کئے لیکن اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا طرز نرالہ ہے کہ جب اپنے موقف کی توضیح فرماتے ہیں توسنکڑوں دلائل وبراہین حوالہ قلم فرماتے ہیں چنانچہ تجلی الیقین کی تصنیف آپ کے شہسوار قلم ہونے کی جیتی جاگتی دلیل ہے کہ منکرین نے جب آقائے کونین ماوائے ثقلین رحمت کل ہادی سبل سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افضیلت کا انکار کیا تو درجنوں آیات قرآنیہ مع حوالہ جات تفاسیر مستندہ اور درجنوں احادیث صحیحہ اور اقوال اور اسلاف صالحین کی تصانیف سے استدلال فرمایا اس تصنیف اعلیٰ حضرت قدس سرہ کو یوں انعام نصیب ہوا کہ حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زیارت بشارت سے نوازا جس کا ذکر امام اہلسنّت نے تجلی الیقین کے آخر میں خود بیان فرمایا ہے۔

صرف ایک آیت پر سینکڑوں صفحات پر کتاب لکھ دی جو پوری کتاب تفاسیر کے حوالہ جات کے علاوہ اپنے استنباطات کے ساتھ اصول تفسیر سے موضوع کو مضبوط وموثوق فرمایا مثلاً آیت ممتحنہ کی تفسیر الحجۃ المو تمنہ قابل مطالعہ کتاب ہے۔

مختلف مسائل پر تفاسیر لکھنے بیٹھے تو تفاسیر کے حوالہ جات کے ڈھیر لگا دیئے چنانچہ مااھل لغیر اللہ بہ کی توثیق میں تفاسیر معتبرہ کے حوالہ جات لکھوائے حیات اعلیٰ میں 36 تفاسیر کی عبارت لکھوائیں پھر بھی فرمایا ان کے علاوہ اور بھی ہیں۔

تفسیر میں قرآنی نکات بیان فرمائے توخود مفسرین حیرت میں آگئے ملفوظ شریف حصہ چہارم میں فرمایا کہ ساتویں آسمان سات زمینیں دنیا ہیں اور ان سے وراء سدرۃ المنتہٰی ہے عرش، کرسی اور آخرت۔ دار دنیا شہادت ہے اور دار آخرت غیب، غیب کی کنجیوں کو مفاتیح اور شہادت کی کنجیوں کو مقالید کہتے ہیں۔ قرآن عظیم میں ارشاد ہوتا ہے وعندہ مفاتیح الغیب لا یعلمھما الا ھو، اور دوسری جگہ ارشاد ربّانی ہے لہ مقالید السموت والارض، مفاتیح کا حرف اوّل میم م اور آخری حرف حاح اور مقالید کا پہلا حرف اور آخری حرف ہ ہے مرکب کرنے سے نام اقدس ظاہر ہوتا ہے یعنٰ 'ی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی سے یا تو اس طرف اشارہ ہے کہ غیب وشہادت کی کنجیاں سب اسے دی گئی ہیں یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی شے ان کے حکم سے باہر نہیں۔

دو جہاں کی بہتریاں نہیں کہ امانی دل وجان نہیں

کہو کیا ہے وہ جو یہاں نہیں مگر اک نہیں کہ وہاں نہیں

یا اس طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ مفاتیح ومقالید غیب وشہادت سے حجرہ خفا یا عدم میں متقفل تھی، مفاتیح مقلاد جس سے ان کا قفل کھولا گیا اور میدان ظہور میں لایا گیا۔ وہ ذات۔۔۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر یہ تشریف نہ لاتے تو سب اسی طرح مقفل حجرہ یا خفا میں رہتے۔

وہ جو نہ تھے تو کچھ بھی نہ تھا وہ جو نہ ہوں تو کچھ بھی نہ ہو

جان ہیں وہ جہاں کی، جان ہے تو جہاں ہے۔

اعلٰی حضرت قدس سرہ کا تبحر فی فن التفسیر سمجھئے یا کرامت کہ خلاف عادت قرآن کی آیات برجستہ مخالف کو جواب دیا، چنانچہ ایک رافضی نے کہا کہ انا من المجرمین منتقمون کے عدد 1202 ہیں اور یہی عدد ابو بکر، عمر، عثمان کے ہیں (معاذ اللہ) اعلٰی حضرت قدس سرہ یہ سن کر بے قرار ہو گئے فوراً بلا تاخیر برجستہ کئی جوابات بیان فرمائے وہ جوابات سنئے!

(رافضی لعنہم اللہ تعالٰی) کی بناء مذہب ایسے اوہام بے سروپا پر ہے۔

اوّلا۔۔۔ ہر آیت عذاب کے عدد اسماء اخیار سے مطابق کر سکتے ہیں اور ہر آیت ثواب کے اسماء کفار سے کہ اسماء میں وسعت وسیعہ ہے۔ رافضی نے آیت کو ادھر پھیرا کوئی ناصبی ادھر پھیرے گا اور (رافضی ناصبی) دونوں ملعون ہیں۔

امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ تعالٰی عنہ کے نام پاک میں الف نہیں لکھا جاتا تو عدد بارہ سو ایک ہیں نہ کہ دو۔

(1) ہاں رافضی۔۔۔ بارہ سو دو (1202) عدد کا ہے کہ ابن سباد رافضہ

(2) ہاں رافضی۔۔۔ بارہ سو عدد ان کے ہیں، ابلیس، یزید، ابن زیاد، شیطان، الطاق کلینی بابویہ قمی طوسی حلی۔

(3) ہاں رافضی۔۔۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے:

ان الذین فرقوا دینہم وکانوا شیعاً لست منہم فی شئ۔

بے شک جنہوں نے اپنا دین ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور شیعہ ہو گئے اے نبی تمہیں ان سے کچھ علاقہ نہیں۔ (سورۃ الانعام رکوع 2)

اس آیۃ کریمہ کے عدد 2828 ہیں اور یہی عدد ہیں، روافض اثناء عشریہ شیطانیہ اسماعیلیہ، کے۔ اور اگر اپنی طرح سے اسماعیلیہ میں الف چاہئے تو یہی عدد ہے روافض اثناء عشیریہ نصیریہ واسماعیلیہ، کے۔

(4) ہاں اور رافضی۔۔۔۔! اللہ تعالٰ ی فرماتا ہے

لہم اللعنۃ ولہم سوء الدار

ان کیلئے لعنت ہے اور ان کیلئے ہے برا گھر (سورۃ الرعد رکوع 2)

اس کے عدد 644 ہیں اور یہی عدد ہیں شیطان الطاق طوسی حلی کے۔

(5) نہیں اور رافضی!۔۔۔بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اولئك هم الصديقون والشهداء عند ربهم لهم اجرهم، ۔(سورۃ الحدید رکوع 3)

اس کے اعداد 1445 ہیں اور یہی عدد ہیں ابو بکر، عمر، عثمان، علی، سعید کے۔

(6) نہیں اور رافضی!۔۔۔بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اولئك هم الصديقون والشهداء عند ربهم لهم اجرهم ونورهم،

وہی اپنے رب کے حضور صدیق و شہید ہیں ان کیلئے ان کا ثواب اور ان کا نور (سورۃ الحدید رکوع 3)

اس کے اعداد 1792 اور یہی عدد ہیں ابو بکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، سعید کے۔

(7) نہیں اور رافضی!۔۔۔۔۔بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

والذين امنوا بالله ورسله اولئك هم الصديقون والشهداء عند ربهم لهم اجرهم ونورهم،

جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق و شہید ہیں ان کیلئے ان کا ثواب اور ان کا نور (سورۃ الحدید رکوع 3)

اور یہی عدد ہیں صدیق، فاروق، ذوالنورین، علی، طلحہ، زبیر، سعید، ابو عبیدہ، عبد الرحمٰن بن عوف کے۔

آخر میں فرمایا، الحمدللہ آیۃ کریمہ کا تمام کمال جملہ مدح بھی پورا ہو گیا اور حضرات عشرہ مبشرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے اسماء طیبہ بھی سب آ گئے جس میں اصلاً تکلف و تصنع کو دخل نہیں۔ چند دنوں سے آنکھ دکھتی ہے۔ یہ تمام آیات عذاب و اسماء اشرار و آیات مدح و اسماء اخیار کے عدد محض خیال میں مطابق کئے جس میں صرف چند منٹ صرف ہوئے اگر لکھ کر اعداد جوڑے جائے تو مطابقتوں کی بہار نظر آتی مگر بعونہ تعالیٰ اسی قدر بھی کافی ہے۔ واللہ الحمد واللہ اعلم (فقیر احمد رضا قادری غفر لہ)

اس فتوے کو نقل کر کے مستفتی نے لکھا ہے، شیعہ رافضی کا ماشاء اللہ ولیہ نہیں بلکہ قیمہ ہو گیا۔

اب مجال دم زون نہیں فقیر نے یہ کرامت اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مجدد دین وملّت امام اہل سنّت وجماعت چشم خود ملاحظہ کی کہ چند لمحوں میں ان تمام آیات واعداد کی مطابقت زبان فیض والہام ترجمان سے فرمائی۔ یہ رات کا وقت تھا قریب نصف گزر چکی تھی۔

واللہ باللہ عدد اخیار واشرار کے اسماء بلا سوچے اور بے تامل کئے فرمادیئے کہ فقیر سوااس کے اور کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ اعلٰی حضرت کی کرامت کا اظہار بہ ذریعہ القائے ربّانی والہام سبحانی تھا۔(حیات اعلٰی حضرت 149،150)

فصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ سیّد المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین فاخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

صفر 1403ھ، بہاولپور، پاکستان الفقیر القادری ابو الصالح محمد فیض احمد اویسی رضوی غفرلہ